قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اپریل 2015، قیمت -/15₹

ماہنامہ اردو دنیا
دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

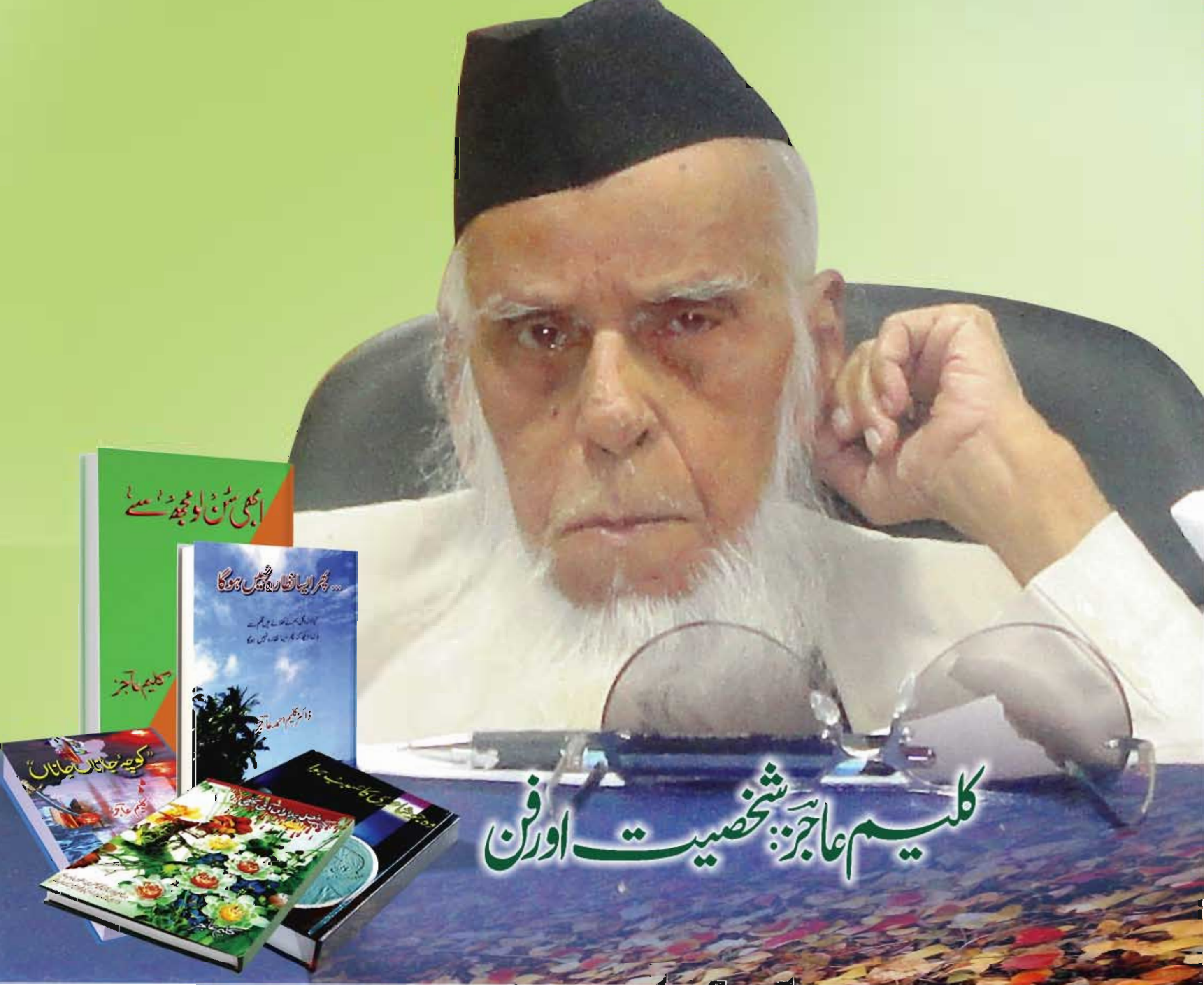

کلیم عاجز: شخصیت اور فن

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ◆ کامکس کہانی ◆ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ **اردو دنیا** دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ:04 اپریل 2015

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

میرا دکھ ہجرت کا دکھ ہے: انتظار حسین — عبدالسمیع 9

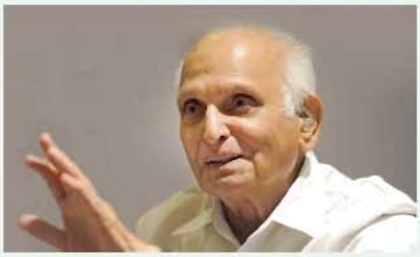

گوشۂ کلیم عاجز

کلیم عاجز کی یادیں اور باتیں — مناظر عاشق ہرگانوی 15
کلیم عاجز کی شاعرانہ تفہیم — اسلم جاوداں 19
درد و غم کا شاعر: کلیم عاجز — کوثر مظہری 22
کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے — حسن مثنیٰ 24
حکایاتِ غم کا شاعر: کلیم عاجز — اشرف استھانوی 27
منفرد لہجے کا شاعر: کلیم عاجز — سرور حسین 29
کلیم عاجز کی شاعری اور تہذیبی کشمکش — انصر احمد 31
اردو غزل میں کلیم عاجز کا امتیاز — مجاہد اسلام 34
کلیم عاجز کی خودنوشت: ایک جائزہ — محمد ضمیر رضا 36
انتخاب کلام عاجز 39

زبان و تعلیم

اتر پردیش کے اقلیتی اداروں میں اردو تدریس کا طریقۂ کار — واثق الخیر 41

ادبی مباحث

اردو زبان کے فروغ میں طب یونانی کا حصہ — اختر الواسع 45

آزادی کے بعد اردو میں جدیدیت کا رجحان — ندیم احمد 48

اردو عروض کی 50 سالم بحریں — خواجہ فراز بادامی 51

تہذیب و ثقافت

کلچر، ہجرت اور ادب — رحمان اختر 56

صحت

پھل اور سبزیاں اچھی صحت کی ضامن — ایس ایس رضا 59

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 59

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 69

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 71

ہماری بات

اردو صحافت کے بارے میں عام طور پر یہ بات کہی اور مانی جاتی ہے کہ اس کا ملک کی جدو جہدِ آزادی کو تقویت بخشنے میں 1857 کی پہلی جنگ آزادی سے لے کر 1947 میں دوسری جدو جہد آزادی کی کامیابی تک بہت خاص کردار رہا ہے۔ دہلی کا 'اردو اخبار' ہو یا لاہور کا 'روزنامہ پنجاب'، لکھنو کا 'اودھ اخبار' ہو یا کولکاتا (کلکتہ) کا 'اردو گائڈ' ان سبھی اخباروں نے جداگانہ مفادات اور پالیسیوں کے قطعِ نظر مختلف پہلوؤں سے ملک کے عوام میں قومی بیداری کی ایک لہر پیدا کی۔ 'الہلال'، 'البلاغ'، 'زمیندار'، 'ملاپ'، 'پرتاپ' اور 'قومی آواز' جیسے سیکڑوں اخباروں نے اس لہر کو ایک سمت دی اور یوں انگریزوں کی غلامی سے اس ملک کو آزادی حاصل ہوئی۔ لیکن خود اردو زبان کو ملک گیر وسعت دلانے، اسے سجانے سنوارنے اور اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے ادبی ذہانتوں کو متحرک کرنے میں بھی اردو صحافت کا کردار کچھ کم نہیں رہا ہے۔

عام طور پر صحافت کو جلد بازی میں تیار ہونے والا ادب مانا جاتا ہے جو ادب کے تخلیقی رجحانات کے لیے 'کچے مال' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اخبارات و رسائل کی اشاعت کے اوقات مقررہ ہوتے ہیں اور طے شدہ وقت اور شیڈول کے مطابق اسے شائع کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہفتہ وار یا روزانہ چھپنے والے اخبارات میں تو چھپنے والے مواد پر زیادہ غور کرنے، لفظوں کے موزوں ترین انتخاب اور جملوں کی نوک پلک اچھی طرح درست کرنے کا وقت اور بھی کم ہوتا ہے۔ عوام کے نزدیک چھپے ہوئے لفظ کی حرمت ذرا زیادہ ہوتی ہے اس لیے غلط چھپنے والا لفظ یا جملہ ان کے لیے زیادہ درست بن جاتا ہے اور یوں کئی بار زبان میں بگاڑ کی شکائتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ یہ مسئلہ انگریزی جیسی بڑی زبانوں کے ساتھ بھی رہا ہے۔ لیکن اردو صحافت کے معاملہ میں یہ کچھ زیادہ ہی سامنے آیا ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ افرادی قوت اور تکنیکی معاملات میں اردو صحافت ہمیشہ انگریزی اور دوسری بڑی زبانوں کے مقابلے میں کافی پیچھے رہتی چلی آئی ہے۔ تکنیکی معاملات میں تو خیر اب اردو صحافت دوسری زبانوں کے ساتھ تقریباً شانہ بشانہ ہے لیکن افرادی قوت اور مالی وسائل کی فراہمی میں آج بھی پیچھے ہے۔ اس دشواری کے باوجود اردو صحافت نے اردو زبان و ادب کی نشر و اشاعت میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی نہیں اردو کے کئی رسالوں، اور روزناموں کو، آج حسنِ طباعت، پیشکش کے انداز اور متنی معیار کے لحاظ سے ملک کی کسی بھی زبان کے مشہور و مقبول رسائل و اخبارات کے مقابل رکھا جا سکتا ہے اور یہ سب ان کے مالکوں اور اردو صحافیوں کے کمٹمنٹ اور محنت کا نتیجہ ہے۔

قومی اردو کونسل ابتدا سے ہی اردو صحافت اور صحافیوں کے مسئلوں سے جڑی رہی ہے۔ اردو اخبارات کے لیے اردو کی اپنی نیوز ایجنسی کی تشکیل دلانا اور سیکڑوں اخبارات کو ایجنسی کی خدمات مہیا کرانا کونسل کا وہ بڑا کارنامہ ہے جسے اردو صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، اور جس کی بدولت ملک کے ہر گوشے سے نئے اردو اخبارات کی اشاعت ممکن ہوئی ہے۔ رسائل و جرائد کو اردو کونسل تھوک خریداری کی اسکیم کے تحت اور اشتہارات کے ذریعے مدد فراہم کرتی آ رہی ہے۔ حال ہی میں کونسل نے اردو کے نوجوان صحافیوں کی صلاحیت سازی کا ایک تاریخی اور بے حد مفید سلسلہ شروع کیا ہے جس کے بہتر نتائج فوری طور پر تو نہیں البتہ کچھ عرصہ بعد ضرور سامنے آئیں گے۔ تکنیکی معاملے تو ٹھیک ہو گئے، لیکن متنی معاملات میں چند استثناؤں کو چھوڑ کر بحیثیتِ مجموعی وہ آج بھی پچھڑی ہوئی ہے جسے اس شعبے میں برسرِ کار نوجوان صحافیوں اور اخباری نمائندوں کی صلاحیتوں کو ابھار کر اور tone up کر کے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے کے تحت اردو صحافیوں کی صلاحیت سازی کے لیے باقاعدہ ایک نصاب اردو کونسل نے تیار کرایا، جس کی مطابقت میں قومی راجدھانی دہلی سے ورکشاپوں کا آغاز ہوا اور حالیہ عرصے میں ملک کے دیگر شہروں میں اس سلسلے کو دراز کیا گیا ہے۔ ان میں صحافیوں کو خبروں کی رپورٹنگ، ڈرافٹنگ، ایڈیٹنگ، صحتِ زبان، پیش کش، لے آؤٹ اور صفحہ سازی کے بارے میں اہم نکتے سمجھائے اور سکھائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر کے استعمال اور انٹرنیٹ پر موجود معلومات کے ہنر پر توجہ دی جاتی ہے جس سے نو آموز صحافیوں کے کام میں کافی چمک آ جاتی ہے۔ مستقبل میں اردو کونسل صلاحیت سازی کے اس سلسلے کو اور پھیلانے کا ارادہ رکھتی ہے تا کہ ہندوستان میں اردو صحافت کسی بھی زبان کی صحافت سے نہ معیار میں کم تر رہے نہ پیشکش میں۔

لیکن ایک کام ایسا ہے جسے اردو کونسل نہیں کر سکتی۔ وہ اردو کے قارئین کو خود ہی کرنا ہوگا۔ اور وہ کام ہے اردو اخبارات و رسائل کی خریداری۔ مشکل یہ ہے کہ آج بھی بہت سے صاحبِ استطاعت قاری اردو کے اخبارات کو گھر یا ڈرائنگ روم میں رکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ انگریزی اخبار اور رسالے سجا کر نمایاں طور سے میزوں پر رکھے جاتے ہیں۔ قارئین کا یہ طبقہ بزعم خود اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اردو کے اخبار گھٹیا درجے کے ہوتے ہیں اور ان میں پوری خبریں نہیں ہوتیں۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اردو کے آٹھ صفحوں والے اخبار میں بھی خبروں کی تعداد اشتہاروں سے بھرے ہوئے 16 صفحوں کے انگریزی اخبار سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان و ادب اور اردو سماج کی وہ خبریں بھی تفصیل سے دیتے ہیں جو انگریزی اخباروں میں ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتیں۔ اس کے باوجود ہم اردو اخبار کو خریدنا اور پڑھنا باعثِ ہتک سمجھتے ہیں۔ اردو زبان اور اس کی صحافت کو بڑھانا اور پھیلانا ہے تو ہمیں اس رویے کو ترک کرنا اور اردو اخبار و رسائل کی خریداری کو اپنا معمول بنانا ہوگا۔

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

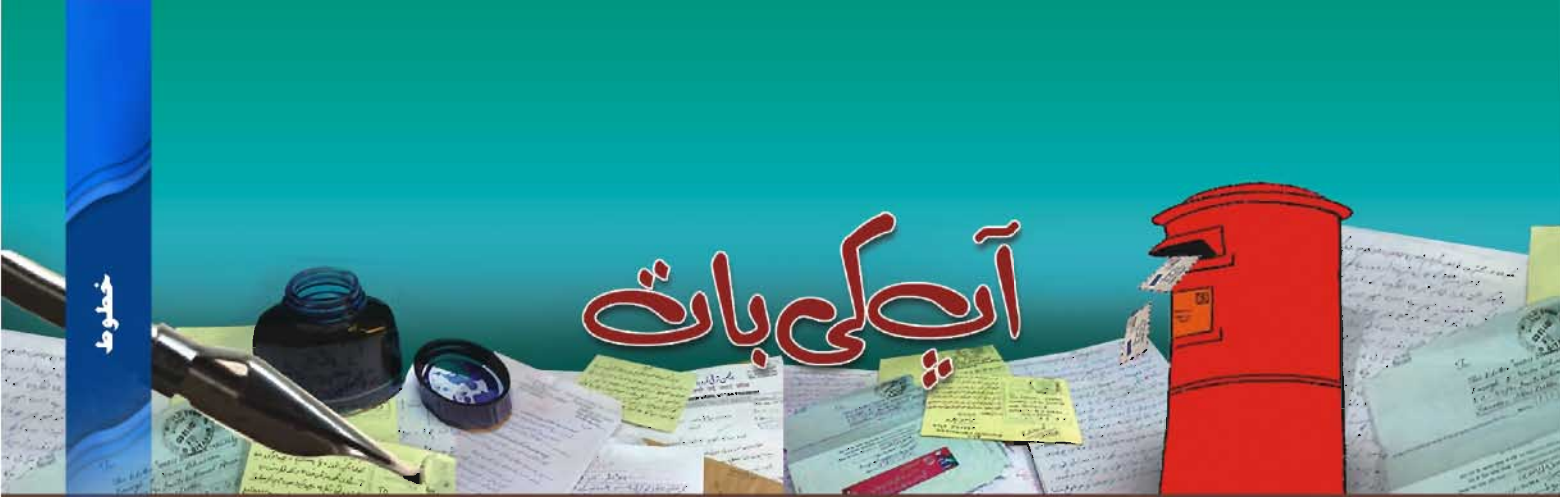

آپ کی بات

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

اردو دنیا کا فروری 2015 کا شمارہ پچھلے شماروں کی طرح اپنی امتیازی خصوصیتوں یعنی حسن طباعت و کتابت اور اس سے بڑھ کر محققانہ اور حد درجہ معلوماتی مضامین اور مشمولات کے ساتھ موصول ہوا اس کے مندرجہ ذیل مضامین بہت زیادہ پسند آئے: کل ہند کتابی و تہذیبی میلہ، عزیز احمد: فن و شخصیت، عزیز احمد کے افسانوی امتیازات، ذاکر حسین ایک سوانحی خاکہ، ذاکر حسین کی شخصیت مولانا عبدالماجد دریابادی سے خط و کتابت کی روشنی میں، وحی منظوم کی ادبی اہمیت و انفرادیت، کشمیر میں اقبالیاتی ادب اور تبصرے ان میں ذاکر حسین کی شخصیت، مولانا عبدالماجد دریابادی سے خط و کتابت کی روشنی میں اور ذاکر حسین سوانحی خاکہ سر فہرست ہیں۔

یہ پڑھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی کہ اورنگ آباد کے کل ہند کتابی میلے میں اردو کے پرستاروں نے اردو نوازی کی مثال، اردو کتابوں کی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ کی خرید کر مثال قائم کردی۔ مضمون عزیز احمد ان کی فن و شخصیت ان کی اولاد کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ''آپ کو تین اولاد ہوئیں، اس کے بجائے آپ کی تین اولادیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح شمسی تہرانی نہیں شمسی طہرانی ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان کئی سال ہوئے اللہ کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔

ڈاکٹر مقصود الٰہی شیخ

بریڈفورڈ- یوکے

اردو دنیا کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ بڑا بھرپور، ساتھ ہی دل کش مجموعۂ مضامین و معلومات ہے۔ رنگین تصویروں سے سجا ہے۔ رسالہ نئے خوبصورت انداز میں اردو علم و ادب اور تہذیب کی ترجمانی اور عکاسی کر رہا ہے۔ عرض کروں گا ہر صفحہ مرکز نگاہ بنتا اور دل کرتا یہیں سے پڑھنا شروع کروں۔ اسی میں ورق ورق دیکھتا چلا گیا۔ ٹھہرا کہ

افراتفری میں نہیں اطمینان سے پڑھوں گا۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ ایسی کیا جلدی مچی تھی کہ مدیر کے نام خط پہلے لکھ دوں۔ دراصل یہ خط لکھنے کا محرک اس شمارہ میں شامل میرے ناولٹ پر ڈاکٹر عبدالحی کا مبسوط و مربوط تبصرہ ہے۔ میں اپنی قلمکاری پیش کرنے کے بعد ہر تنقید و تحسین اور نکتہ چینی کو نگاہ سے دل میں اتارنے اور کچھ سیکھنے کا قائل ہوں۔ کبھی وضاحت و حجت میں نہیں پڑتا۔ ویسے بھی عبدالحی صاحب نے بڑی گہری نظر سے ناولٹ 'شیشہ ٹوٹ جائے گا' پڑھ کر عالمانہ تبصرہ لکھا ہے۔ مجھ پر واجب ہے کہ شکریہ کہہ کر چپ ہو جاؤں۔ یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ پرچے کی ترتیب و طباعت دل کو لبھاتی ہے۔

مجھے آپ کی منعقد کردہ بین الاقوامی کانفرنس نے بہت گرویدہ بنایا تھا۔ پاکستان و ہندستان کے درمیان اہل علم و قلم کے درمیان رسائل و کتب کا تبادلہ ضروری ہے اور ان پر محصول ڈاک میں خصوصی رعایت ہونی چاہیے۔ موجودہ نرخ نامہ کمر توڑ ہے۔ اسے بدلوائیے تاکہ ہمارے تعلیم یافتہ حلقوں میں مزید وسعت قلب و نظر پیدا ہو اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ یہی تبادلۂ وفود و رسائل و کتب ہیں۔ اس طرح دونوں ملکوں میں سیاسی اور دیگر ہر نوع کی خیر سگالی پیدا ہو سکتی ہے۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہوگی کہ زبان میں ہم آہنگی پیدا ہوگی۔

غلام نبی خیال

15 راولپورہ ہاوسنگ کالونی، سرینگر، کشمیر

'اردو دنیا' کے فروری کے شمارے میں رخسانہ رحیم کا مضمون 'کشمیر میں اقبالیاتی ادب' پڑھا۔ اس سے قبل محترمہ کی کوئی تخلیق نظر سے نہیں گزری ہے۔ غالباً یہ اُن کی اولین کاوش ہے جسے آپ کے جریدے میں جگہ ملی ہے۔ اس لحاظ سے محترمہ کو اور بھی احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مضمون کسی حد تک رواروی میں لکھا گیا ہے۔ مضمون نگار نے اگرچہ اقبال اور کشمیر کے تناظر میں کئی مطبوعات کا ذکر کیا ہے مگر ان میں سے ایک پر بھی ان کے تجزیاتی مطالعے کا ثبوت نہیں ملتا۔ انھوں نے محض ذکر برائے ذکر کے طور پر اپنا کام بظاہر انجام دیا ہے۔ مولوی احمد دین اور خلیفہ عبدالحکیم دونوں غیر کشمیری تھے لہٰذا اقبال پر اُن کی تحریروں کو کشمیر سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح لاہور کے رسالے نیرنگ خیال کا اقبال نمبر مضمون کے دائرے سے قطعاً باہر ہے۔ مقامی طور پر اگر ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی اور تسکینہ فاضل کی اُن تصانیف کو بھی زیر بحث لایا جائے جو محض ان کی حاجت روزگار کے تقاضے پورا کرنے کے لیے لکھی گئیں تو ایسا کرنا اقبال کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہوگا۔

محترمہ کا یہ عندیہ کہ ''اقبال شناسی کے سلسلے میں یہاں بڑے پیمانے پر کام ہوتا رہا'' محض خوش فہمی پر مبنی ایک خیال ضعیف ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات میں سوائے مرحوم پروفیسر آل احمد سرور کے فقط سطحی نوع کا کام ہوتا رہا اور اس شعبے نے سالہا سال کے بعد بھی اقبال پر کسی نئے زاویے سے کوئی قابل توجہ تحقیقی کارنامہ پیش نہیں کیا۔

جگن ناتھ آزاد کی مختصر مگر گمراہ کن تصنیف 'اقبال اور کشمیر' جن اختراعات اور مفروضات سے بھری پڑی ہے

ان کے جواب میں میں نے 'اقبال اور تحریک آزادی کشمیر' نام کی ایک ضخیم کتاب لکھی جس کے اب تک بشمول اقبال اکادمی لاہور تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مضمون نگار صاحبہ نے خود بھی اس تصنیف کو معرکۃ الآرا قرار دیا ہے لیکن اسے غالباً پڑھا نہیں۔ ورنہ اس کے صفحات پر انھیں اپنے موضوع کے لیے بہت سارا مفید مواد حاصل ہو جاتا۔ اس کتاب میں میں نے تحقیق اور تلاش کے بعد ثابت کیا ہے کہ آزاد نے جو کچھ اقبال اور کشمیری سیاست کے حوالے سے لکھا ہے وہ محض ایک بے بنیاد مفروضہ ہے جسے کشمیر کے کئی ہم عصر سیاست دانوں اور سردار جعفری نے بھی رد کیا ہے۔ اس موضوع پر یہاں بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو یہ تصنیف بھیج سکتا ہوں۔ گزشتہ سال کشمیر یونیورسٹی کی ایک تقریب میں ایک مقرر نے میری کتاب پر بات کرتے ہوئے اسے 'معرکۃ الآرا' کہا تھا۔ شاید محترمہ اس وقت موجود تھیں اور انھوں نے یہی توصیف میری تخلیق کے لیے دہرائی۔

حفظ مراتب کا تقاضا تھا کہ میں یہاں پر اپنی کسی تصنیف کا ذکر نہ چھیڑوں، لیکن جب ایک مقالے میں علمی کم مائیگی، مصنف کے ساتھ ناانصافی اور استعداد کا فقدان نظر آئے تو اپنی بات خود کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

کرشن بھاوک

کوٹھی نمبر 201-A، گلی نمبر 18-k، گورونانک نگر، پٹیالہ (پنجاب)

''آل انڈیا اردو کتابی و تہذیبی میلے کے گوشے پر مبنی خوبصورت تصاویر سے آراستہ 'اردو دنیا' کا فروری ماہ کا شمارہ ہمدست ہوا ہے۔ یومِ مادری زبان 21 فروری کو پڑتا ہے اور عالمی یوم اردو 9 نومبر کو، یہ معلومات جان کر قارئین فیض یاب اور ممنون ہوئے ہیں۔

اس شمارے میں شمس الہدیٰ انصاری کا ملکۂ ترنم بیگم اختر پر مضمون مختصر، لیکن معیاری ثابت ہوا ہے۔ اس کے آغاز میں بیگم کا یومِ پیدائش درج کرنا بھی درکار تھا۔ بھوپال کے ناقد جناب رشید انجم کے ایک مقالے (بیگم اختر: کلاسیکی غزل کی آبرومند آواز) میں موصوف اس طرح سے رقم طراز ہیں کہ یہ بیگم۔ ''ریاستِ اودھ کی اولین راجدھانی فیض آباد میں 7 اکتوبر سنہ 1914 کو پیدا ہوئی تھیں...'' اسی مقالے میں انھوں نے ہی اس دلچسپ راز کا بھی انکشاف کیا ہے کہ وہ ''کلکتے کے سونا گاچھی کی طوائفوں میں شامل ہو گئیں... اختری صرف آواز کا سودا کرتی تھی۔ کسی کی ہمت و جرأت نہ تھی کہ وہ اپنا قدم اس کی خواب گاہ کی جانب بڑھا سکے۔'' (مرتب ڈاکٹر الف انصاری، ''ہندوستانی فلم کا آغاز و ارتقا'، جلد دوم، ایڈیشن سنہ 2012، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95، صفحہ 180 اور 184) اسی مقالے میں ص 41 پر لفظ 'شیرنی' کی بجائے 'شیرینی' املا ہی درکار تھا۔ اسی شمارے کے دوئم گوشے کے تحت موقر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین پر مبنی تمام تر مضامین بلند پایہ و ادارے کے حسنِ انتخاب کے ضامن واقع ہوئے ہیں۔ اسی طرح برج پریمی کے بطور ایک ادیب مطالعے سے نسبت رکھنے والا پریمی رومانی کا شامل مضمون بھی از حد لائق تحسین ہے۔ صرف ص 55 پر 'کشمیر کے پریم چند' کے 'کام' لفظ کی جگہ 'نام' لفظ کی قابلِ درگزر غلطی ہے۔ اسی طرح عزیز احمد کے افسانوں کے مواد و اسلوب کی انفرادیت کا ایم نسیم اعظمی صاحب نے جاندار و شاندار تجزیہ کیا ہے۔ شمارے کے تمام مشمولات لائق تحسین ہیں۔

محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ

جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو اتر پردیش، مقام: ٹانڈہ، ضلع رام پور

ماہ فروری کا رسالہ ڈاک سے ملا۔ اورنگ آباد اردو کتابی میلے کی مفصل رپورٹ اور خاص کر تمام تصویروں نے اس کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ایسا لگا میں خود اس میلے میں موجود ہوں۔ اسکولی بچوں نے جو ثقافتی اور کلچرل رنگارنگ پروگرام پیش کیے وہ قابل تحسین اور مبارکباد ہیں 1 کروڑ 29 لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہونا ایک بڑا اور تاریخی ریکارڈ ہے۔ اسی سے اردو ادب کا ایسے علاقوں میں پھیلنے اور پھولنے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو کبھی بھی اردو کے گڑھ نہیں رہے ہیں۔ اردو کونسل کے زیر اہتمام ملک کی مختلف ریاستوں میں میلوں کا انعقاد کیے جانے کی ضرورت ہے۔ سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت پر جناب کامل قریشی اور جناب علیم قدوائی کے مضامین نے بے حد متاثر کیا۔ میرے والدِ مرحوم جناب وفاء الرحمٰن جامعی صاحب کا ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ بے پناہ قریبی تعلق رہا اور وہ ایک ساتھ ہی دہلی میں رہتے تھے۔ قیام طعام سب ساتھ ہی رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے متعلق آل انڈیا ریڈیو اور اخبارات میں ان کے مضامین نشر اور شائع ہوتے رہتے تھے۔ رخسانہ رحیم کے مضمون 'کشمیر میں اقبالیاتی ادب' معلوماتی ہے جو پسند آیا۔

ڈاکٹر پریمی رومانی

1/3، نصیب نگر، جانی پور، جموں

'اردو دنیا' کا فروری کا شمارہ موصول ہوا۔ یاد آوری کے لیے شکریہ۔ یہ شمارہ ہر لحاظ سے بہتر اور معیاری ادب کا ترجمان ہے۔ اردو ریسرچ اسکالر کے مسائل اور حل، عزیز احمد-فن اور شخصیت، بیگم اختر، ڈاکٹر حسین ایک سوانحی خاکہ، شاہد کبیر نئی غزل کا شاعر وغیرہ جیسے مقالات قابل مطالعہ ہیں۔ ان مقالات کے ساتھ ساتھ کتابوں پر تبصرے، عالمی اردو نامہ اور قومی کونسل کی سرگرمیوں کے بارے میں گھر بیٹھے بخوبی جانکاری فراہم ہوتی ہے۔ متذکرہ شمارے میں آپ نے میرا مقالہ برج پریمی-ایک مطالعہ شائع کیا ہے جس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔

معین الدین شمسی

اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ (جھارکھنڈ)

ماہ نامہ 'اردو دنیا' کے فروری 2014 کے شمارے میں پروفیسر کیفی سے کوثر مظہری کا انٹرویو معلوماتی اور پرلطف ہے۔ آپ نے ایک سوال کے جواب میں بجا فرمایا ہے کہ تخلیق کی بنیاد پر ہی تنقید کی عمارت قائم ہے۔ تخلیق اور تنقید دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ موصولہ شمارہ از حد دیدہ زیب سرورق پر 'آل انڈیا اردو کتابی و تہذیبی میلہ' اور اندرونی صفحے پر کتاب میلے کے دلکش مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مطیع الرحمان کا مضمون 'عزیز احمد فن اور شخصیت' ایم نسیم اعظمی کا 'عزیز احمد کے افسانوی امتیازات' عزیز احمد کا 'قاتل کبیر' اور شمس الہدیٰ کا 'ملکہ ترنم بیگم اختر' معلومات کا خزانہ ہی نہیں بلکہ وٹامن B Complex کے مترادف ہیں۔ بلاشبہ قومی اردو کونسل اپنی طرف سے بھرپور کوشش کر رہی ہے کہ اردو کو زندگی کے ہر شعبے تک پھیلائے۔ این سی پی یو ایل نے اردو کی تعلیم کو کمپیوٹر ٹکنالوجی سے جوڑا۔ 'فکر و تحقیق'، 'بچوں کی دنیا' اور 'اردو دنیا' جیسے معیاری جریدوں کو ہندوستان کے اس قسم کے جملہ جرائد سے زیادہ معیاری و خوبصورت شکل میں پیش کر کے قارئین اردو دنیا کو خوش کر دیا ہے۔ رخسانہ رحیم کا 'کشمیر میں اقبالیاتی ادب' بھی دلچسپ ہے۔

الحاج حیدر حسین شیخ

حنا منزل، سداشیوگڑھ، کاروار، کرناٹک

ماہنامہ فروری 2015 موصول ہوا۔ 17 ویں کل ہند اردو کتابی و تہذیبی میلے کی روداد پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اورنگ آباد کے اردو احباب قابل تعریف ہیں جنھوں نے ایک کروڑ 29 لاکھ روپے کی کتابیں خریدیں۔ ہم تمام اردو داں طبقہ ان حضرات کو مبارکباد پیش کرتے

ہیں جنھوں نے اردو کی بے لوث خدمت کے ذریعے ہم تمام کے لیے ایک مثال قائم کی ہے۔ رسالے کے تمام مضامین عمدہ ہیں۔

عاطف قمر

فریدی پور دوبگا لکھنؤ

فروری کا 'اردو دنیا' نظرنواز ہوا، اچھی اشاعت کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں، تاہم یہ تلخ حقیقت ہے کہ اب اردو میں اقربا پروری گہری ہوتی جارہی ہے، کیونکہ تبصرے کا کالم دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ دو تبصرے ایسے شائع ہوئے جن پر حیرت ہوتی ہے۔ ایک ہی صاحب کے دو تبصرے۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ اردو دنیا جیسے معیاری رسالے میں شائع کروانے کے لیے ایک آدمی کو مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے، مگر ایک صاحب کے دو دو تبصرے۔ اقربا پروری کی روش پر یہی کہنا پڑتا ہے کہ شاید ایڈیٹر صاحب سے تبصرہ نگار کے تعلق ہوں گے۔ قابل افسوس بات ہے، یہ مراسلہ گرچہ آپ شائع نہیں فرمائیں، امید ایسی ہی ہے۔ کوئی بات نہیں، تاہم مجھے اتنا کہنا تھا سو کہہ دیا:

جن تبصروں کے حوالے سے آپ نے اتنی تلخ باتیں کی ہیں وہ تبصرے بچوں کی کہانیوں پر مشتمل 100 سے بھی کم صفحات پر مشتمل کونسل کی کتابوں پر ہیں۔ مبصر کے نام سے ایک ساتھ بھلے ہی دو کتابوں پر تبصرے شائع ہوگئے ہوں لیکن یہ ایک ہی تبصرہ شمار کیا جائے گا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمیں کم سے کم ایک کالم کا تبصرہ دینا ہوتا ہے جو کہ ایک کتاب کے تبصرے سے پورا نہیں ہورہا تھا۔ مجبوراً ہمیں ایسا کرنا پڑا۔ (ادارہ)

پرویز اشرفی

D-321، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کامیابی کے ساتھ اپنے اغراض و مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل ہے۔ یقیناً آپ کا اور آپ کی ٹیم کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے۔ سلسلے وار تینوں ماہ کے تاثرات پیش ہیں۔ اردو دنیا دسمبر 2014 حسن وطباعت وکتابت سے مزین گراں قدر اور محققانہ مضامین کا مجموعہ خرید کر لایا۔ ''زبانیں ملک میں اتحاد وسلامتی قائم رکھ سکتی ہیں'' اسمرتی ایرانی نے کوراسٹوری کے تحت مادری زبان کا احترام کرنا چاہیے کی مثال 'مالی' اور 'ماں' سے خوب دی ہے۔ اردو شاعری میں روزہ مرہ، ادبی مباحث کے تحت معین الدین عقیل کا 'غلام عباس کی اوّلین طبع زاد تخلیق' سے 'کھوئے کھلونوں کی بستی' سعدیہ حسن بلوچ کا 'غیر مسلم شعرا کی حمدیہ شاعری' بہت ہی پسند

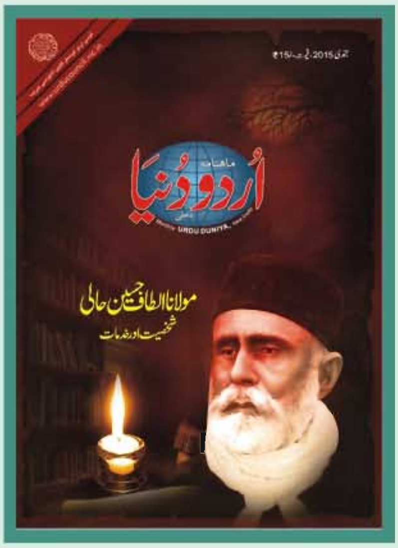

آئے۔ اس کے علاوہ احمد صغیر کا ذکیہ مشہدی سے لیا گیا انٹرویو بہت مؤثر ہے۔

جنوری ماہ 2015 کے شمارے میں مولانا حالی پر خاص گوشہ بہت پسند آیا۔ انٹرویوز ذہن کے دریچوں کو کھولتے ہیں اور نئی نئی معلومات کا ذریعہ ہیں۔ مرزا حامد بیگ کا انٹرویو پسند آیا۔ اس کے علاوہ کونسل کے نئے چیئرمین عزت مآب جناب مظفر حسین صاحب سے خصوصی گفتگو بہت اچھی لگی۔ تاریخ سے شغف کی وجہ سے شہر اردو: اورنگ آباد کا خاص طور سے مطالعہ کیا اور مزید معلومات حاصل ہوئی۔ رفعت سعید قریشی صاحب کا شکریہ۔ کیریئر کالم کے تحت اسما مسعود کا مضمون معلوماتی ہے۔ ماہ فروری 2015 کے شمارے میں پروفیسر خواجہ اکرام الدین صاحب نے بالکل درست فرمایا کہ ''ایک طرف مراٹھواڑہ کے اُن علاقوں میں اردو پھل پھول رہی ہے جو لسانی تاریخ کے کسی دور میں اردو کے گڑھ نہیں رہے اور دوسری طرف شمالی ہندوستان کے وہ علاقے اردو سے تقریباً خالی نظر آتے ہیں جہاں اردو پروان چڑھی اور جہاں ماضی قریب تک اردو زبان کا ہی بول بالا تھا۔'' یہ ایک حقیقت ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

کیریئر کالم کے تحت جناب سمیع الدین خاں 'شاداب' کا مضمون 'نئے سال کا فائدہ اُٹھائیں' نہ صرف طالب علموں کے لیے بلکہ معاشرے کے تمام لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ 'وحی منظوم' ایک ایسا مضمون ہے جس کے ذریعے ایک نئی معلومات حاصل ہوئی اور قرآن کریم کو نظم کے سانچے میں ڈھال کر آسان زبان میں لوگوں تک پہنچایا گیا ہے۔ جناب سلیم قدوائی کا مضمون ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت بے حد پسند آیا۔ اس مضمون کے ذریعے مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملکہ ترنم بیگم اختر کی زندگی کے مختلف گوشوں کو قلم بند کیا ہے اور یہ عوام کے علاوہ موسیقی بالخصوص کلاسیکی موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اہم مضمون ہے۔ شمس الہدیٰ صاحب نے اس طرح اپنے وقت کی معروف فنکارہ سے تعارف کرایا ہے۔

'ولادت صدی' کالم کے تحت جناب مطیع الرحمٰن صاحب کا مضمون عزیز احمد فن اور شخصیت اور ایم نسیم اعظمی کا مضمون عزیز احمد کے افسانوی امتیازات اچھے مضامین ہیں۔ مہاراشٹر کے تاریخی شہر 'اورنگ آباد' میں 17 واں کل ہند اردو کتابی وتہذیبی میلہ جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے منعقد کیا تھا۔ اُس کی تفصیلی رپورٹ امتیاز وحید صاحب نے اس خوبصورتی سے پیش کی ہے کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں خود اُس میلے میں شریک ہوں۔

حنیف کیفی صاحب سے لیا گیا انٹرویو بہت اچھا ہے۔ کوثر مظہری صاحب نے اردو کے مختلف فنون سے متعلق اچھے سوالات کیے ہیں، جس سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ اُمید ہے دیگر قارئین بھی مستفیض ہوئے ہوں گے۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا۔ 48001 (مدھیہ پردیش)

خواجہ الطاف حسین کی شخصیت اردو تنقید کے اوّلین شجر سایہ دار کی صورت میں سامنے آئی۔ حالی کے عہد سے ہی اردو میں صنف سوانح نگاری کی روایت کا آغاز ہوا۔ حالی نے پرانی شاعری کے نقائص اور جدید شاعری کے اصول قابلیت سے سمجھائے اور شاعرانہ تنقید کا ایسا دستور مرتب کیا جس کا جواب نہیں۔ حالی نے غزل میں نئے نئے مضامین داخل کیے۔ ان کے لہجے میں ایک طرح کا ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل میں دلکشی پیدا کی۔ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے غزل میں نئے نئے تجربات کیے۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم

جمشید پور ویمنس کالج، جمشید پور

'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا۔ اردو زبان وادب کے فروغ میں یہ رسالہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشکور و ممنون ہوں کہ تمام شمارے بروقت موصول ہورہے ہیں۔

امین حیدر شکاگو

اردو دنیا کا تازہ شمارہ نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ اس معیاری وتاریخی شمارے کی اشاعت پر دلی مبارکباد

قبول فرمائیے۔ کانفرنس کی تصاویر نے سرورق کی جاذبیت میں اضافہ کیا ہے۔ کوراسٹوری 'اردو کانفرنس اغراض ومقاصد' کوآڈیو سے بہت احتیاط سے منتقل کیا گیا ہے۔ مضمون پڑھ کر خواجہ صاحب کی تقریر کی یاد تازہ ہوگئی۔ کانفرنس کی روداد کو بھی بہت عمدگی سے تحریری اور تصویری جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ علمی اور تحقیقی مضامین نے رسالے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ مثلاً 'غیر مسلم شعرا کی حمدیہ شاعری' میں کافی عرق ریزی کی گئی ہے۔ فراسو اور حکیم ڈیسلو اعاصی جیسے ناموں تک رسائی اور دیگر شعرا کی کسی ایک صنف شاعری کو جمع کرنا ایک مرحلہ رہا ہوگا۔ محترمہ سعدیہ بلوچ صاحبہ نے یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ 'احوال میر تقی میر میں' چند تاریخی واقعات معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ مضمون 'عربوں کی کلاسیکی شاعری' میں ان کے معاشرتی رجحان سے واقفیت کے علاوہ ہلکی پھلکی تاریخ شاعری سے آگاہی کا بھی لطف رہا۔ اردو غزل اور سائنسی حقائق میں عادل صاحب نے مختلف اشعار کے حوالوں سے شعرا کے سائنسی رجحانات کو خوبصورت انداز سے اجاگر کیا ہے۔ قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں اور دیگر قومی وعلاقائی خبریں اچھا گوشہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالہ مجموعی طور پر بہت محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ بلند معیار رسالہ ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے حسن کمال میں مزید اضافہ فرمائے۔

رشید اختر خاں

لوکو بازار ہاتا، پوسٹ گوموہ، ضلع دھنباد

'اردو دنیا' نئی تازگی لے کر آتا ہے جس کو پڑھنے میں چند دن بڑے اچھے گزر جاتے ہیں اور کچھ دن آئندہ شمارے کے انتظار میں کٹ جاتے ہیں۔ شمارے کی پیش کش قابل تعریف ہے۔

ڈاکٹر جمشید احمد

صدر شعبۂ اردو پانڈیشور کالج، پانڈیشور، بردمان (مغربی بنگال)

ماہنامہ 'اردو دنیا' دسمبر 2014 موصول ہوا۔ قومی کونسل کے زیراہتمام 'اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ' کے موضوع پر منعقدہ عالمی کانفرنس کے متعلق یوں تو اخبارات و فیس بک کے ذریعے چند جھلکیاں مل جاتی تھیں۔ مگر اس رسالے کی کوراسٹوری کے ذریعے اس سے متعلق خاطرخواہ معلومات فراہم ہوئیں۔ کانفرنس کے اغراض ومقاصد، کلیدی خطبے اور روداد کو پڑھ کر اور اس سے متعلق دیدہ زیب تصاویر کو دیکھ کر اس میں شریک ہونے جیسا احساس ہوا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ کانفرنس میں پڑھے گئے تمام مقالات کو قومی کونسل نے کانفرنس کے انعقاد سے قبل کتابی شکل میں شائع کر دیا اور کانفرنس کے دوران اس کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ان تمام کارناموں کے لیے کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور جملہ اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ پروفیسر خواجہ اکرام صاحب کا سارک ممالک کی سطح پر اردو کانفرنس انعقاد کرنے کا خیال قابل ستائش ہے۔ اس سلسلے میں پیش رفت ہونی چاہیے۔ ایسی کانفرنسوں میں ملک کے مختلف گوشوں سے اردو ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ کو بھی شرکت کے لیے مدعو کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے مضمون 'قومی اردو کونسل اور بچوں کی دنیا' میں کونسل کی توجہ رسالہ 'بچوں کی دنیا' کی کم یابی کی طرف مبذول کرائی ہے۔ لہٰذا اس کی اشاعت میں حسب ضرورت اضافہ کیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ بچوں کی اردو شناسی، اردو کے روشن مستقبل کا اشاریہ ہے۔ شمارے میں شامل مضامین اردو شاعری میں روزمرہ، اردو تنقید کی نئی رہ گزر حسن عسکری اور عربوں کی کلاسیکی شاعری خصوصی طور پر پسند آئے۔

ایس ایس علی

اکولہ (مہاراشٹر)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے دسمبر 2014 کے شمارے میں جناب سید طلحہ نقشبندی القادری کا مضمون 'اکولہ کے قدیم اخبارات ورسائل پر ایک نظر' پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ فاضل مضمون نگار نے کل گیارہ اخبارات ورسائل کے نام گنوائے ہیں اور ہر ایک پر مختصر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ اکولہ سے اتنے سارے اخبارات ورسائل کا نکلنا ہمارے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ اسکول کے زمانے میں ہفت روزہ 'امن' اکثر مطالعے میں رہتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر امام خاں صابر بڑے وضع دار شخص تھے۔ عمر میں ہفت روزہ 'تعبیر' کے ایڈیٹر شیخ رمضان صاحب چونکہ مجھ سے بہت زیادہ بڑے نہیں تھے اس لیے ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ مضمون پڑھ کر مجھے افسوس اس بات کا ہوا کہ ان دو اخبارات کے علاوہ باقی سے میں نابلد ہی تھا۔ خاص کر میرے والدِ محترم کے دوست عبدالصمد جاوید صاحب کے اخبار 'ہم لوگ' سے ناواقفیت کوفت کا باعث بنی۔

متین اچل پوری

بیابانی، اچل پور ضلع امراؤتی

'اردو دنیا'

گنگا جمنی مشک کی خوشبو اُردو دُنیا میں
کیا کیا چوکڑی بھرتا آہو اُردو دنیا میں
میر کا لہجہ بھی اس میں ہے، غالب کا بھی رنگ
ذوق کی صہبا، داغ کی دارو اُردو دنیا میں
اندردھنش کے رنگ ہیں اس میں اور پھر بیش از بیش
رنگِ خلوص اک چلتا جادو اُردو دنیا میں
پھولوں کا گلدستہ گویا اس کے عنوانات
رنگا رنگ الفاظ کے جگنو اُردو دنیا میں
اُردو کے اس قاری کی یہ کیفیت گویا
زخمی زخمی ایک کنگارو اُردو دنیا میں
آزادی کے نشتر سے گل بے آمیز قتیل
اوس دل مجروح کے آنسو اُردو دنیا میں
سیاحت کے ہیں رسیا خواجہ اکرام الدین
فطرت لہراتی ہے گیسو اُردو دنیا میں

■

گزارش

کالم آپ کی بات آپ سبھی قارئین کا کالم ہے۔ اس کالم میں ہم آپ کے مشوروں اور شمارے کے حوالے سے آپ کی آرا کو شائع کرتے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ شمارے کی تعریف وتوصیف کے علاوہ شمارے میں شائع شدہ تحریروں پر صحت مند تنقید کریں تاکہ قلمکار حضرات اپنی تحریر میں مزید بہتری لاسکیں اور ہم بھی اردو دنیا کو اور خوبصورت اوراعلیٰ معیار کا رسالہ بناسکیں۔ (ادارہ)

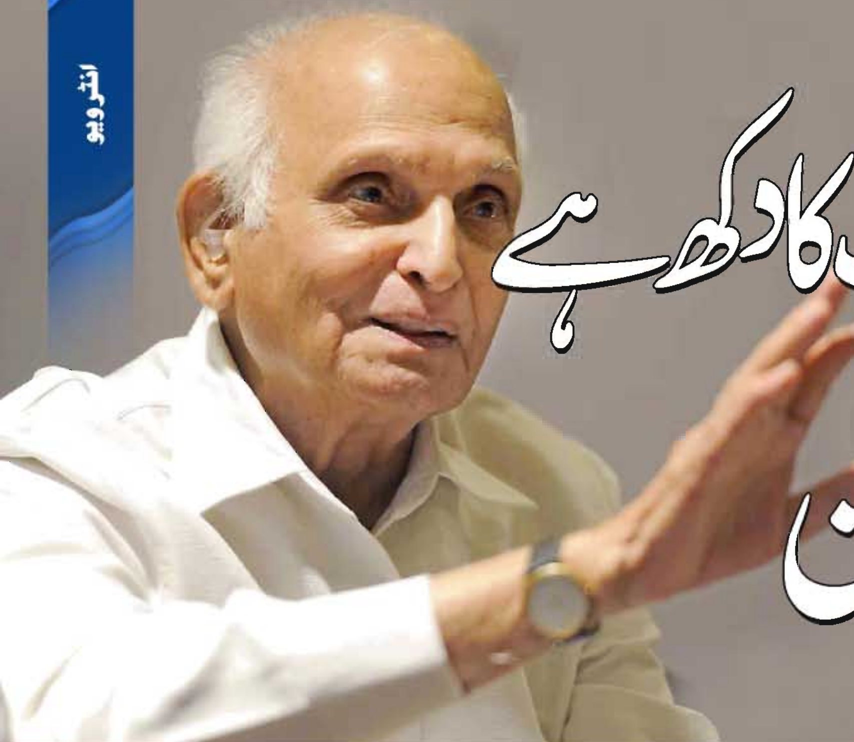

عبدالسمیع

میرا دکھ ہجرت کا دکھ ہے

انتظار حسین

اردو فکشن کی کوئی تاریخ انتظار حسین کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں کھی جاسکتی۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے، پاکستان کو اپنا وطن بنایا لیکن دو قومی نظریے اور سطحی وطنیت کے جذبوں سے بہت اوپر اٹھ کر انھوں نے اپنی تخلیقیت کو تہذیبی و ثقافتی رشتوں سے ہم آہنگ رکھا۔ ہندوستانی اسطور، ہندو دیومالائی ادب، مہاتمابدھ سے وابستہ جاتک کتھاؤں اور قدیم ہندوستانی لوک کہانیوں کے اثرات کو جس طرح انھوں نے اپنے تخلیقی ہُنر میں سمویا ہے، اس کی دوسری مثال اردو ادب میں نہیں ملتی۔ حال ہی میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اس موقعے پر جناب عبدالسمیع نے ان کا ایک طویل انٹرویو 'اردو دنیا' کے لیے ریکارڈ کیا ہے جس کے اقتباسات ہدیۂ قارئین ہیں: ادارہ

عبدالسمیع: اردو فکشن میں آپ کی حیثیت ایک لجنڈ کی ہے۔ آپ کے افسانوی سفر کے کئی پڑاؤ ہیں۔ ابتدا میں آپ کے یہاں اسلامی بلکہ ہند ایرانی اور اسرائیلی اسطور سے استفادے کا رجحان زیادہ تھا، لیکن بعد میں ہندو دیومالا کے اثرات غالب آنے لگے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

انتظار حسین: میں تو پہلے اس سے رشتہ جوڑ چکا تھا۔ میں نے 'آخری آدمی' لکھا تو اس کا قرآن میں حوالہ ہے اور بائبل سے بھی تعلق ہے۔ یہ تو ہماری اسلامی روایت ہے، میں تو اس میں مگن تھا لیکن بعد میں جب میں نے دیکھا کہ جو داستانی روایت ہے اس میں ایسی کہانیاں ہیں جس کی عربی عجمی روایت نہیں ہے، یہ تو قدیم ہندوستان کی روایت ہے۔ جیسے بیتال پچیسی، تو میں نے بیتال پچیسی پڑھی، مجھے لگا اچھا یہ بھی ایک پہلو ہے۔ تو میرے دھیان میں کچھ اور کہانیاں آئیں جو پہلے پڑھی تھیں۔ مجھے لگا کہ یہ تو بالکل الگ چیز ہے۔ ان کے انگریزی میں جو ترجمے تھے (اردو میں تو زیادہ نہیں ہیں) کتھا سرت ساگر پوری ہماری لائبریری میں رکھی تھی، آٹھ نو جلدیں ہیں اس کی۔ وہ ساری موجود تھیں اور مہابھارت کی اٹھارہ جلدیں تھیں۔ اس کے دو ترجمے ہوئے تھے۔ ایک تو اشوک کا اشلوک میں تھا، اسے پڑھا تو مجھے لگا کہ یہ تو میرے بس کا نہیں ہے، وہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن جو نثری ترجمہ تھا وہ میں نے پڑھا۔ میں دنگ رہ گیا کہ یہ تو الگ دنیا ہے۔ میں تو خلاصے پڑھتا رہا تھا مہابھارت کے۔ خلاصوں سے تو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ مہابھارت ہے کیا۔ جب میں نے پہلا ہی Volume پڑھا تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ اس کتاب کو ضرور پڑھنا ہے۔ تو اٹھارہ جلدوں میں میں نے ڈیڑھ سال لگایا، رفتہ رفتہ، کیونکہ اور کام بھی ہوتے ہیں۔ واقعی یہ ہمیں بڑی کتاب نظر آئی۔ رامائن تو ہم پڑھ لیتے ہیں، چھوٹی سی کتاب ہے۔ تو میں نے کہا رامائن تو کچھ نہیں اصل کتاب تو مہابھارت ہے۔ پھر مجھے کہیں سے احساس ہوا مہاتما بدھ کے حالات پڑھتے ہوئے کہ یہ جاتکیں کیا چیز ہیں۔ میں نے کچھ اور ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ مہاتمابدھ نے کچھ جاتکیں کہی ہیں۔ تو میں نے سہیل احمد خاں سے کہا (انھوں نے کچھ ترجمے کیے ہیں) کہ یہ جاتکیں کیا چیز ہیں ، اس کا کچھ Collection تمھارے یہاں لائبریری میں موجود ہو تو نکلواؤ اور میں ترجمہ کردوں گا ان کا۔ تو اس نے ایک Collection نکلوا کے دے دیا۔ ایک کتاب مجھے اپنی لائبریری میں مل گئی۔ میں نے یہ کتاب پڑھی، جب پوری پڑھ گیا تو بجائے اس کے کہ میں ترجمہ کروں میں نے خود جاتک کہانیاں لکھنی شروع کردیں۔ میں اس طرح سے مہاتمابدھ کا Story writer کی حیثیت سے شیدائی ہوگیا۔ یہ مختصر کہانی ہوتی ہے اور مختصر کہانیوں کا ایک سلسلہ ہے کہ اسے ملا کر ایک بہت بڑا ناول بنتا ہے۔ جسے Circular Novel کہتے ہیں۔ Circular Novel کی اصطلاح میں نے پڑھ رکھی تھی کہ بہت سی کہانیاں ایک رنگ میں لکھی جائیں تو وہ سرکولر ناول بن جاتا ہے۔

ع س: کیا ہمارے یہاں سرکولر ناول جیسی کوئی چیز ملتی ہے؟

انتظار حسین: اردو میں اس کی کوئی روایت نہیں ہے، یہ تو وہیں کی چیز ہے مہاتمابدھ کے دور کی۔

ع س: کتھا کہانی کی روایت میں آپ نے کتھا سرت ساگر، مہابھارت اور مہاتمابدھ کی جاتک کتھاؤں کا ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ اور کون سی کتھائیں ہیں جو آپ کو متاثر کرتی ہیں؟

انتظار حسین: کتھا کہانی کی روایت میں میں نے بہت سی کہانیاں پڑھیں ان میں مہابھارت بھی، رامائن بھی، اور وہ کتاب واقعی بہت بڑی کتاب ہے کتھا سرت ساگر۔ داستانوں کی جو تاریخ جین نے لکھی تھی اس میں کتھا سرت ساگر کا احوال میں نے پڑھا تھا لیکن میں نے کہا، ہوگی کوئی قدیم کتاب، ہمارے پلے نہیں پڑے گی، اور کہاں ہے کیسے ہے؟ لیکن جب وہ سامنے آہی گئی، لائبریری میں میں نے دیکھا رکھی ہوئی ہے تو میں نے کہا دیکھ ہی لیتے ہیں کہ یہ ہے کیا؟ تو واقعی یہ ایک نئی دنیا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں میجک ریلزم، تو وہ وہاں نظر آتا ہے۔ وہ عجیب وغریب ہے۔ ویسے الف لیلہ بھی ہے۔ میں الف لیلہ کا بہت قائل ہوں۔ لیکن الف لیلہ اپنی جگہ پر ایک جادو ہے اور یہ اپنی جگہ ایک جادو ہے۔ اس میں تو ایسا ہے کہ وہ کہتے ہیں نا 'کہانی میں سے کہانی نکلنا' یہ الف لیلہ کے متعلق ہے کہ ایک کہانی سنا رہی ہے پھر دوسری کہانی سناتی ہے۔ ان دونوں کہانیوں میں کوئی رشتہ نہیں ہے، پھر تیسری کہانی، اچھا اس کہانی کے اندر بھی کہانی آجاتی ہے۔ مختلف کہانیاں ایسی ہیں۔ لیکن یہاں یہ آٹھ جلدوں میں ایک کہانی شروع ہوتی ہے، وہ کہانی چل رہی ہوتی ہے کہ بیچ میں سے ایک اور کہانی نکل آتی ہے۔ اور اس کہانی میں سے ایک اور کہانی۔ تو اس کا ایک گچھا سا بن جاتا ہے۔ ایک بھول بھلیاں ہے کہ اب میں بار بار پلٹتا ہوں کہ Original کہانی کہاں گئی۔ تو اوریجنل کہانی کا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے پھر مجھے دیکھنا پڑتا تھا۔ تو وہ واقعی بھول بھلیاں ہے پوری کتاب، اور پتا نہیں چلتا ہے کہ یہ جو آدمی ہے کس وقت یہ سانپ بن جائے گا۔ یا یہ کہ یہ آدمی جو ہے یہ اصل میں آدمی نہیں ہے یہ اونٹ تھا، یہ شراپ دیا تھا کسی دیوتا نے اسے تو بے چارہ بن گیا آدمی، تو اسے تو اونٹ بن جانا ہے پھر۔ یا یہ کہ یہ ہرن، یہ ہرن جو دوڑتا پھر رہا ہے، یہ ہرن نہیں۔ اس میں تو ایسا ہے کہ ساری مخلوقات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہیں، کہانیاں گڈمڈ ہیں۔ کسی کردار کے متعلق یقین نہیں ہے کہ یہ جس جنس کا ہے واقعی اسی جنس کا ہے یا کسی سزا کے طور پر یہ بن گیا ہے۔ تو ایسے جنم بدلتے رہتے ہیں۔ جنم کہانیاں ہوتی بھی ہیں۔ یہ جنموں کا چکر ہے ہندوؤں کے یہاں، اس نے جو طلسم دکھایا ہے کہانیوں میں وہ اپنی جگہ بہت ہے۔ میں نے کہا میں تو جنموں کا قائل ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ ہمارے یہاں تو اسے کفر سمجھا جاتا ہے۔ 'مسئلۂ تناسخ' پر میرے والد نے پورا ایک رسالہ لکھا تھا کہ یہ تناسخ بالکل بکواس ہے۔ تناسخ ترجمہ ہے لفظ جنم کا۔ جب میں نے پڑھا تو مجھے لگا کہ میں تو اپنے والد کے خلاف بغاوت کروں گا۔ تو میں نے ایسی کہانیاں لکھنی شروع کر دی۔

ع س: آپ نے چونکہ اردو فکشن کے کئی دور دیکھے ہیں، منٹو کو بھی دیکھا، دیویندر ستیارتھی کو بھی، قرۃالعین حیدر کو بھی دیکھا اور اپنے معاصرین کے ساتھ اپنے بعد آنے والی نسل کو بھی دیکھا ہے۔ بلراج مین را کہتے ہیں کہ منٹو کے بعد اگر کوئی بڑا افسانہ نگار اردو میں ہے جسے ہم عالمی ادب کے بالمقابل پیش کر سکیں تو وہ انتظار حسین ہیں۔ آپ مین را کے اس دعوے سے کتنا اتفاق رکھتے ہیں۔ آپ کے سامنے قرۃالعین حیدر کا فکشن بھی ہے۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرۃالعین حیدر ناول نگاری میں اہم ہیں افسانہ نگاری میں نہیں۔

> **قرۃالعین حیدر واقعی بڑی رائٹر تھیں۔ وہ مجھ پر ایک مرتبہ غصہ ہوگئی تھیں۔ وہ کانوں کی بہت کچی تھیں۔ ان سے ایک انٹرویو میں آصف فرخی نے پوچھا کہ آپ کے خلاف بہت لوگ بولتے ہیں اور انھوں نے میرا نام لے لیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے انھیں جرمنی میں Introduce کرایا تھا، لیکن میرے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی خلاف باتیں نہیں کیں اور کہا کہ وہ یہ دیومالا دیومالا کیا کرتے ہیں، موڈرن ہندو Intellectual تو یہ مانتے ہی نہیں ہیں۔ ان دونوں باتوں کا جواب میرے پاس موجود تھا کہ جرمنی میں کون مجھے Introduce کراتا، آپ میری Senior تھیں، آپ ہی کو کرانا تھا۔**

انتظار حسین: اصل میں تو وہ ناول نگار ہیں لیکن کہانیاں بھی ایسی نہیں ہیں کہ آپ انھیں نظرانداز کر دیں۔ جو شروع کی تحریر ہیں ان کو تو جانے دیجیے، وہ زیادہ اپیل نہیں کرتیں۔ لیکن بعد میں جو کہانیاں لکھیں وہ اپنی جگہ ہیں۔ پھر ان کے جو ناولٹ ہیں وہ بہت اچھے ہیں۔ تو قرۃالعین حیدر کی برتری سے ہماری مجال نہیں کہ ہم چیلنج کریں، تو میں نے کبھی چیلنج نہیں کیا بلکہ افسانہ نگاروں کو کرتا رہا ہوں۔ قرۃالعین حیدر واقعی بڑی رائٹر تھیں۔ وہ مجھ پر ایک مرتبہ غصہ ہوگئی تھیں۔ وہ کانوں کی بہت کچی تھیں۔ ان سے ایک انٹرویو میں آصف فرخی نے پوچھا کہ آپ کے خلاف بہت لوگ بولتے ہیں اور انھوں نے میرا نام لے لیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے انھیں جرمنی میں Introduce کرایا تھا، لیکن میرے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی خلاف باتیں نہیں کیں اور کہا کہ وہ یہ دیومالا دیومالا کیا کرتے ہیں، موڈرن ہندو Intellectual تو یہ مانتے ہی نہیں ہیں۔ ان دونوں باتوں کا جواب میرے پاس موجود تھا کہ جرمنی میں کون مجھے Introduce کراتا، آپ میری Senior تھیں، آپ ہی کو کرانا تھا۔ یہ تو آپ کی مجبوری تھی۔ آپ نے افتتاحی کلمات کہے۔ تو وہ تو ٹھیک ہے اور یہ بھی کہ جب میری داستان کا ایک حصہ 'نیا دور' میں چھپا تھا اور اس کے بعد کنونشن ہوا تھا تو میں وہاں گیا تھا۔ قرۃالعین حیدر کو میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ جب دوسری نشست ہو رہی تھی تو میں اور ناصر کاظمی الگ کھڑے ہوئے تھے، جمیل جالبی بھی تھے وہاں۔ ہال کے دوسرے کنارے پر داخل ہوئے جمیل الدین عالی اور ان کے ساتھ ایک خاتون تھیں، ہم نے دیکھا تو سوچا ہوگی کوئی یہ۔ تھوڑی دیر بعد (جمیل الدین عالی مجھے ماموں کہتے تھے) انھوں نے کہا ماموں ادھر آؤ! قرۃالعین حیدر تمھیں یاد کر رہی ہیں۔ تب میں وہاں گیا اور ان سے تعارف ہوا۔ تو انھوں نے کہا کہ تمھاری جو داستان چھپی ہے وہ بہت اچھی ہے۔ میں نے کہا وہ ایک حصہ ہے، داستان کے دوسرے حصے ابھی باقی ہیں۔ انھوں نے پہلی مرتبہ نوٹس لیا تھا اس تحریر کا، باقی کے لوگوں نے تو نوٹس ہی نہیں لیا کہ یہ داستان ہے۔ یہ ہوگیا۔

اب یہ جو دیومالا کا واقعہ ہے تو میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ موڈرن ہندو انٹلکچول تو دیومالا کو Rationalize کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو دیومالا کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ داؤد رہبر دیومالا وہاں پڑھاتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکہ میں جو میرا ہیڈ تھا اس نے کہا کہ 'آپ جو دیومالا پڑھاتے ہیں اسے ہندو غلط بتاتے ہیں۔ اس نے کہا کیا غلط ہے؟ تو اس نے کہا اس میں موجود جوانٹ شنٹ باتیں ہیں۔ داؤد رہبر نے کہا جوانٹ شنٹ باتیں ہیں وہی دیومالا ہے۔ آپ میرے ساتھ ہندوستان چلیں اور مندروں میں جائیں اور دیکھیں کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں یا میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ ایک کتاب ہندوازم پر لکھی ہے اس نے ..... مشہور مصنف ہے باغی (نام بھول جاتا ہوں) تو اس نے ہندوازم پر جو کتاب لکھی ہے اس نے بڑا اعتراض کیا ہے ان لوگوں پر کہ یہ اسے Rationalize کرتے ہیں۔ وہ جو ایک نظم لکھی گئی ہے سری کرشن جی پر۔ وہ ایسی نظم ہے جس میں بالکل عریاں ہے سارا معاملہ۔ انڈین نے جو ترجمہ کیا وہ سارا غائب کر دیا کہ یہ تو زیادتی کر رہے ہیں، اصل جو کہانی ہے، شاعری ہے، واقعہ ہے اسے مسخ کر رہے ہیں۔ تو انھوں نے کہا کہ میں نے تو اوریجنل دیومالا پڑھی ہے۔ اگر کوئی ہندو Intellectual اسے Rationalize کر رہا ہے تو میں اسے رد کر دوں گا فوراً کہ وہ تو ہے ہی نہیں دیومالا۔

ع س: قرۃالعین حیدر فکشن کا سیاق تاریخی ہے، اسے ایک

معنی میں تہذیبی سیاق بھی کہا جاسکتا ہے۔ آپ کے یہاں تاریخ، تہذیب اور اسطور تخلیقی سطح پر ہم آہنگ ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ قرۃ العین حیدر کے یہاں فکشن کم تاریخ زیادہ ہے۔ آپ دونوں نے تھوڑے سے زمانی فاصلے کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ آپ کے ساتھ لکھنے والوں کا ایک قافلہ تھا، ان میں سے کچھ لوگ ابھی حیات سے ہیں اور کچھ ہم سے رخصت ہو گئے۔ کیا اردو فکشن آپ کے عہد سے آگے نکلنے میں کامیاب ہوا ہے؟

انتظار حسین: نہیں دیکھیے نا! قرۃ العین حیدر کا 'آگ کا دریا' ہی بڑا تجربہ ہے فکشن میں۔ مختصر افسانہ میں ہمارے یہاں مختلف ٹکنیک تو آ گئی تھیں بیسویں صدی والی، کرشن چندر کا افسانہ موجود ہے 'دو فرلانگ لمبی سڑک' اس سے پہلے احمد علی نے کچھ تجربے کیے تھے۔ پھر عسکری صاحب کے افسانے ہیں، ممتاز شیریں کے افسانے ہیں۔ تو اردو افسانہ بیسویں صدی میں داخل ہو چکا تھا لیکن ہمارا ناول جو تھا وہ انیسویں صدی میں سانس لے رہا تھا۔ ان کا پہلا ناول جو ہے 'میرے بھی صنم خانے' وہ بھی اسی تکنیک میں لکھا ہوا ہے لیکن بڑا تجربہ جو انھوں نے کیا وہ 'آگ کا دریا' ہے۔ لیکن ہمارے اردو افسانے یا ناول پر اس کا اثر پڑا نہیں۔ ان کو کسی نے ماڈل نہیں بنایا کہ یہ تکنیک آ گئی ہے۔ اردو افسانے میں تو لوگ جھک مارتے رہے۔ انور سجاد وغیرہ نے یہ تکنیک اختیار کی، لیکن ناول میں کسی نے جرأت نہیں کی وہ تکنیک استعمال کرنے کی۔ وہ قرۃ العین حیدر کی حد ہی تک ہے یا میرے ناولوں میں شاید آپ کو مل جائے۔

ع س: بالکل آپ کے یہاں کچھ چیزیں اس تکنیک کی ملتی ہیں۔ کچھ دنوں پہلے عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' پڑھ رہا تھا۔ اس کی اشاعت کو پچاس سال ہوئے تو یہاں اس ناول پر ایک مذاکرہ ہوا تھا۔ پھر میں نے آپ کا ناول 'بستی' پڑھا۔ 'بستی' اور 'اداس نسلیں' کا دوسرا حصہ جسے کہیں پاکستان تو کہیں ہندوستان 2 لکھا ہے۔ ان میں کچھ مماثلت ہے۔ اداس نسلیں کا موضوع اگرچہ ہندوستان ہے مگر اس میں یہاں کی تہذیبی جڑوں سے کوئی رشتہ قائم کرنے کوشش نہیں کی گئی ہے جیسا کہ آپ کے ناول میں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

انتظار حسین: اس کی ایک بڑی وجہ تو یہی ہے کہ میرا بچپن جس طریقے سے گذرا ہے، ہمارا گھر ہی ایسی جگہ تھا کہ واقعی جاڑے کی راتوں میں میری آنکھ کھل جاتی تھی، مندر قریب تھا، وہاں شنکھ پھونکا جا رہا ہے، اشلوک پڑھے جا رہے ہیں۔ تو آواز آنی شروع ہو جاتی تھیں اور پھر ان کے جو تہوار ہوتے تھے، ان کے سارے تہوار، وہ ہماری Common منڈیر تھی، اسی پر ہوتے تھے۔ جب دیوالی ہوتی تھی اور وہ دیے جلاتے تھے تو ہماری منڈیر پر دیے جلاتے تھے۔ اور پتنگ بازی میں ہم جب اپنی چھت پر جاتے تھے، جب میں اپنی چھت سے اگلی چھت پہ جاتا تھا تو وہ ہندوؤں کی چھت ہوتی تھی، اس سے اگلا گھر وہ بھی ہندوؤں کی چھت ہوتی تھی، مندر تک یہ سلسلہ جاتا تھا۔ وہاں جا کر وہ سلسلہ ختم ہوتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس زمانے میں کوئی فساد نہیں ہوا، ورنہ ہم بہت خطرے میں ہوتے (ہنستے ہوئے) تو کوئی فساد میرے بچپن میں نہیں ہوا۔ چونکہ ہمارے سامنے جو مکان تھا وہ بھی ایک فقیر چند حلوائی کا تھا۔ اس کے حوالے سے میں نے اپنا گھر پہچانا۔ جب میں گیا تو میں نے کہا یہاں ایک فقیر حلوائی کا گھر ہوا کرتا تھا۔ کسی نے بتایا فقیر چند حلوائی کی دکان تو ہے جو تم نے کہا تھا۔ میں نے کہا اس کا گھر ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ اس نے کہا کہ اس کا گھر تو یہ ہے۔ لیکن گھر کے سامنے کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے، پھر مجھے یاد آیا کہ ایک چیز دیکھنا بھول گیا کہ دروازے پہ چوکیاں بنی ہوتی تھیں پرانے مکانوں میں، ایک چوکی دائیں ایک چوکی بائیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ چوکیاں موجود تھیں، تو میں نے کہا یہ چوکیاں میرے گھر میں تھیں، تو کہا کہ چل کے دیکھیں۔ میرے ساتھی جو تھے انھوں نے انکوائری کی اور اس میں جو رہتے تھے ان سے کہا کہ ایک صاحب پاکستان سے آئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ان کا گھر ہے۔ تو اس نے کہا یہ گھر ان کا نہیں، ہم نے یہ گھر خریدا تھا۔ ہم یوں ہی آئے بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے کہا کس سے خریدا تھا۔ تو انھوں نے سجاد حسین کا نام لیا۔ میں نے کہا یہ تو ہمارے کزن تھے، آخری جو رہ گئے تھے۔ یہاں تو وہی اس کے وارث تھے، تو انھوں نے ہی بیچا ہوگا۔ ٹھیک ہے ،لیکن میں تو اس لیے آیا تھا یہاں کہ میں یہاں پیدا ہوا تھا۔ میرا بچپن یہاں گذرا ہے۔ پھر انھوں نے کہا آئیے۔ ان کی چھوٹی بیٹی تھی وہ بڑی حیران ہوئی کہ پاکستان کا ایک آدمی کہہ رہا ہے کہ میں اس گھر میں پیدا ہوا۔ اس نے میری خاطر داری کرنی شروع کر دی۔ کچوریاں پکا کر لائیں۔ وہ بھی بہت مطمئن ہوئے، خوش ہوئے کہ اچھا آپ اس گھر میں رہتے تھے۔ میں نے اس گھر کا احوال لکھا۔ اپنا ایک چھوٹا سا سفرنامہ لکھا تھا، وہ بمبئی میں کسی نے پڑھ لیا ان کے رشتہ داروں نے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کون ہے جو تم سے ملنے آیا تھا جس کے گھر میں تم رہتے ہو۔ میں دس گیارہ سال کی عمر تک وہاں رہا ہوں، پھر میں ہاپوڑ چلا گیا۔ ہمارا خاندان زیادہ تر وہاں آباد تھا۔ ہماری یہاں زمینیں بک چکی تھیں۔ ہمارے والد صاحب معلم بن چکے تھے۔ ہمارے دادا وغیرہ وہاں بڑی حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے اختیار میں ایسے ادارے تھے کہ جو رشتہ دار بے روزگار ہوتا اسے روزگار دلاتے تھے۔ تو ہمارا خاندان ادھر منتقل ہو گیا۔ وہاں کی فضا دوسری تھی۔ وہ سب مسلمانوں کا محلہ تھا۔ وہ جو ہندوؤں سے رشتہ تھا منقطع ہو گیا لیکن پھر اسکول میں وہ رشتہ قائم ہوا۔ کیونکہ جس اسکول میں میرا داخلہ ہوا (میرے والد نے کہا کہ میں نے تو اسے اتنا پڑھا دیا ہے کہ یہ نویں کلاس میں داخل ہو سکتا ہے، گورنمنٹ ہائی اسکول نے کہا کہ ہمارے یہاں کوئی طریقہ نہیں کہ نویں کلاس میں داخلہ ہو سکے۔) وہ مشنری اسکول ہندوؤں کا بنایا ہوا تھا۔ تھے کوئی Educationist۔ وہاں گئے تو انھوں نے کہا کہ بھئی نویں میں تو ہم داخل نہیں کر سکتے۔ انھوں نے ہمارا امتحان لیا اور کہا کہ آٹھویں کلاس میں داخل کر سکتے ہیں اسے، تو آٹھویں میں ہم داخل ہو گئے وہاں۔ میرے سارے کلاس فیلو جو تھے، سب ہندو تھے۔ ٹیچر سب ہندو تھے اور میں نے دیکھا کہ کیا مسلمان کوئی ہے تو معلوم ہوا کہ ایک ہے۔ میرے جو کلاس فیلو تھے ہندو، ان سے میری دوستی ہو گئی۔ ان میں سے ایک کلاس فیلو اب دلی میں آ گیا، ان سے لمبی دوستی ہو گئی، ریوتی سرن شرما (اردو کے مشہور ڈرامہ نگار)۔ تو وہ بھی وہی آٹھویں کلاس کا کلاس فیلو تھا میرا۔ تو میرا تو اچھا تجربہ ہے۔ پاکستان میں جب اس طرح کے انٹرویو شائع ہوتے تھے کہ بھئی اسکول میں ہندو تھے اور ہمارے ساتھ وہ چھوت چھات کرتے تھے، میں نے کہا کہ یہ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ پنجاب میں مسلمانوں کی Majority تھی۔ کمال کرتے ہیں۔ ہمارا تو Minority Area تھا یوپی میں۔ لیکن ہم تو بالکل برابر کی حیثیت سے ملتے تھے اور کبھی ہمیں احساس نہیں ہوا کہ وہ ہم پر بڑائی جتاتے ہوں بلکہ ہم کم بخت مسلمان' اسے سمجھتے تھے کہ ہم ہیں اصل مہذب لوگ، یہ تو دھوتی باندھتے ہیں اور دال کھاتے ہیں۔ کوئی حلوائی ہے، کوئی یہ ہے، کوئی وہ ہے۔ ہمیں تو کوئی ایسا Inferiority Complex ہوا ہی نہیں۔ اور بہت اچھے لوگ تھے وہ میرے دوست جو سارے ہندو لڑکے تھے، میری ان سے یاریاں تھیں اور بہت خوبصورت لڑکے بھی تھے، کسی کسی سے میرا عشق کرنے کو بھی جی چاہتا تھا' ایسے لڑکے تھے۔

ع س: آپ کی پرورش جیسے ماحول میں ہوئی تو اس کا اثر ہونا فطری تھا۔ آپ جس تہذیب کی بات کر رہے ہیں، اسے بنیاد بنا کر کئی ناول لکھے گئے لیکن بیشتر کے حصے میں ناکامی آئی۔ اردو کے ایک بڑے نقاد شمس الرحمن فاروقی کا ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' کے نام سے شائع ہوا، کچھ لوگ اسے نہ صرف 'آگ کا دریا' سے بڑا بلکہ اردو کا سب سے بڑا ناول کہتے ہیں۔

انتظار حسین: میں اس طرح سے موازنہ نہیں کروں گا۔ موازنہ ہو بھی نہیں سکتا۔ آگ کا دریا بالکل الگ چیز ہے اور یہ بالکل الگ چیز ہے۔ لیکن یہ اپنی جگہ پر بڑا ناول ہے۔ پوری تاریخ کو انھوں نے سمیٹا ہے اور پھر چونکہ اردو پر انھیں قدرت ہے، زبان جانتے ہیں۔ ہمارے فکشن رائٹر کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان کی اردو تو کچی ہوتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی اردو ایسی تھی کہ اس میں انگریزی بہت ملی ہوتی تھی، پھر رفتہ رفتہ انھوں نے انگریزی کو کم کیا لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا اسٹائل ایسا تھا کہ ہمیں ایسا احساس نہیں ہوتا تھا کہ ان کی اردو کمزور ہے لیکن یہ کہ وہ اجنبی اردو تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی سے انھوں نے زیادہ اثر قبول کیا تھا۔ یہ اپنی کلاسیکی اردو اور موڈرن اردو، پوری زبان سے واقفیت ہے ان کی۔ تو ان کا کام پکا ہے زبان کے حوالے سے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ عبداللہ حسین ہیں، ان کو پڑھتے ہوئے بڑی دقت ہوتی ہے، یعنی اچھی اردو نہ ہو تو مجھ سے وہ تحریر پڑھی نہیں جاتی۔ تو یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ جس زبان میں آپ لکھ رہے ہیں، ہتھیار آپ کے درست ہونے چاہئیں، جبھی تو آپ کچھ معنی پیدا کریں گے۔ وہ سمجھتے ہیں انگریزی ہم جانتے ہیں اور انگریزی فکشن ہم نے پڑھا ہے تو اردو جاننے کی کیا ضرورت ہے اور کچی پکی اردو میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ع س: 'کئی چاند تھے سرآسماں' اکیسویں صدی میں شائع ہوا ہے۔ اس صدی کے چودہ برس نکل گئے، کیا اس عرصے میں کوئی دوسرا ناول ہے جسے ہم اس صدی کا بڑا ناول کہہ سکیں؟

انتظار حسین: نہیں لیکن یہ ناول تو ہے۔ پھر پچھلی صدی میں قرۃ العین حیدر ہیں، وہ تو پوری ناول نگار ہیں۔ پھر عزیز احمد کو بھی نہیں بھولنا چاہیے، ان کا ایک ناول ہمیں بہت پسند آتا ہے 'ایسی بلندی ایسی پستی' بلکہ ان کی جو لمبی کہانیاں ہیں وہ مجھے بہت بہتر لگیں۔ ان کا میں ایک طریقے سے قائل ہوں۔ یا عصمت چغتائی کا ناول ٹیڑھی لکیر ہے۔

ع س: آپ کے بعد لکھنے والوں نے اردو افسانے میں جو تجربے کیے انھیں آپ اردو فکشن کے لیے کتنا سودمند تصور کرتے ہیں۔ میری مراد بلراج مین را، سریندر پرکاش، انور سجاد اور خالدہ حسین وغیرہ کے تجربوں سے ہے۔

انتظار حسین: دیکھیے! یہ جو ہے نا پورا School of Thought کہ علامتی افسانہ اور پھر وہ تجریدی افسانہ بن گیا، میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تجربہ تو ہونا ہی چاہیے تھا اردو میں۔ یہ ناکام ہوئے تو بھی کوئی بات نہیں۔ تجربے ناکام ہوا کرتے ہیں لیکن انھوں نے زمین ہموار کی کہ اردو فکشن آگے بڑھے۔ ہم تو حقیقت نگاری پر آ کر رک گئے تھے۔ اب پریم چند سے چلے اور منٹو صاحب آخری سرا ہے اس کا۔ یہی حقیقت نگار ہے جو حقیقت نگار نظر آتا ہے کیونکہ کرشن چندر جسے میں بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں، ان کے یہاں حقیقت نگاری تو رومانٹک حقیقت نگاری ہے۔ جن کے لیے الگ اصطلاح بنانی پڑی ترقی پسندوں کو 'Romantic Realist' لیکن اصل حقیقت جو ہے، حقیقت نگاری جسے کہتے ہیں وہ تو منٹو کے یہاں تھی۔ تو ٹھیک ہے، وہاں تک بات ختم ہو جاتی ہے، آخری افسانہ نگار ہے ہمارا وہ۔ اس کے بعد پھر ایسا لگ رہا تھا کہ لوگ انھی افسانوں کو Repeat کر رہے ہیں۔ لیکن Social Realism ترقی پسندوں کے عقیدے کا حصہ تھا۔ جب یہ علامتی افسانہ آیا تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہ کیا بکواس ہے۔ میرا علامتی افسانہ اور ان کے علامتی افسانوں میں فرق ہے۔ انھوں نے مغرب سے بیسویں صدی

کرشن چندر جسے میں بڑاافسانہ نگار مانتا ہوں، ان کے یہاں حقیقت نگاری تو رومانٹک حقیقت نگاری ہے۔ جن کے لیے الگ اصطلاح بنانی پڑی ترقی پسندوں کو 'Romantic Realist' لیکن اصل حقیقت جو ہے، حقیقت نگاری جسے کہتے ہیں وہ تو منٹو کے یہاں تھی۔ تو ٹھیک ہے، وہاں تک بات ختم ہو جاتی ہے، آخری افسانہ نگار ہے ہمارا وہ۔ اس کے بعد پھر ایسا لگ رہا تھا کہ لوگ انھی افسانوں کو Repeat کر رہے ہیں۔ لیکن Social Realism ترقی پسندوں کے عقیدے کا حصہ تھا۔ جب یہ علامتی افسانہ آیا تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہ کیا بکواس ہے۔ میرا علامتی افسانہ اور ان کے علامتی افسانوں میں فرق ہے۔

کا جو تجربہ ہے اسے ماڈل بنایا، اسی لیے ان کا افسانہ زیادہ مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ چونکہ انھوں نے اس روایت کو اچھی طرح سے ہضم نہیں کیا تھا جو مغرب میں بیسویں صدی کی روایت ہے جیمس جوائس والی۔ جوائس کا ناول مسئلہ بن گیا، سوائے عسکری صاحب کے کوئی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے یہ ناول پورا پڑھا ہے یا سمجھا ہے۔ وہ تو میرے لیے بھی مسئلہ بنا رہا، باقی چیزیں جو ہیں جوائس کی وہ تو ہم نے آسانی سے پڑھ لیں، جیسے ان کی شارٹ اسٹوری A Portrait of The Artist as a Young Man وغیرہ، لیکن جب ہم Ulysses پر آئے تو پھنس گئے۔ تو انھوں نے اس یورپی روایت کو اچھی طرح سمجھا نہیں۔ جو ان کے لکھنے والے تھے اس روایت کو پوری طرح ہضم نہ کر سکے اور ابل پڑے۔ اچھی زبان پر ان کو قدرت نہیں تھی جس میں یہ لکھ رہے تھے اور اس تیکنک پر بھی پوری قدرت نہیں تھی لیکن انھوں نے تجربہ کیا اور بہت اچھا تجربہ کیا۔ ان میں خالدہ حسین سب سے زیادہ کامیاب ہیں اور دوسرا وہ تھا اپنا بلراج مین را کا ساتھی سریندر پرکاش۔ یہ دونوں تو ہیں، پھر تیسرا آدمی جو آیا ان کے بہت بعد یہ لکھنؤ والے نیر مسعود۔ تو یہ تین تو ہیں۔ باقی یہ سب کچے پکے ہیں۔

ع س: لیکن نیر مسعود کے افسانے ان لوگوں سے بہت مختلف ہیں اور انھیں زبان پر مکمل گرفت بھی ہے۔

انتظار حسین: وہ اسی لیے مختلف ہیں کہ وہ اپنی روایت میں ہیں۔ یہ اس روایت سے ہیں جن سے میری وابستگی ہے۔

ع س: نیر مسعود کے یہاں دیومالا وغیرہ نہیں ہے مگر ان کے یہاں اپنی داستان، جسے ہم اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جرگہ، وقفہ، مراسلہ اور دوسرے افسانے خاص طور پر عطر کافور وغیرہ میں سب کچھ تخلیقی اور تصوراتی معلوم ہوتا ہے۔ واہموں کی ایک دنیا ہے۔

انتظار حسین: ارے وہ تو بہت پکے ہیں۔

ع س: بلراج مین را نے تو لکھنا چھوڑ دیا۔

انتظار حسین: انور سجاد! دونوں نے ایک ہی وقت میں چھوڑ دیا۔

ع س: تو کیا اس کے بعد خلا ہے؟ یا اس کے بعد کا فکشن آپ کو متاثر نہیں کر سکا؟

انتظار حسین: نئی چیزیں آ تو رہی ہیں مگر مجھے ان میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ لاہور میں ایک ناول لکھا گیا ہے، وہ میں نے پڑھا تھوڑا سا، میں نے چھوڑ دیا۔ فلسفہ اس کا مضمون ہے، کیا نام ہے اس کا، بہت مقبول ہو رہا ہے نوجوانوں میں۔ (ان کا اشارہ علی اکبر ناطق کی طرف تھا)

ع س: ہندوستان میں ابھی کچھ لوگ افسانے لکھ رہے ہیں۔ خالد جاوید کے دو ناول 'موت کی کتاب' اور 'نعمت خانہ' منظر عام پر آ چکے ہیں۔

انتظار حسین: میں نے انھیں پڑھا ہے مگر میں ان کا اس طرح سے قائل نہیں ہوں جس طرح سے شمیم حنفی ان کے قائل ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا افتتاح ہو رہا تھا تو مجبوراً مجھے افتتاح کرنا پڑا۔ کسی نے بتایا کہ یہ بریلی کے ہیں تو میں نے کہا کہ بریلی کا ایک گانا یاد آ رہا ہے "جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں" کہ میرا جھمکا بریلی کے بازار میں گم ہو گیا ہے۔ تو میں نے کہا کہ انھوں نے بریلی کا بازار سجا رکھا ہے، جھمکا غائب ہے، جھمکا نہیں ملتا۔ اس میں ہی میں نے اپنی پوری بات کہہ دی کہ بھئی کچھ گم ہے بیچ میں سے، سرا نہیں پکڑ میں آتا۔ کچھ اور چیزیں پڑھی ہیں، دہرایا لگتا ہے........ لیکن یہ کہ پوری طرح سے میں ان سے آشنا نہیں ہوں۔

ع س: بلراج مین را کا کہنا ہے کہ پچھلے تیس برسوں میں لوگوں نے خود کو دہرایا ہے، خواہ انھوں نے 60 کے عہد کو دہرایا یا اس سے پہلے منٹو، بیدی کو یا اس سے پہلے پریم چند کو۔ ان لوگوں نے نیا کچھ نہیں لکھا۔ آپ اس خیال سے کتنا اتفاق رکھتے ہیں؟

انتظار حسین: یہ ٹھیک کہتا ہے۔ میں اس سے متفق ہوں۔ مجھے بھی احساس ہوا کہ یہ جو گروپ ہے وہ آخری گروپ ہے، مین را، انور سجاد، خالدہ حسین، سریندر پرکاش اور نیر مسعود۔ اس کے بعد کوئی گروپ نہیں آیا۔ افراد آئے ہیں لیکن یہ ایک پوری Generation ہے جسے ہم پہچانتے ہیں کہ انھوں نے تجربہ کیا۔ کچھ ناکام ہوئے کچھ کامیاب۔ پھر اس کے بعد کوئی ایسی نسل نہیں آئی۔

ع س: پاکستان میں کچھ نام آج بھی بہت نمایاں ہیں جن میں مرزا حامد بیگ.....

انتظار حسین: یہ اسی گروپ کے ہیں۔ اسلام آباد میں ایک گروپ تھا جس میں رشید امجد وغیرہ تھے۔ منشا یاد تو اس اسلوب میں لکھتا ہی نہیں تھا، سیدھے سادے افسانے لکھے ہیں، اسی لیے وہ ان کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہو گیا۔

ع س: اسد محمد خاں نے بعد میں لکھنا شروع کیا، مجھے نہیں معلوم کہ ان کا تعلق کس نسل سے ہے، لیکن ان کے افسانے اچھے ہیں۔

انتظار حسین: اسد محمد خاں کے لکھنے کا طرز الگ ہے، انور سجاد وغیرہ سے مختلف ہے مگر ہے اسی نسل کا، اس کی کہانیاں تو سمجھ میں آتی ہیں اور وہ پاپولر بھی ہیں اپنی جگہ پر۔

ع س: تو اس کا یہ مطلب ہے کہ پچھلے تیس برسوں میں اردو میں ایسا کچھ بھی نہیں لکھا گیا جسے اضافہ کہا جاسکے؟

انتظار حسین: کچھ نہیں ہے۔ لیکن شاعری کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ وہاں جو گروپ آیا ہے خواتین کی شاعری کا وہ مجھے بہادر نظر آتی ہیں۔ اس میں ایک تو پرانی تھی جس کا آغاز 49-48 کے مشاعروں میں ہوا، انھوں نے بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں، زہرہ نگاہ۔ یہ بالکل نئی شاعرہ ہے، مشاعروں والی غزل سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر یہ فہمیدہ ریاض، کشور ناہید نئی کھیپ ہے۔ یاسمین حمید کی شاعری مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔

ع س: آپ کی تین تنقیدی کتابوں (علامتوں کا زوال، نظریے سے آگے اور اپنی دانست میں) کے مطالعے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ آپ کی تنقید میں تہذیبی عوامل کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ نے لکھا ہے: ''تہذیبی جڑوں سے نکل کر کوئی فکشن فکشن نہیں ہو سکتا'' یا ''کوئی افسانہ نگار اس وقت تک افسانہ نہیں لکھ سکتا جب تک کہ وہ اپنی تہذیب سے جڑا ہوا نہ ہو'' آپ کے یہاں جڑوں کی تلاش پر اتنا اصرار کیوں ہے؟

انتظار حسین: میرا تو ایک دکھ، ہجرت کا دکھ ہے، اس میں شکست تہذیب کا دکھ بھی شامل ہے کہ ہم نے اتنی بڑی تہذیب بنائی تھی، جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے۔ یہ نہیں ہے کہ مسلمان آئے اور اپنی تہذیب بنالی بلکہ وہ مشترکہ تہذیب تھی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں یا ہند اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ عسکری صاحب نے بھی اس پر بہت زور دیا تھا۔ بلکہ انھوں نے وہاں کہا کہ ہندوستانیت کے بغیر ہماری تہذیب بنتی نہیں ہے۔ جو چیزیں ہم نے یہاں ہندوستان سے لیں اور وہ صدیوں میں پلیں۔ آپ اسے گنگا جمنی تہذیب کہہ لیں، اگر ہند اسلامی سے اسلام آجاتا بلکہ ہندو مسلم زیادہ معتبر نام ہے کہ اسلام نہیں مسلم۔ تو وہ تہذیب جو ہے وہ بکھر گئی۔ یہ تقسیم نے جو زیادہ نقصان پہنچایا وہ مسلمانوں ہی کو نقصان پہنچایا۔ تقسیم سے ہندوؤں کا کچھ نہیں بگڑا۔ ان کا جو کچھ بھی تھا وہ ان کے پاس ہی رہا۔ ہوا یہ کہ اس کی بڑی ضرب اردو پر پڑی ہندوستان میں۔ سنہ 47 سے پہلے ہم دعویٰ کر رہے تھے کہ یہ لنگوافرینکا ہے پورے Sub-Continent کی۔ اور ہندی سے اس کا مقابلہ ہو رہا تھا، اور وہ فارمولے تلاش کیے جا رہے تھے کہ کسی طرح ان کا امتزاج ہو، گاندھی جی نے ہندی اردو ہندوستانی کا فارمولہ ایجاد کیا اور یہ اکڑے ہوئے تھے کہ صرف اردو ہے۔ یہ اکڑ بھی لے ڈوبی مسلمانوں کو۔ وہ کہتے تھے کہ ہندی اردو سے الگ زبان نہیں تھی۔ سیاسی طور پر جو اختلافات پیدا ہوئے اس سے یہ دو زبانیں بن گئیں، لیکن یہ ہے ایک زبان، تو اسے نظرانداز نہیں کر سکتے اور اصرار نہیں کر سکتے کہ اردو ہی لنگوافرینکا ہے۔ تو ایک تو اردو پر ضرب پڑی۔ یہ زیرو بن گئی فوراً۔ اس کے بعد اب کچھ سنبھالا لیا ہے۔ اور ایک یہ تہذیب جو تھی بکھر گئی۔ وہ تہذیب جو بنی تھی 800، 900 سال میں، ایک ہزار سال میں۔ آپ نے یک قلم ایسا پاکستان بنایا کہ وہ ساری مٹ گئی اور نئی تہذیب بنی نہیں۔ بنانے کی بحث شروع ہوئی۔ میں نے کہا کہ اب کیا تم Identity تلاش کر رہے ہو۔ جو آپ کی Identity بنی تھی پورے برصغیر میں اسے آپ نے رد کر دیا اور پاکستان بنا لیا اور اب کہتے ہیں کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو آپ بتائیے کون سی تہذیب بنے گی۔ تو میں نے کہا یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ میرا ایک مضمون ہے کہ یہاں پاکستان میں جو مسائل پیدا ہوئے ان میں سے ایک بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ کالا باغ ڈیم کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بار بار Controversy ہوتی ہے۔ وہ بار بار کہتے ہیں بنائیں گے لیکن بنتا نہیں ہے۔ کیونکہ سندھ والے مخالفت کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اردو کا مسئلہ بھی کالا باغ ڈیم کا مسئلہ ہے، تہذیب کا مسئلہ بھی کالا باغ ڈیم کا مسئلہ ہے اور یہ اسے حل نہیں کر سکیں گے۔ کرار صاحب نے ایک بات کہی کہ آپ کیا جلوس جلوس کرتے ہیں اور بیان دیتے پھرتے ہیں اور انجمن ترقی اردو کیا کر رہی ہے، اردو کو اس کے حال پر چھوڑ دیں، اگر یہ کسی خطہ کی علاقائی ضرورت ہے تو اس کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، وہ رہے گی۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ تو وہی ہے کہ اردو مجبوری ہے۔ وہ جو بھی آتا ہے، جب بھی عوامی ہنگامہ شروع ہوتا ہے تو اسی زبان میں تقریریں ہوتی ہیں۔ یہ جو بے وقوف لیڈر پیدا ہوا ہے عمران خان ہمارے یہاں، غلط سلط اردو بولتا رہتا ہے۔ تو اردو کے علاوہ کیا بولے گا، انگریزی میں تقریر کرے گا تو کوئی سمجھے گا نہیں۔ ایک مرتبہ جب بھٹو صاحب کا انقلاب آیا تو بھٹو صاحب بھی، اردو جیسی بھی ان کی تھی، اردو میں تقریر کرتے تھے۔ اس کے بغیر ان کی مہم کیسے چلتی۔ سندھی میں آکر تقریر کرتے لاہور میں؟ کیا کرتے وہ؟ یا پنجابی کوئی تقریر کرتا کراچی جا کر کے۔ تو وہ تو مجبوری ہے۔ بلوچستان کے ایک لیڈر نے اعتراض کر دیا وہاں پارلیامنٹ میں کہ میں تو اپنی بلوچی میں بات کروں گا، اس پر اعتراض پنجابیوں نے کیا کہ آپ بلوچی میں کیسے کریں گے یہ سب؟ وہ تو جو بیٹھے ہوئے تھے انگریزی سے ناآشنا تھے۔ تو اردو مجبوری ہے۔ لیکن تہذیب کو جو انھوں نے رد کیا کہ اس تہذیب کے سارے اثرات سے تاج محل، لال قلعہ اور فلاں اور فلاں جو نشان آپ نے بنا رکھے تھے اور تاج محل پر بہت فخر کرتے تھے تو اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو میں نے کہا تعلق نہیں ہے تو توڑ لیجیے، بنا لیجیے کوئی تاج محل پاکستان میں۔

ع س: ہمارے جتنے اہم لکھنے والے ہیں ان کا تعلق یا تو دلی سے رہا ہے یا لاہور سے۔

انتظار حسین: ہوا یہ کہ سنہ ستاون کے بعد جو فقرہ تھا 'دلی برباد لکھنؤ ویران' محمد حسین آزاد کا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ انگریزوں نے دلی کو Capital تو بنایا مگر تعلیم اور ادب کا مرکز لاہور کو بنایا۔ لاہور میں تھوڑا عرصہ گذرا کہ ایک شاعر پیدا ہو گئے اقبال۔ تو اتنی جلدی پنجاب نے اسے قبول کیا ہندوستانی روایت کو کہ حیرانی ہوتی ہے کہ بڑا شاعر پیدا ہو جائے۔ جس کی پہلے سے روایت نہ ہو، یہ بڑی بات ہے۔ یا تو یہ بات ماننی پڑے گی کہ اردو وہاں پہلے سے موجود تھی، لیکن مرکز یہاں دلی میں تھا۔ یا پھر پنجاب کی سرزمین میں قبولیت کی بڑی صلاحیت ہے، تو انھوں نے بہت جلدی اقبال پیدا کیا۔ اس کے بعد جو نئی شاعری کی روایت آئی وہ سارے پنجابی ہیں۔ فیض، راشد، میرا جی، منٹو، کرشن چندر، بیدی۔ تو یہی میں نے کہا عسکری صاحب سے کہ لاہور دیکھنے کا میرا جی چاہتا ہے کیونکہ جو اچھا رسالہ آتا ہے وہاں سے آتا ہے، کتاب

وہاں سے آتی ہے، جن ادیبوں کو میں مانتا ہوں، جو افسانہ نگار ہیں وہ وہاں کے ہیں۔ تو انھوں نے کہا لاہور آ جاؤ۔ لاہور گیا تو انھوں نے کہا یہاں پڑے رہو۔ وہاں جا کر مجھے یاد آنا شروع ہو گیا کہ میں جو مقامات چھوڑ کر آیا تھا ساری تہذیب تو وہاں پڑی ہے اور میں یہاں آ گیا ہوں۔

ع س: ہمارے یہاں تنقید اور بالخصوص فکشن کی تنقید کے مسائل بہت پیچیدہ ہیں۔ وارث علوی کا انتقال ہو گیا، انھوں نے فکشن تنقید میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ آپ ان کی تنقید کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟

انتظار حسین: وارث علوی بہت اچھا نقاد تھا۔ وارث علوی کی تنقید پر میں نے لکھا بھی ہے، میں نے اس کی کتاب پڑھ کر خط لکھ کر داد دی، میں نے کہا کہ یہ بیچ بیچ میں جو فقرہ آتا ہے وہ کچھ..... تو انھوں نے کہا کہ تم عسکری کی بہت تعریف کرتے ہو، یہ عسکری کا فیض ہے۔ ترقی پسندوں نے جو نقاد پیدا کیے وہ پورے نقاد نہیں ہیں، عسکری صاحب پورے نقاد ہیں۔ اس پر شمس الرحمن فاروقی کی بیٹی نے جو کتاب لکھی ہے اس نے تو باقاعدہ اسی سے آغاز ہی کیا ہے کہ مغربی نقادوں کا جو Canon ہے اس میں دیکھیں تو اردو کا پورا نقاد محمد حسن عسکری ہے۔ پھر اس نے پوری کتاب لکھی ہے۔ اس میں اس نے کچھ الزامات بھی لگا دیے، فراق صاحب کے حوالے سے۔ لیکن کتاب اچھی ہے۔ عسکری صاحب کی جو تنقید ہے وہ تو ہے، اس میں کلام ہی نہیں ہے۔ بعد میں صوفی بن گئے، یہاں تک تو ٹھیک ہے، پھر وہ پہنچ گئے اشرف علی تھانوی پہ، تو میں نے کہا یہ بیڑا غرق کر دیا۔ ایسے انقلابات آیا کرتے ہیں ایسے لوگوں کی زندگیوں میں۔ مذہب بڑی ظالم چیز ہے۔

ع س: وارث علوی کی تنقید سے عام طور پر لوگوں کو وہی شکایت ہے، جس کی جانب آپ نے ان کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ کیا آپ کو بھی ان کی جملہ بازی سے کوئی گلہ ہے؟

انتظار حسین: نہیں مجھے ان کی جملہ بازی سے کوئی شکایت نہیں، ایک شکایت تھی۔ میں مضمون لکھنا چاہتا تھا۔ وہ گذر گیا۔ مجھے ایک مثال یاد آ رہی تھی، ہمارا ایک شاعر تھا کراچی میں، امروہوی شاعر، نام ذہن سے اتر رہا ہے۔ اتنا پاپولر شاعر ہے، زاہدہ حنا سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ شاعر بہت اچھا تھا، تو اس نے کہا جب میں کراچی سے نکلتا ہوں تو جہاں بھی جاؤں یہ روڑی کا اسٹیشن آ جاتا ہے۔ میں لکھنے والا تھا کہ تمھاری تنقید بہت اچھی ہوتی ہے لیکن اس میں روڑی کا اسٹیشن آ جاتا ہے۔ گھوم پھر کر منٹو اور بیدی، اس کے علاوہ تمھیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ یہ کیا چکر ہے۔ باقی تو بہت اچھی تنقید ہے، منٹو اور بیدی پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی بہت اچھا ہے لیکن یہ بار بار روڑی کا اسٹیشن آ جاتا ہے۔

ع س: ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے نئے لوگوں پر نہیں لکھا ہے۔ لیکن عام طور پر ان کا لہجہ وہی ہوتا ہے۔ وہ منٹو اور بیدی سے آگے نہیں نکلتے، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمن فاروقی نے بھی فکشن پر لکھا ہے۔

انتظار حسین: نارنگ صاحب بھی بیدی پر پھنسے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی وہ آگے آئے نا ہماری جنریشن تک۔

ع س: آپ کے مطابق وارث علوی منٹو اور بیدی تک رک گئے، گوپی چند نارنگ صاحب ایک قدم آگے آپ کی Generation تک آ کر رک گئے، شمس الرحمن فاروقی کی فکشن تنقید نے کتنا سفر طے کیا؟

انتظار حسین: فکشن کی تنقید ایک تو یہ ہے کہ وہ لائن کراس کرنی مشکل ہوتی ہے۔ یہ سب نقادوں کا مسئلہ ہے۔

> **ترقی پسندوں نے جو نقاد پیدا کیے وہ پورے نقاد نہیں ہیں، عسکری صاحب پورے نقاد ہیں۔ اس پر شمس الرحمن فاروقی کی بیٹی نے جو کتاب لکھی ہے اس نے تو باقاعدہ اسی سے آغاز ہی کیا ہے کہ مغربی نقادوں کا جو Canon ہے اس میں دیکھیں تو اردو کا پورا نقاد محمدحسن عسکری ہے۔ پھر اس نے پوری کتاب لکھی ہے۔ اس میں اس نے کچھ الزامات بھی لگادیے، فراق صاحب کے حوالے سے۔ لیکن کتاب اچھی ہے۔ عسکری صاحب کی جو تنقید ہے وہ تو ہے، اس میں کلام ہی نہیں ہے۔**

یہ ایک ایسی لائن کھنچ گئی ہے جیسے 1857 کے بعد 1857 کی لائن ایسی تھی، کھنچ تو گئی تھی لیکن وہ لائن کو پار نہیں کر پا رہے تھے، پھر نئی بغاوتیں وغیرہ ہوئیں کہ اس سے آگے آؤ۔ وہی مسئلہ ہے۔ لیکن تنقید آگے تو بڑھی ہے۔ عسکری صاحب آگے نہیں نکلے، سب سے زیادہ تو وہ پھنسے ہوئے تھے، نئے لوگوں میں سب سے زیادہ سخت تنقید مجھ پر لکھی ہے۔ میرے مجموعے پر لکھا ہے۔ میں بندر کی دم مختلف موقعوں پر استعمال کرتا ہوں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ بھیم کہیں جا رہے تھے تو راستے میں ایک بندر کی دم پسری ہوئی تھی۔ بھیم نے کہا دم سمیٹ لو۔ بندر نے کہا تم دم پار کر لو۔ بھیم دم کے کنارے کنارے چلنے لگے کہ جہاں دم ختم ہو گی اس پار چلے جائیں گے لیکن دم ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ تو تعارف ہوتا ہے کہ وہ بندر اصل میں ہنومان تھا۔ اس کا رشتہ ملتا ہے بھیم سے۔ کہتے ہیں کہ معنوی طور پر وہ انھی کی اولاد تھا۔ تو بندر کی دم میں مختلف موقعوں پر استعمال کر چکا ہوں کہ بیچ میں بندر کی دم آ جاتی ہے، ہم اسے کراس نہیں کر پا رہے ہیں۔ تو آپ جس بات کی شکایت کر رہے ہیں وہ بھی بندر کی دم ہے۔ مجھے خود اس بات کی شکایت ہوتی تھی کہ یہ جو تیسری چوتھی دہائی ہے وہ ٹھیک ہے ایک جنریشن تھی، اس نے بہت کچھ ہمیں دیا لیکن یہ آگے کیوں نہیں آتے۔ آگے جو کچھ لکھا جا رہا ہے اسے دیکھیں، وہیں اٹکے ہوئے ہیں۔

ع س: ایک رشتہ تو بنتا ہے۔ ہم ایک رشتہ قائم کر سکتے ہیں انتظار حسین کا منٹو سے، منٹو کا پریم چند سے اور پریم چند کا کسی دوسرے سے، یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ انتظار حسین نے کتنے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا ہے یا انتظار حسین کے افسانے سے نیا افسانہ کس طرح اپنی راہ نکالنے میں کامیاب ہوا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ایسے مطالعات منظر عام پر نہیں آتے، کیا نقادوں نے نئے لوگوں کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے یا وہ ان مسائل سے آنکھیں چرا رہے ہیں جنھیں نیا افسانہ پیش کر رہا ہے؟

انتظار حسین: یہ ایک ایسی لکشمن ریکھا ہے جہاں سب رک جاتے ہیں۔ جو جنریشن تھی وہ کافی عرصے تک ہم نے دیکھی، لاہور میں بھی دیکھی، نئے لوگوں پر لکھتے تو ہیں مگر وہی کہ ... مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ اب جیسے ناصر کاظمی تھا منیر نیازی تھا، یہ نئے شاعر تھے اور ان پر لکھا بھی گیا۔ باتیں بھی کیں لوگوں نے لیکن یہ فیض نہیں، تو آگے نہیں بڑھتے یہ لوگ۔ داد دیتے ہیں کہ ہاں ٹھیک ہے بہت اچھا شاعر ہے۔ منیر نیازی کے بہت قائل ہو گئے تھے لوگ اور ناصر کاظمی کے بھی لیکن کہیں نہ کہیں پھنسے ہوئے تھے کہ اس لائن کو کراس نہیں کریں گے۔ اب اپنے دوست شمس الرحمن فاروقی بھی بڑے داد دیتے ہیں کہ ناصر کاظمی اور احمد مشتاق فراق سے بڑے شاعر ہیں، لیکن یہ بات ہم نہیں مانتے، ساری دوستی کے باوجود یہ کہ فراق سے بڑا شاعر مان لوں احمد مشتاق اور ناصر کاظمی کو، تو ذہنی طور پر میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔

ع س: ابھی آپ نے شمس الرحمن فاروقی کے حوالے سے موازنہ اور تقابل کی جس روش کو بیان کیا ہے اسی طرح سے کچھ لوگ اقبال کے باوجود فیض کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر کہتے ہیں۔

انتظار حسین: یہ تو غلط بات ہے، میں تو اقبال سے بڑا کسی کو نہیں مانوں گا، خواہ وہ فیض ہوں، میرا جی ہوں، راشد ہوں، کیونکہ بندر کی دم وہاں بھی ہے۔ میں اس لائن کو کراس نہیں کر سکتا۔ وہ بڑا شاعر ہے۔

■

Abdus Samee, JNU, New Delhi - 110067
2nd Floor, S-3/6, Jogabai Ext. Jamia Nagar, New Delhi - 110025

مناظر عاشق ہرگانوی

کلیم عاجز کی یادیں اور باتیں

شاعری میں اپنے رنگ کا آخری ستون بھی گر گیا۔ نہ آندھی آئی، نہ طوفان آیا۔ وہ صحت مند تھے۔ تبلیغی جماعت کے امیر ہونے کی حیثیت سے ہزاری باغ گئے تھے۔ وہاں ان کی چھوٹی بیٹی شمیمہ اور داماد پروفیسر فاروق اعظم رہتے ہیں۔ ان ہی کے گھر قیام تھا۔ صبح ناشتے کے بعد انھیں ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ لحاف اوڑھ کر لیٹے لیکن استنجا کی حاجت ہوئی۔ وہ ٹوائلٹ گئے اور وہیں بے ہوش ہو گئے۔ فوراً انھیں ندان ہیلتھ سنٹر میں داخل کیا گیا۔ لیکن یہ ایک گھنٹہ کا وقفہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ میں موت کی وجہ Cardio Respiratory Failure ہے۔ سات بجے بے ہوش ہوئے تھے۔ آٹھ بجے موت کا پروانہ تھما دیا گیا۔

ان کی پیدائش اسکول کے ریکارڈ کے مطابق 11 اکتوبر 1924 کو ہوئی۔ ان کا انتقال 15 فروری 2015 میں ہوا۔

کلیم عاجز کی موت کی خبر کی تصدیق کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، کولکاتا کے ڈائرکٹر امام اعظم نے مجھے فون کیا۔ یہ پہلا فون تھا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو انھوں نے کہا کہیں سے پتہ کیجیے۔ میں نے پٹنہ میں اردو کتابوں کے مرکز بک امپوریم کے مالک فہمی صاحب کو فون کیا۔ انھیں بھی جانکاری نہیں تھی۔ البتہ شمیم قاسمی (پٹنہ) اور منصور خوشتر (دربھنگہ) نے صورتِ واقعہ سے آگاہ کیا کہ ہزاری باغ میں انتقال ہوا جہاں سے میت پٹنہ لائی جا رہی ہے۔ شام ہوتے ہوتے کئی فون آگئے۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی نے فون پر ہی قطعہ تاریخ سنایا

بجھ گیا اب وہ چراغِ زندگی — علم کی پھیلائی جس نے روشنی
جو قلندر کی طرح جیتا رہا — فخر دنیا و متاعِ دین بھی
تھی کلیم عاجز کی ہستی بے گماں — افتخارِ علم و دانش آگہی
ہیں مسلم جن کے فن کی خوبیاں — تمکنت، تہذیب اور شائستگی
ہم جسے طرزِ کلیمی جانتے — دولتِ سوز دروں بھی ہے وہی
عالم اردو ادب ہے سوگوار — ہستی دنیا سے عظیم ایسی اٹھی
وہ کلیم عاجز گئے، لو! اپنے آج — آبرو جو تھے عظیم آباد کی
326 — +1689 = 2015ء

میری آنکھوں میں کتنے ہی ماہ و سال اتر آئے۔ 1969 میں پہلی بار کلیم عاجز صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں کسی کام سے پٹنہ میں تھا۔ غبار بھٹی صاحب نے کہا، کل 'بزمِ کاف' کی طرف سے ایک شعری نشست ہے چلنا ہے، وہاں سید حسن، عطا کاکوی، رضا نقوی واہی، کلیم عاجز اور دوسرے شاعر ہوں گے۔ میں نے وہیں کلیم عاجز صاحب کو دیکھا اور سنا۔ مرنجاں مرنج کُرتا، پائجامہ، شیروانی اور کج کلاہ میں۔ لیکن آواز میں جادو تھا۔ خود کو نمایاں رکھنے کی صلاحیت تھی اور غمِ ذات کو غمِ کائنات بنانے کا ہنر جانتے تھے۔

پھر ایسا ہوا، 1972 میں پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا تو کلیم عاجز صاحب بھی وہاں استاد تھے۔ ہمارا سیشن 73-1971 کا تھا لیکن فائنل اگزام جے پی موومنٹ کی وجہ سے 1975 میں ہوا تھا۔ چار سال تک میں کلیم عاجز صاحب سے ملتا رہا، ہر زاویے دیکھتا رہا، قربت حاصل کرتا رہا۔ بعد میں بھی پٹنہ، گیا اور رانچی میں ان سے ملاقاتیں رہیں۔ گفتگو میں خلوص کی مہک کبھی کم نہیں ہوئی۔

ایم اے کا اگزام ختم ہوا تو آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں مجھے ملازمت مل گئی۔ کیزول آرٹسٹ کی حیثیت سے پروڈکشن اسسٹنٹ کے پوسٹ پر نو مہینے تک وہاں رہا۔ اس دوران دو یا تین بار کلیم عاجز صاحب ریکارڈنگ کے لیے ضرور آئے۔

شمیم فاروقی پروگرام اگزیکٹو تھے۔ مظہر امام صاحب پروموشن پر دوردرشن، سری نگر جاچکے تھے۔ میرے ذمے بہت کام تھا۔ کلیم عاجز صاحب کی تخلیق پر میں ہی ایک نظر ڈالتا تھا کہ ریڈیو کی پالیسی کے مطابق ایسا کرنا ہوتا تھا اور مسودہ پر دستخط کرنا پڑتا تھا۔ ریکارڈنگ، ڈبنگ اور براڈ کاسٹنگ بھی میں ہی کرتا تھا۔ کلیم صاحب جب بھی آئے میں نے ان کا زیادہ وقت برباد ہونے نہیں دیا۔ اس کے لیے وہ شکریہ ضرور ادا کرتے تھے۔

ایم اے کے دوران ایک دن کلیم عاجز صاحب نے مجھے اور رضوان احمد کو اپنے گھر پر بلایا۔ رضوان احمد ہفتہ وار 'عظیم آباد اکسپریس' نکال رہے تھے اور ایم اے میں مجھ سے ایک سال جونیر تھے۔ لیکن ہم دونوں کی دوستی خوشبو کی طرح پورے پٹنے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ وقت مقررہ پر بی این کالج کے سامنے 'جنتا بِڈنگ ہاؤس' ہم دونوں پہنچے۔ کلیم صاحب نے بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر باتیں 'عظیم آباد اکسپریس' سے شروع ہوئیں۔ رضوان احمد کی بے باک صحافت سے وہ خوش نہیں تھے۔ مشفقانہ انداز میں سمجھاتے رہے کہ لوگوں کی پگڑی اچھالنا بند کریں ورنہ آگے کے کیریئر پر اس کا اثر پڑے گا۔ مجھے بھی وہ سمجھاتے رہے کہ شعبے کے دیگر اساتذہ کا احترام کروں، ان کی علمیت کا امتحان نہ لوں اور یہ کہ گوپال متل کی کتاب 'لاہور کا جو ذکر کیا' وہ پڑھنا چاہتے ہیں۔

اسی ملاقات میں ان سے 'عظیم آباد اکسپریس' کے لیے میں نے انٹرویو لیا تھا:

سوال: آپ پروفیسر ہیں اور بڈنگ کی دکان پر بھی بیٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: بہت دردناک کہانی ہے۔ 1940 میں میٹرک پاس کیا تھا۔ 41ء میں آئی اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ 1942 میں پٹنہ میں ہی انوار فاطمہ سے میری شادی ہو گئی اور میں پٹنہ کا ہو کر رہ گیا۔ معاش کا مسئلہ حل کرنے کے لیے 1944 میں یہ دکان کھولی اور بڈنگ کا کاروبار شروع کیا جس سے معاشی اور جذباتی تعلق ہے۔

س: آپ جب مستقل طور پر پٹنہ آ گئے تو آپ کی والدہ وغیرہ آپ کے ساتھ تھیں؟

ج: نہیں۔ اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ 1946 کے ہولناک فساد میں میری ماں، چھوٹی بہن اور بائیس رشتہ داروں کو فسادیوں نے تہہ تیغ کر دیا۔ وہ خونیں حادثہ میرے لاشعور میں بسا ہوا ہے۔

س: تعلیمی سلسلہ کیسے جاری رکھ سکے؟

ج: ایسی دکان میں بیٹھ کر نالندہ کالج بہار شریف سے 1954 میں پرائیویٹ طور پر آئی اے، 1956 میں اردو میں بی

کلیم عاجز کی کہانی ماہ و سال کی زبانی

11 اکتوبر 1926: پیدائش (اسکول کے ریکارڈ کے مطابق 11 اکتوبر 1924)

1932: ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے نانا مولوی سید ضمیر الدین کے مکتب سے کیا۔

1937: زندگی میں پہلی غزل کہی اور پہلی بار عاجز تخلص استعمال کیا۔

1939: پٹنہ مسلم ہائی اسکول (پٹنہ) میں نویں درجہ میں داخلہ لیا اور ڈبل پروموشن حاصل کیا۔ پٹنہ کالج کی بزم ادب کے فی البدیہہ مشاعرہ میں شرکت کی اور اول انعام حاصل کیا۔

1940: میٹرک میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ پورے بہار میں پانچویں پوزیشن اور چاندی کا تمغہ حاصل کیا۔ آئی اے میں داخلہ لیا۔ بی این کالج کے موضوعاتی انعامی مقابلے میں اقبال پر ایک نظم لکھ کر اوّل انعام حاصل کیا۔

1941: والد کا انتقال۔ تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

1942: رئیس پٹنہ 'شیخ کنواں' کی پوتی انوار فاطمہ کے ساتھ رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے۔

1944: مستقل طور سے پٹنہ میں سکونت پذیر ہوئے اور بی این کالج کے سامنے بڈنگ کا کاروبار شروع کیا۔

1946: بہار میں ہولناک فساد شروع ہوا۔ تلہاڑا میں ماں، چھوٹی بہن اور 22 رشتہ داروں کو کھویا۔

1949: مشاعرے میں شرکت کی غرض سے پہلی غزل کہی اور پہلی بار مشاعرے میں شرکت کی۔ جسے 'انجمن رفیق الشعرا' نے لودی کٹرہ پٹنہ سٹی میں منعقد کیا تھا۔

1951: پہلی بار پٹنہ سے باہر جمشید پور مشاعرے میں بلائے گئے۔ جسے 'بزم فرح' نے منعقد کیا تھا۔

1954: تعلیمی سلسلہ پھر سے شروع کیا اور باڑھ کالج سے سنٹ اپ ہو کر نالندہ کالج بہار شریف، بہار یونیورسٹی سے پرائیوٹ طور سے آئی اے کیا۔

1956: بی اے آنرس (اُردو) میں پٹنہ یونیورسٹی میں اوّل مقام حاصل کیا اور چار طلائی تمغے سے سرفراز کیے گئے۔ پہلا تمغہ اول مقام حاصل کرنے پر، دوسرا تمغہ امتیازی نمبر یعنی ڈِسٹنکشن حاصل کرنے پر، تیسرا تمغہ اردو کمپوزیشن میں سرفہرست رہنے پر اور چوتھا تمغہ بی این کالج کے طالب علم کو پہلی بار طلائی تمغہ ملنے پر کالج کی جانب سے حاصل ہوا۔

1958: ایم اے (اُردو) میں پٹنہ یونیورسٹی میں اول مقام حاصل کیا اور طلائی تمغے سے سرفراز کیے گئے۔

1960: ان کی پہلی کتاب 'مجلس ادب' (یادگار شعری مجلسوں کی روداد) شائع ہوئی۔

1960: تبلیغی جماعت سے منسلک ہوئے اور بہار کے 'امیر جماعت' بنائے گئے۔

1965 مارچ: پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پٹنہ کالج (پٹنہ یونیورسٹی) میں لکچرر ہوئے۔

1965 اگست: 'اورینٹل کالج' پٹنہ سٹی میں لکچرر ہوئے۔ پی ایچ۔ڈی کے لیے وزارتِ تعلیم حکومت ہند کی جانب سے وظیفہ ملا۔

1966: پہلی بار ہندستان سے باہر جدّہ، مشاعرے میں بلائے گئے اور پہلا حج بھی کیا۔

1975: اپنی غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا جسے 'بزمِ کاف' نے جنوری 1976 میں شائع کیا۔

1979: مئی میں پاکستان مشاعرے میں بلائے گئے پھر 'مسلم کمیونٹی سنٹر' کی دعوت مشاعرہ پر امریکہ گئے اور پھر لوٹتے ہوئے دوبارہ دسمبر میں پاکستان تشریف لے گئے۔

1980: خودنوشت 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی۔۔۔' شائع ہوئی۔

1981: ان کی نثری تصانیف 'ایک دیس اک بدیسی'، 'یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ' شائع ہوئیں۔ میر اکادمی، لکھنؤ نے 'امتیازِ میر' ایوارڈ سے نوازا۔

1982 (جنوری): پاکستان میں امت الفاطمہ اکادمی (کراچی) نے ان کی غزلوں کا مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' طبع دوم شائع کیا۔

1984 (اکتوبر): شعبہ اُردو، پٹنہ کالج، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ سے بحیثیت ریڈر، ملازمت کی مدّت مکمل کر کے سبکدوش ہوئے۔

1984 (31 اکتوبر): مشاعرے میں شرکت کے لیے امریکہ تشریف لے گئے۔ پھر کناڈا گئے اور ٹورنٹو میں 'انجمن ترقی اُردو' کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرہ میں بھی شرکت کی اور اس کے بعد لگ بھگ ہر سال یہ سلسلہ جاری رہا۔

1985 (26 جنوری): فجر میں نماز کی حالت میں دورۂ قلب کا احساس ہوا۔ گھر آ کر حالت غیر ہو گئی اور فوراً داخلِ اسپتال ہوئے۔

1987: اہلیہ کے ساتھ سعودی عرب تشریف لے گئے اور حج کے بعد واپس ہوئے اور اس کے بعد لگ بھگ یہی سلسلہ جاری رہا۔

1988 (فروری): 'انڈو قطر اردو سوسائٹی' کی دعوت پر قطر تشریف لے گئے۔

1989 (جنوری): حکومت ہند نے ان کی خدماتِ اردو ادب کے اعتراف میں انھیں 'پدم شری' کے خطاب سے نوازنے کا اعلان کیا۔

1989 (جولائی): امریکہ اور کناڈا کا سفر ہوا اور 25 نومبر کو ہندستان تشریف لائے۔

1900 (فروری): 'انڈو قطر اُردو سوسائٹی' کی دعوت پر مشاعرے میں شرکت کے لیے قطر تشریف لے گئے۔

1900(اکتوبر): دوسرے مجموعہ غزل 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی' کی تقریبِ اجرا کے موقع پر سعودی تشریف لے گئے۔
1991: دوبئی میں 'جب فصلِ بہاراں آئی تھی۔۔۔' کی رسم اجرا عمل میں آئی اور اس تقریب میں مجروح سلطانپوری نے بھی شرکت کی اور اپنا مقالہ پڑھا۔
1992: خودنوشت 'ابھی سن لو مجھ سے۔۔۔' شائع ہوئی۔
1996(اکتوبر): طوبیٰ پبلی کیشنز، حیدرآباد نے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' (طبع سوم) شائع کیا۔
1998: 'دیوانے دو' (خطوط کا مجموعہ) اور 'دفتر گم گشتہ' (پی ایچ-ڈی کا مقالہ) شائع ہوئے۔
2001: محکمہ راج بھاشا حکومت بہار کے ذریعے ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے کا مولانا مظہر الحق ایوارڈ ملا۔
2002(اکتوبر): نعتوں اور نظموں کے مجموعہ 'کوچہ جاناں جاناں' کی اشاعت عرشی پبلی کیشنز انڈیا، دہلی کے زیر اہتمام ہوا۔
2002(22 جولائی): اہلیہ کا دورۂ قلب کے سبب انتقال ہوا۔
2003: 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کا ہندی ایڈیشن کلیم عاجز اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ (یہ اکادمی صرف کاغذ ہی پر رہی)
2004: پہلو نہ دُکھے گا۔۔۔ (خطوط کا مجموعہ)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شائع کیا۔
پروفیسر محسن عثمانی کی کتاب 'کلیم احمد عاجز: شخصیت اور شاعری'، عالمی رابطہ ادب اسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ذریعے شائع۔ 'انجم کے نام خطوط' کے مجموعے کی اشاعت۔ 'انوار العلوم کالج' کے زیر اہتمام انڈو پاک مشاعرے میں شرکت۔ توصیفی سند اور یادگاریہ (میمنٹو) سے سرفراز۔
2005: 'میری زباں میرا قلم' (مضامین کا مجموعہ)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے دو جلدوں میں شائع کیا۔
2007: گورنر راج میں بہار کے گورنر سردار بوٹا سنگھ نے کلیم عاجز کو اردو مشاورتی کمیٹی بہار کا صدر نشیں بنایا۔ لیکن انھوں نے محکمہ راج بھاشا کو لکھا کہ مجھے جب تک اس کے ساتھ وزیر کی سہولیات نہیں ملیں گی میں اپنی ذمے داری نہیں سنبھالوں گا۔
2008: 'پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا' (غزلوں اور متفرق کلام کا مجموعہ)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے شائع کیا۔
☆ ماہِ مارچ میں رابطہ ادب اسلامی، دہلی کے ذریعے 'مولانا ابوالحسن علی ندوی ایوارڈ' سے سرفراز۔
☆ 17 جون کو گورنر راج کے دوران لیے گئے فیصلے کے مطابق نتیش حکومت نے ڈاکٹر کلیم عاجز کو اردو مشاورتی کمیٹی بہار کا صدر نشیں بنایا اور انھیں وزیر کابینہ کی سہولیات بھی دی گئیں۔
2008(27 دسمبر): American Federation of Muslims of Indian Origin AFMI (USA & Canada) کے ذریعے شیراٹن ہوٹل، آگرہ (اتر پردیش) میں منعقدہ ایک پروگرام میں 'میر تقی میر ایوارڈ' اور پچاس ہزار روپے نقد انعام سے نوازے گئے۔
2011(17 جون): اردو مشاورتی کمیٹی بہار کے صدر نشیں کی حیثیت سے تین سالہ مدت پوری کی۔
پٹنہ یونیورسٹی سے .Life Time Achievement Award سے نوازے گئے۔
2012(18 مئی): دوسری بار اردو مشاورتی کمیٹی بہار کے صدر نشیں بنائے گئے اور 21 مئی کو سعودی عرب سے آن لائن جوائننگ دی۔
2012(21 دسمبر): غالب اکیڈمی دہلی کی جانب سے 'غالب ایوارڈ' (for Life Time Achievement Award) سے سرفراز کیے گئے جس میں ایک توصیفی سند، میمنٹو اور پچھتر ہزار روپے نقد شامل ہیں۔
2013(23 اپریل): ڈاکٹر ابوالحیات کی پی ایچ-ڈی کی تھیسس 'کلیم عاجز کی نثر نگاری' خدا بخش لائبریری نے شائع کی اور 23 اپریل کو اس کا اجرا عمل میں آیا۔
7 ستمبر 2014: حمایت نگر، حیدرآباد میں کلیم عاجز کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد اور مقالوں کے مجموعے بعنوان 'کلیم احمد عاجز' کا اجرا۔
15 فروری 2015 بوقت 8 بجے دن Cardio Respiratory Failure کے سبب چھوٹی بیٹی شمیمہ کلیم کے سسرال ہزاری باغ میں انتقال۔
16 فروری 2015۔ 10.20 بجے دن گاندھی میدان میں نماز جنازہ اور راجا بازار سمن پورہ قبرستان میں تدفین۔ نماز جنازہ امیر شریعت حضرت مولانا نظام الدین امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ نے پڑھائی۔

کلیم عاجز کی مطبوعہ کتابیں:

1. وہ جو شاعری کا سبب ہوا، مجموعہ غزل مع خودنوشت (1976,1980,2010)
2. جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، خودنوشت (1980-2005)
3. یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ، سفرنامۂ حج (1981)
4. اک دیس اک بدیسی، سفرنامہ امریکہ (1981,2012)
5. مجلس ادب یادگار شعری محفلوں کی روداد (1960,2003)
6. جب فصل بہاراں آئی تھی (مرتب ڈاکٹر اسلم جاوداں)، غزلوں کا مجموعہ (1990)

اے آنرس، 1958 میں اردو میں ایم اے پاس کیا، پی ایچ ڈی 1965 میں کی۔

س: پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا؟

ج: بہار میں اردو شاعری کا ارتقا۔

س: لکچرر کب ہوئے؟

ج: 1965 میں ہی پٹنہ کالج میں لکچرر ہوا اور آج تک پٹنہ یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں۔

س: آپ مشاعرہ کے مشہور شاعر ہیں۔ شاعری کرنے اور مشاعرہ پڑھنے کی تحریک کہاں سے ملی؟

ج: گیارہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی اور 1937 میں عاجز تخلص رکھا۔

س: اور مشاعرہ میں شرکت؟

ج: 1949 میں۔ پٹنہ سٹی میں منعقد ہوا تھا۔ میں نے غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی غزل کہی تھی جس کی داد خوب ملی اور 1951 میں جمشید پور کے مشاعرے میں بلایا گیا۔ پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ 1966 میں جدہ کے مشاعرہ میں جانا ہوا۔

س: آپ کا مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے؟

ج: 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کے نام سے کتاب مکمل ہو چکی ہے۔ 'بزم کاف' والے طبع کرائیں گے۔ وہ صدر جمہوریہ ہند سے اجرا کرانا چاہتے ہیں۔ تاریخ ملنے میں دیر ہو رہی ہے۔

1976 میں یہ مجموعہ چھپا اور ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ کلیم عاجز نے 1966 میں پہلا حج کیا تھا۔ لیکن سفرنامہ 1981 میں "یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ" کے نام سے شائع کرایا۔ اس سے قبل 1980 میں خودنوشت 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' شائع ہو چکی تھی۔ ان کی ایک کتاب 'مجلس ادب' ہے جس میں یادگار شعری محفلوں کی روداد ہے۔ میں نے دوسرا ایڈیشن 2003 میں دیکھا تھا جبکہ پہلا ایڈیشن 1960 میں شائع ہوا تھا۔ 1990 میں ڈاکٹر اسلم جاوداں نے ان کی غزلوں کا مجموعہ 'جب فصل بہاراں آئی تھی' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ خودنوشت کو کلیم عاجز صاحب نے 'ابھی سن لو مجھ سے' کے نام سے آگے بڑھایا تھا۔ 1992 میں یہ کتاب چھپی تھی۔ خطوط کا مجموعہ 'دیوانے دو' 1998 میں، پی ایچ ڈی کی تھیسس 1988 میں، نظموں کا مجموعہ 'کوچۂ جاناں' 2002 میں، خطوط کا دوسرا مجموعہ 'پہلو نہ دکھے گا' 2004 میں، مضامین کا مجموعہ دو حصے میں 'میری زبان میرا قلم' 2004 اور 2005 میں اور غزلوں، نظموں کا مجموعہ 'پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا' 2008 میں قارئین تک پہنچے۔

کلیم عاجز بحیثیت ریڈر 1984 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ میں جب طالب علم تھا تب دو واقعے ایسے ہوئے جن کا ذکر ضروری ہے۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک

7. ابھی سن لو مجھ سے، خودنوشت (1992)
8. دیوانے دو، خطوط کا مجموعہ (1998)
9. بہار میں اردو مشاعری کا ارتقا (دفتر گم گشتہ)، پی ایچ ڈی کی تھیسس (1998)
10. کوچۂ جاناں جاناں، نظموں کا مجموعہ (2002)
11. وہ جو شاعری کا سبب ہوا، ہندی مجموعہ غزل (2003)
21. پہلو نہ دُکھے گا، خطوط کا مجموعہ (2004)
13. میری زبان میرا قلم (حصہ اول)، مجموعہ مضامین (2005)
14. میری زبان میرا قلم (حصہ دوم)، مجموعہ مضامین (2005)
15. پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا، ابتدائی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ (2008)
16. ہاں چھیڑو غزل عاجز (مرتب ڈاکٹر اسلم جاوداں)، تیسرا مجموعہ غزل (دلی میں زیر اشاعت)

کلیم عاجز کے والدین: شیخ کفایت حسین (والد)، امت الفاطمہ شہید (والدہ)

کلیم عاجز کی اہلیہ: انوار فاطمہ مرحومہ (پٹنہ کے مشہور رئیس شیخ کنواں کی پوتی)

کلیم عاجز کے بھائی: (1) محمد سلیم احمد مرحوم (2) محمد علیم احمد مرحوم (3) محمد نسیم احمد (معروف سینئر صحافی راشد احمد کے والد محترم)

کلیم عاجز کے بیٹے: (1) ڈاکٹر وسیم احمد، ماہر امراض قلب (2) انجینئر احمد فاطمی (3) انجینئر ارشد فاطمی (4) پروفیسر امجد فاطمی

کلیم عاجز کی بیٹیاں: (1) پروفیسر نجمہ خاتون (2) شمیمہ خاتون ترتیب: اسلم جاوداں

بہت تھی۔ کلیم عاجز صاحب حسب معمول کرتا، پائجامہ اور بنڈی میں ڈپارٹمنٹ آئے۔ ہم سب طالب علم فُل سویٹر اور کوٹ میں کانپ رہے تھے۔ شعبے کے ایک استاد کلاس لے رہے تھے۔ انھوں نے کلیم صاحب کو دیکھ کر آہستہ سے کہا ''بڈنگ ہاؤس کی گرمی ساتھ لیے چلتے ہیں۔'' مخاطب ہم طلبا تھے۔ لیکن کلیم صاحب نے یہ جملہ سن لیا۔ وہ پلٹ کر ان کے پاس آئے اور بہت خفا ہوئے۔ ایسی خفگی پہلی بار میں نے دیکھی۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

دوسرا واقعہ براہ راست مجھ سے جڑا ہوا ہے۔ میرے بچپن کا ایک دوست ڈاکٹر محمد سہیل ہے (بعد میں وہ بحرین کے شاہ کا ڈاکٹر ہوا)۔ وہ ایم بی بی ایس پاس کرنے کے بعد نوکری میں آیا تو اس کی پہلی پوسٹنگ گڈا بلاک کے ہاسپٹل میں ہوئی۔ وہاں کے بی ڈی او بھی مسلمان تھے۔ دونوں نے مل کر پروگرام بنایا کہ مشاعرہ کیا جائے۔ سہیل پٹنہ آ کر مجھ سے ملا اور کلیم عاجز صاحب کے ساتھ چار پانچ شاعروں کو لے کر آنے کے لیے کہا۔ کلیم صاحب کا اور دیگر چار شاعروں کا نذرانہ طے ہوا۔ تاریخ طے ہوئی اور میں نے کلیم صاحب کو راضی کر لیا کہ گڈا چلیں گے۔ کیف عظیم آبادی، مزاحیہ شاعر بگٹٹ عظیم آبادی اور دو تین دوسرے شاعروں کو لے کر ٹرین سے جے سی ڈیہہ ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ وہاں کار موجود تھی۔ اس سے گڈا پہنچے۔ ایک مکان کے دو کمرے میں ہمیں ٹھہرایا گیا، دن کے قریب تین بجے ہم کھانا کھا رہے تھے کہ گاؤں کے کچھ لوگ آ کر ہمیں جھانکتے اور آپس میں کہتے ''قوال لوگن آگیلو چھئے۔''

کلیم صاحب کم گو تھے۔ پھر بھی مجھے اشارے سے بلا کر انھوں نے خفگی کا اظہار کیا ''کیسے لوگوں کے بیچ لے آئے ہیں، ہمیں قوال سمجھ رہے ہیں؟''

میں خود خفت محسوس کر رہا تھا۔ ایسی جگہ پہلی بار آیا تھا۔

کلیم صاحب اس شرط پر آئے تھے کہ تین بجے صبح میں جی سی ڈیہہ میں پٹنہ کے لیے ٹرین ملتی ہے اس سے واپس لوٹنا ہے تا کہ کلاس نہیں چھوٹے۔ وہ چھٹی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

مشاعرہ ہوا۔ پورا گاؤں پنڈال میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسٹیج پر ہم لوگ اور دوسرے بااثر لوگ تھے۔ آہ واہ پنڈال کی طرف سے نہیں کے برابر ہوئی۔ نو سے بارہ بجے تک ہم شعرا مصروف رہ کر فارغ ہوئے۔ کھانا کھانے کے دوران پتہ چلا کہ مقامی کالج کے لکچرر مشاعرہ کمیٹی کے ٹریزرر ہیں اور وہ کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ کسی نے کہا اپنے گھر میں جا کر چھپ گئے ہیں۔ میں دو چار مقامی لوگوں کو لے کر ان کے گھر گیا۔ دروازہ پیٹتا رہا لیکن وہ نہیں نکلے۔ کار کی چابی بھی ان ہی کے پاس تھی۔ میں اُن دنوں گاؤں کا دہقانی نوجوان تھا۔ غصے میں سبھی کو بہت کچھ بول گیا۔ آخر ڈاکٹر سہیل نے اپنی طرف سے سب کو روپے دیے اور بی ڈی او نے بلاک کی جیپ سے ہمیں جے سی ڈیہہ اسٹیشن پہنچوایا۔ بگٹٹ کا ایک مصرعہ مجھے آج تک یاد ہے: بھری برسات میں گڈا کا سفر باپ رے باپ۔

یہ کلیم عاجز صاحب کی شرافت، وضع داری اور نیک نفسی تھی کہ روز کی ملاقات میں کبھی انھوں نے اس بدمزگی بھرے مشاعرے کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ان کے ذہن میں خلش ضرور رہ گئی تھی جس کا اظہار آخر انھوں نے کر دیا۔ 1985 میں بھاگلپور کے ڈی ایم کے ذریعے آل انڈیا مشاعرہ ہونا تھا۔ شاعروں کو بلانے کی ذمے داری مجھے دی گئی۔ میں ان دنوں مارواڑی کالج میں لکچرر تھا۔ دہلی اور پٹنہ کے شاعروں سے رابطہ کرنے کے لیے میں خود گیا تھا۔ کلیم عاجز صاحب سے رجوع کیا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ قوال بننے کے لیے میں آپ کے پروگرام میں نہیں جا سکتا—اور میں چونک کر رہ گیا تھا۔

کلیم عاجز مشاعرہ کے پسندیدہ شاعر تھے۔ امریکہ، کناڈا، برطانیہ، پاکستان، سعودی عرب ہر جگہ وہ بحیثیت شاعر گئے اور اپنی یادیں چھوڑ آئے۔ انھیں حکومت ہند سے پدم شری ایوارڈ، محکمہ راج بھاشا حکومت بہار، غالب اکادمی، دہلی، میر اکادمی لکھنؤ اور بہت سارے اداروں سے انعام ملے۔ 2008 سے اردو مشاورتی کمیٹی، بہار کے صدر نشین تھے اور انھیں وزیر کابینہ کی سہولتیں دی گئی تھیں۔

کلیم عاجز کے بہت سے اشعار میں گنگناتا رہتا ہوں:

بات گرچہ بے سلیقہ ہو کلیم
بات کرنے کا سلیقہ چاہیے

اپنا یہ کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست یا دشمن کا گھر ملے

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اس انجمن میں ہم بھی عجیب وضع دار ہیں
دل ہے لہولہان جبیں پر شکن نہیں

یہ سلیقہ شخصیت میں ہے بہت مشکل کلیم
دل فقیرانہ رہے اور بات شاہانہ کہے

کلیم عاجز کی اہلیہ کا انتقال 22 جولائی 2002 کو ہوا۔ ایک ہفتہ بعد میرا پٹنہ جانا ہوا تو میں ان سے ملنے گیا۔ بہت کمزور اور ٹوٹے بکھرے لگے۔ تقریباً پینتالیس منٹ بیٹھا لیکن کوئی اہم بات نہیں ہوئی۔ بس اتنا کہا کہ کبھی کبھی آتے رہیے۔

بعد میں جب بھی ملاقات ہوئی ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی، جس کی گہرائی تک پہنچنا میرے بس میں نہیں تھا! ■

Manazir Ashiq Harganvi, 'Kohsaar', Bhikanpur-3, Bhagalpur - 812001 (Bihar)

کلیم عاجز مشاعرہ کے پسندیدہ شاعر تھے۔ امریکہ، کناڈا، برطانیہ، پاکستان، سعودی عرب ہر جگہ وہ بحیثیت شاعر گئے اور اپنی یادیں چھوڑ آئے۔ انھیں حکومت ہند سے پدم شری ایوارڈ، محکمہ راج بھاشا حکومت بہار، غالب اکادمی، دہلی، میر اکادمی لکھنؤ اور بہت سارے اداروں سے انعام ملے۔ 2008 سے اردو مشاورتی کمیٹی، بہار کے صدر نشین تھے اور انھیں وزیر کابینہ کی سہولتیں دی گئی تھیں۔

کلیم عاجز کی شاعرانہ تفہیم

اسلم جاوداں

کلیم عاجز کا نام دورِ حاضر کے کلاسیکی غزل گوشعرا میں ایک مقتدر، مستند و مقبول نام ہے۔ وہ گذشتہ سات دہائیوں سے غزل کے کاکل وگیسو کو سنوارتے رہے، اسے حسن، معنویت اور وسعت سے ہمکنار کرتے رہے۔ بظاہر ان کی غزلوں میں یک رُخاپن نظر آیا لیکن انھوں نے غزل کو گل وبلبل، کاکل ورخسار، ساغر ومینا کے کلاسیکی استعارے میں رکھتے ہوئے اسے حیات وکائنات کی وسعتوں میں پھیلا دیا۔ ان کی غزلوں میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں باہم اس طرح شیر وشکر اور پیوستہ ہیں کہ ان کی تفریق مشکل ہے۔ ان کی غزلوں کے عمیق مطالعے سے غزل کی ایک نئی تفہیم اور نئی بوطیقا سامنے آتی ہے۔

کلیم عاجز کی غزلوں کی حقیقی تفہیم کے لیے ان کی زندگی اور شاعرانہ پس منظر پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے۔ کلیم عاجز کا گھرانہ مذہبی اور ادبی تھا۔ وہاں مذہبی اور کلاسیکی اردو کتابوں کا ذخیرہ بھی تھا۔ وہ بہت کم عمری میں لگ بھگ سبھی مشہور زمانہ ناول، قصے اور داستان مثلاً قصص الانبیائؑ، مرأۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، ابن الوقت، قصہ حاتم طائی، آرائش محفل، باغ و بہار، طلسم ہوش ربا (3 جلدیں)، بہار کا مشہور ناول فسانۂ خورشیدی اور عبدالحلیم شرر کے سبھی ناول پڑھ یا سن چکے تھے۔ اس زمانے کے مشہور رسائل، عالمگیر، نیرنگِ خیال، ہمایوں، ساقی، ادبی دنیا، کلیم اور رومان ان کے مطالعے میں رہے۔ ان کے علاوہ کلیم عاجز نے لکھنؤ اسکول کے تمام مشہور شعرا مثلاً مصحفی، انشا، ناسخ، رند، صبا، وزیر، داغ اور امیر کے دواوین پڑھ ڈالے تھے۔ گویا دس سال سے تیرہ سال کی عمر تک کلیم عاجز مسلسل مطالعے میں غرق رہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں خود لکھا ہے:

”1934 سے 1937 تک مسلسل تین سال دس سے تیرہ سال کی عمر تک صبح اٹھنے سے رات کے گیارہ بجے تک مستقل چھپ چھپ کر میں مطالعے میں مشغول رہتا۔“ (وہ جو شاعری کا سبب ہوا.... ،ص 52)

کلیم عاجز کی شاعری کا بڑا محرک اور ان کی غزل گوئی کا سبب ملک کی آزادی سے قبل 1946 کا وہ المناک اور اندوہناک واقعہ ہے جس میں مذہب وملت کے نام پر سارے ہندستان میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ 3 نومبر 1946 کو فرقہ وارانہ فساد کی آگ کلیم عاجز کی بستی تیلہاڑا بھی پہنچی، جس نے ٹھیک بقرعید کے دن اس ہنستی کھیلتی بستی کو تقریباً 800 مسلمانوں کے ساتھ جلا کر بھسم کر ڈالا۔ ان شہید ہونے والوں میں کلیم عاجز کی عزیز از جان والدہ امت الفاطمہ اور چھوٹی بہن رشیدہ خاتون بھی شامل تھیں۔ ان کے علاوہ دس پندرہ نزدیکی رشتہ دار بھی شہید کردیے گئے، جن کی آواز، جن کا انداز، جن کی محبتیں، جن کی قربتیں کلیم عاجز کی نظروں میں زندگی بھر گردش کرتی رہیں اور تاعمر ان کے سینے میں غم کی آگ بھڑکتی ہی رہی۔

وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سناؤں ہوں اس لیے کہ زمانہ مجھ کو بھلا نہ دے

کلیم عاجز کے جگر کی سوزش اور دل کی غمگینی نے شاعری کا روپ اختیار کرلیا۔ عام طور سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس واقعۂ جانکاہ نے کلیم عاجز کو شاعر بنادیا۔ لیکن بقول عاجز حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کلیم عاجز نے ہی اس واقعہ کو شاعری بنا ڈالا۔ اگر اس واقعہ نے انھیں شاعر بنایا ہوتا تو اور بھی لوگ اس واقعہ سے متاثر ہوئے تھے، آخر وہ شاعر کیوں نہیں ہوگئے۔ اس پس منظر میں کلیم عاجز کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

مختصر سی ہے روداد صبحِ میخانہ
زمیں پہ ڈھیر تھا ٹوٹے ہوئے پیالوں کا
ایک سویرا ایسا آیا اپنے ہوئے پرائے
اس کے آگے کیا پوچھو ہو کچھ بھی کہا نہ جائے
یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی
مرے آشیاں سے دھواں اٹھا تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی

کلیم عاجز کے ان ابتدائی اشعار کا تیور، حسن، سلیقہ، لہجے کی معصومیت، الفاظ کی سادگی اور بیان کی اثرانگیزی سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ اعلیٰ پایے کی کلاسیکی شاعری ہے، جو اپنی تمام سج دھج کے ساتھ آستانۂ غزل پر جلوہ فگن ہورہی ہے۔

کلیم عاجز کی غزلوں کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ اس میں یک رخاپن ہے۔ ان کی غزلوں میں تیلہاڑا کے خونی واقعے کی تکرار اور بازگشت ہے مگر یہ خیال باطل اور سرسری مطالعے کا حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں آزادی کے بعد کے ہندستان کی پوری تاریخ اور تصویر ہے۔ ان کی غزلوں میں سیاسی، عصری اور ملی شعور اتنا واضح اور بالیدہ ہے کہ اگر کوئی بالغ النظر چاہے تو ان کی غزلوں کی مدد سے ان کے عہد کے ہندستان کی تاریخ مرتب کرسکتا ہے۔ نیز یہ ملی،

سیاسی اور عصری شعور ان کی غزلوں میں اس کمالِ فن کے ساتھ اجاگر ہوئے ہیں کہ ان میں لطفِ غزل اور حسنِ غزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان باتوں کے بیان میں انھوں نے کبھی بھی غزل کی فنی نزاکتوں اور تقاضوں کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ اس لیے تغزل کا دامن بھی ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا۔ یہ کمالِ شاعری ہے، اس لیے ان کا دعویٰ بھی بالکل صحیح ہے: ع

'تجھے بھی ہم اے غم زمانہ، غزل کے سانچے میں ڈھال لیں گے'

ان ہی خوبیوں کے سبب کلیم الدین احمد جیسا غزل مخالف اور سخت گیر نقاد بھی کلیم عاجز کی غزلوں کے سلسلے میں رطب اللسان نظر آتا ہے:

''ان (کلیم عاجز) کے شعروں میں ایک مخصوص سادگی ہے۔ ان کے الفاظ جانے پہچانے، ان کی ترکیبیں ایسی سیدھی سادی ہوتی ہیں کہ مفہوم فوراً ذہن نشیں ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ان کے اشعار سطحی ہوتے ہیں بلکہ الفاظ اور ترکیبوں اور معانی کے درمیان کوئی پردہ نہیں، بلکہ یوں کہیے کہ ان کے الفاظ ایسے شفاف ہیں کہ معانی کو ایک نگاہِ غلط انداز بھی پا لیتی ہے۔ اکثر ان کے شعروں میں لفظوں کا ایک تو سطحی مفہوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ دونوں بیک وقت سمجھ میں آجاتے ہیں ...... ان کے شعروں میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی اور دونوں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔''

دوسری جگہ کلیم الدین احمد یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کلیم عاجز کی غزلوں میں زلف و رخ کے پردے میں سیاسی اور تاریخی حقائق ہیں، جو تغزل کے پیرایے میں ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ان کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی اور سیاسی باتیں غزل کی زبان میں ہیں۔ ان کے شعروں میں 'پھول' ہیں اور 'پتھر' بھی۔ اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول بن جاتے ہیں۔''

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا.... ص29)

ایمرجنسی کے بعد 1977 کے عام انتخابات میں کانگریس کی زبردست ہزیمت ہوئی اور جنتا پارٹی برسراقتدار آئی۔ کلیم عاجز اس وقت شاعرانہ محبوب کے پردے میں کانگریس کی سربراہ اندرا گاندھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زخموں کے نئے پھول کھلانے کے لیے آ
پھر موسمِ گل یاد دلانے کے لیے آ
کچھ روز سے ہم شہر میں رسوا نہ ہوئے ہیں
آ، پھر کوئی الزام لگانے کے لیے آ

اور پھر جب 1980 میں کانگریس زبردست اکثریت کے ساتھ دوبارہ برسراقتدار آتی ہے تو دیدہ ور شاعر ان الفاظ میں ہندستان کی تاریخ رقم کرتا ہے:

پھر آ رہے ہیں وہ فضا گرمائی جائے گی
پھر زلف کھولی جائے گی، لہرائی جائے گی

اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں جب میرٹھ، ملیانہ، ہاشم پورہ، مرادآباد، ٹاٹا اور رانچی وغیرہ میں فرقہ وارانہ فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہوا تو حساس شاعر یوں تاریخ قلمبند کرتا ہے:

اس ناز اس انداز سے تم ہائے چلو ہو
روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو
رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

کلیم عاجز کی شاعری کو صرف ان کے دردِ دل کا ترجمان سمجھنا سطحی اور سرسری نگاہوں کا فریبِ محض ہے۔ ان کی

کلیم عاجز کی شاعری کے اختصاص و انفرادیت پر جب ہم تجزیاتی نظر ڈالتے ہیں تو ان کی شاعری دو پہلوؤں سے انہیں میر سے منفرد کرکے بہتر اور برتر بناتی ہے۔ حالانکہ روایت و عقیدت میں بندھے اہالیان شعر و ادب کی جبیں پر اس سے شکن پڑ جائے گی، مگر مجھے تو سچائی کا اظہار کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ میر کی برتری اور بہتری اپنی جگہ صدفی صد مسلم ہے اور اس کی نفی کرکے میں خود کو بے بہروں میں شامل نہیں کر سکتا۔ جبکہ غالب، ذوق، ناسخ جیسے شعراء نے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے تو میں کس شمار و قطار میں ہوں۔ لیکن کلیم عاجز کا جو اختصاص اور ان کی جو انفرادیت ہے، اس سے اغماض، شعری انصاف کے منافی ہے، جو میرے لیے ممکن نہیں۔

شاعری عصری، سیاسی اور ملی شعور سے عبارت، حسنِ کلام کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ان کی غزل گوئی میں دل کے پھپھولے ہی نہیں پھوڑے گئے ہیں بلکہ وہ اپنے عہد کی زندہ و پائندہ مرقع کشی اور ایک مکمل صحیفۂ حیات بھی ہے، جس میں فکر کی پیش کش، فنی حسن، اپنے معراج پر ہیں۔

کلیم عاجز کی شاعری کی ساحری ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے متعدد اشعار ضرب المثل بن گئے جو زبانِ زد خاص و عام ہیں:

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

بات چاہیے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

فضائے چرخ پہ اڑنا کوئی بڑائی نہیں
کسی کے دل میں اُترنا کمال ہے پیارے

خدا درد والوں کو آباد رکھے
کہ جاگے ہوئے ہیں جگائے ہوئے ہیں

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دبستانِ عظیم آباد کے کلیم عاجز جنھوں نے اردو غزل کی شوکت و عظمت کا پرچم ملک ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک میں بھی لہرایا اور قومی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر اپنی ایک شناخت اور عزت حاصل کی، ایسے شاعر کا اردو شاعری میں مقام و مرتبہ کیا ہے؟

کلیم عاجز کو عام طور سے میر ثانی، دورِ حاضر کا میر یا پھر میر کا پیرو سمجھا جاتا ہے۔ یہ تمام دعوے اور نظریے، نامناسب اور مبہم ہیں۔ ان سے کلیم عاجز کی اپنی کوئی شناخت نہیں بنتی ہے۔ اس طرح ان کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا ہے۔

میر کے لب و لہجے میں غزل گوئی کرنے والے کلیم عاجز کی شاعری کے اختصاص و انفرادیت پر جب ہم تجزیاتی نظر ڈالتے ہیں تو ان کی شاعری دو پہلوؤں سے انھیں میر سے منفرد کرکے بہتر اور برتر بناتی ہے۔ حالانکہ روایت و عقیدت میں بندھے اہالیانِ شعر و ادب کی جبیں پر اس سے شکن پڑ جائے گی مگر مجھے تو سچائی کا اظہار کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ میر کی برتری اور بہتری اپنی جگہ صد فی صد مسلم ہے اور اس کی نفی کرکے میں خود کو بے بہروں میں شامل نہیں کر سکتا۔ جبکہ غالب، ذوق، ناسخ جیسے شعراء نے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے تو میں کس شمار و قطار میں ہوں۔ لیکن کلیم عاجز کا جو اختصاص اور ان کی جو انفرادیت ہے، اس سے اغماض، شعری انصاف کے منافی ہے، جو میرے لیے ممکن نہیں۔

میرا نقطۂ نظر بالکل واضح اور صاف ہے کہ میر بڑے شاعر ہیں لیکن دو نمایاں اوصاف اور اختصاص کے سبب کلیم عاجز خدائے سخن میر سے برتر ہیں۔ اس کا اعتراف دنیائے شعر و سخن کو خندہ جبینی سے کرنا چاہیے۔

اولاً یہ کہ کلیم عاجز اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عام بول چال کی زبان اور گفتگو کے لہجے کو اپنی غزلوں میں اس توازن اور فنی چابک دستی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ ادبیت اور لطافت کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ ان کی سادگی اور سہل زبانی ایسی ہے کہ ان کے اکثر اشعار سہلِ ممتنع کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعۂ غزل ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا....'' نے اپنی بے مثل شاعری کے سبب

عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اس پورے مجموعے میں جو بھی الفاظ آئے ہیں، وہ سب کے سب بالکل عام فہم اور سہل (صرف دو الفاظ: احتیاج بمعنی ضرورت اور دار و رسن بمعنی پھانسی کا پھندا، کو چھوڑ کر) ہیں۔ ان کی شاعری اتنی عظیم الشان ہے کہ کلیم الدین احمد جیسے غزل شکن نے بھی اسے سراہا اور فراق جیسے عظیم شاعر نے بھی اس پر رشک کا اظہار کیا۔ نہایت سادہ اور عام مروجہ بول چال کے الفاظ کے استعمال سے وجود میں آئی اس شاعری کو کلیم عاجز کی سادہ بیانی اور سہل زبانی کے کمال سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

سہل گو اور سادہ زبان شاعر میر کے یہاں بھی ایسے نمونے عام ہیں۔ لیکن ان کے یہاں کہیں کہیں پایۂ اعتدال میں لغزش آگئی اور ذرا سی بے احتیاطی سے سادگی، عامیانہ پن اور سطحیت میں بدل گئی ہے۔ مثلاً :

چوٹٹے دل کے ہیں بتاں مشہور
بس یہی اعتبار رکھتے ہیں

خوف ہم کو نہیں جنوں سے کچھ
یوں تو مجنوں کے بھی چچا ہیں ہم

یہی نہیں بلکہ میر کی شاعری میں ابتذال اور کراہیت بھی ملتی ہے:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

لیکن تاجدارِ غزل کلیم عاجز سہل گوئی اور سادہ زبانی کی منزل سے سرخرو اور سربلند گزرے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک بھی شعر ایسا نہیں ملے گا، جس پر عامیانہ پن اور سطحیت کا الزام لگایا جا سکے۔ مبتذل اور سوقیانہ اشعار کا تو کلیم عاجز کے کلام میں گذر ہی نہیں ہے۔ یہ فکری و فنی عظمت و طہارت کلیم عاجز کو میر کی شاعری سے ممتاز و برتر کرتی ہے۔

میری نظر میں کلیم عاجز کی غزلوں کی میر کی غزلوں پر فوقیت کا دوسرا سبب دونوں کے لہجے میں پنہاں 'مجموعی تاثر' ہے۔ یہ شاعری کا بہت اہم اور بنیادی نکتہ ہے جس کی بنیاد پر شاعری کی معنویت اور وقعت کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

میر اور کلیم عاجز کی غزلوں کا لب و لہجہ ایک خاص مطالعے کا موضوع ہے۔ لب و لہجہ انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، انسان کے لب و لہجے پر اس کی شخصیت اثر انداز ہوتی ہے۔ سودا کے لہجے میں جو بلند آہنگی اور میر کے لہجے میں جو شکستگی ہے، وہ دراصل دونوں کی متضاد شخصیت ہی کی دین ہے۔ میر کی زندگی برباد اور شکستہ تھی، اس لیے ان کے لہجے میں بھی شکستگی ہے۔ سودا مست حال اور بلند مزاج تھے، لہٰذا ان کے لہجے میں بلند آہنگی اور تندی ہے۔ کلیم عاجز کے لہجے میں جیسی اپنائیت، معصومیت، نرمی اور مظلومیت ہے، وہ دراصل ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ کلیم عاجز کی زندگی بھی میر کی طرح شکستہ ہے، اس لیے ان کے لہجے میں بھی شکستگی اور مظلومیت ہے۔ یہ دونوں ہم حال ہیں، اس لیے ہم زبان اور ہم لہجہ بھی ہیں:

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
(میر)

سازِ دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی
ہلکی ہلکی سی صدا آتی رہی
(عاجز)

میر کے لہجے میں شکستگی کے ساتھ یاسیت، قنوطیت، احساسِ محرومی اور غم بیزاری نمایاں ہیں، جبکہ کلیم عاجز کے لب و لہجے میں شکستگی تو ضرور ہے مگر اس میں قنوطیت اور یاسیت نہیں ہے بلکہ رجائیت اور ایک قسم کی شگفتگی ہے۔ وہ غموں سے بیزار نہیں بلکہ لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی میر اور عاجز کی شخصیت کارفرما ہے۔ میر علاحدگی پسند اور جلوت بیزار ہیں اس لیے وہ یہاں بھی بیزار نظر آتے ہیں اور اس سے نجات چاہتے ہیں جبکہ کلیم عاجز زندگی سے فرار پسند نہیں کرتے، وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلنا پسند کرتے ہیں۔ یہی ان کی شخصی برتری ہے، جو شاعرانہ برتری کا سبب بن گئی۔

دونوں اشعار کی قرأت سے بظاہر میر اور عاجز دونوں کے لہجے میں یکسانیت نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے لہجے میں پنہاں 'مجموعی تاثر' جو ہمارے ذہن و دل پر مرتب ہوتا ہے، ان میں بین فرق ہے۔

میر کے لہجے میں شکستگی کے ساتھ یاسیت، قنوطیت، احساسِ محرومی اور غم بیزاری نمایاں ہیں، جبکہ کلیم عاجز کے لب و لہجے میں شکستگی تو ضرور ہے مگر اس میں قنوطیت اور یاسیت نہیں ہے بلکہ رجائیت اور ایک قسم کی شگفتگی ہے۔ وہ غموں سے بیزار نہیں بلکہ لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی میر اور عاجز کی شخصیت کارفرما ہے۔ میر علاحدگی پسند اور جلوت بیزار ہیں اس لیے وہ یہاں بھی بیزار نظر آتے ہیں اور اس سے نجات چاہتے ہیں جبکہ کلیم عاجز زندگی سے فرار پسند نہیں کرتے، وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلنا پسند کرتے ہیں۔ یہی ان کی شخصی برتری ہے، جو شاعرانہ برتری کا سبب بن گئی۔

میر اور عاجز دونوں کے اشعار پر غور کیجیے۔ غموں نے میر کے دل کی عمارت ڈھادی ہے یعنی میر نے غموں سے شکست تسلیم کر لی ہے۔ انھوں نے حالات کے آگے سپر ڈال دیا ہے۔ اس کے برعکس کلیم عاجز کے یہاں سازِ دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی ہلکی ہلکی سی صدا آ رہی ہے، یعنی انھوں نے غموں سے شکست تسلیم نہیں کی ہے بلکہ وہ غموں سے نبرد آزما ہیں اور اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہ حوصلہ، یہ جگر میر کو حاصل نہیں ہو سکا۔ یہ سعادت کلیم عاجز کے حصے میں آئی۔ میر کے سپر ڈالنے کی انتہا ملاحظہ ہو:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

کلیم عاجز کی غموں سے لطف اندوزی کا انداز دیکھیے:

بجھنے کا خیال آتا ہی نہیں، روشن جو ہوئے اِک شام سے ہم
تکلیف سلگنے تک ہی تھی، جلتے ہیں بڑے آرام سے ہم

چھری پر چھری کھائے جائے ہے کب سے
اور اب تک جیے ہے، قیامت کرے ہے

سنا ہے خاک بھی ہم ہو کے لاجواب ہوئے
اگر یہ سچ ہے تو اچھا ہوا، خراب ہوئے

جلنے کا کام دل کو سکھایا اسی لیے
یہ کام آگیا تو بڑا کام آگیا

آزمانا ہو تو آ، بازو و دل کی قوت
تو بھی شمشیر اٹھا، ہم بھی غزل کہتے ہیں

محبت زخم کھاتے رہنے کا ہی نام ہے پیارے
لگائے تیر جو دل پر، اسی سے دل لگا رکھیو

غرض میر اور عاجز کی غزلوں کے لہجے میں پنہاں 'مجموعی تاثر' دونوں کی غزلوں کی وقعت اور اہمیت کا تعین کرتا ہے۔ کلیم عاجز کی غزلوں کے لہجے کا مجموعی تاثر ہماری زندگی میں مایوسی، خود سپردگی اور غم بیزاری نہیں پیدا کرتا بلکہ جینے کا ایک نیا جوش اور حوصلہ دیتا ہے۔ اس سے ایک شکستہ انسان کو غموں سے نبرد آزما ہونے اور زندگی کی صعوبتوں کو خندہ جبینی سے برداشت کرنے کا ہنر اور سلیقہ ملتا ہے۔ یہ ایک عظیم شاعری کی شناخت ہے اور بڑی شاعری کا منصب بھی یہی ہے۔ لیکن میر کے یہاں اس کے علی الرغم صورتِ حال ملتی ہے۔ اس لیے ان دو پہلوؤں سے کلیم عاجز کی شاعری کی اہمیت اور اس کا مرتبہ میر سے سوا ہے:

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

■

Dr. Aslam jawedan, Darul Gheyas, Urdu Gali (Jamun Gali), Subzi Bagh, Patna-800004

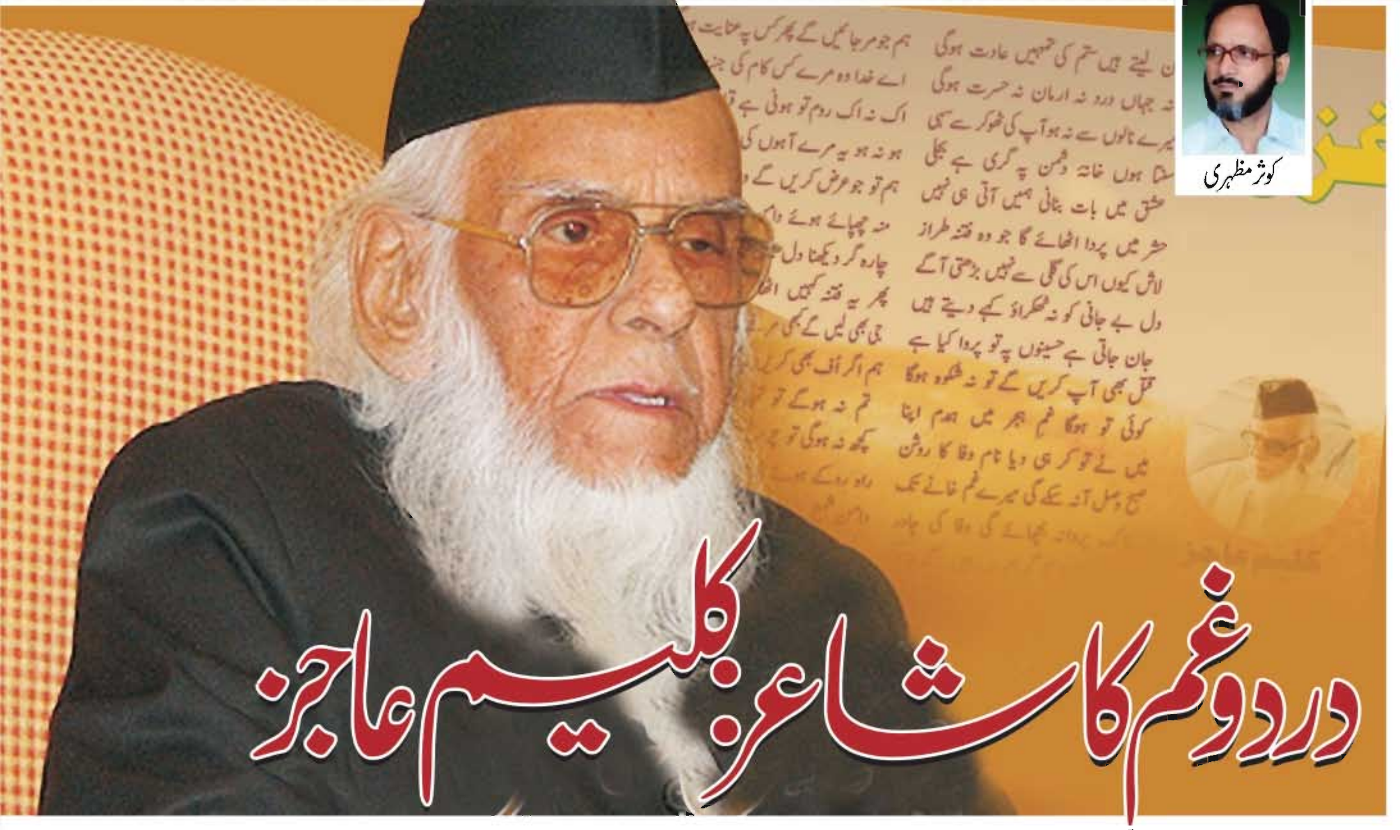

دردوغم کا شاعر کلیم عاجز

کوثر مظہری

کلیم عاجز کی شاعری ان کے کرب ناک ماضی کا اشاریہ ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے ماضی کا سرمایہ جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اور کچھ لوگ یاد ماضی کو عذاب کے مترادف بھی تصور کرتے ہیں۔ اختر انصاری کے بقول:

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

مگر کلیم عاجز نے ماضی کی یادوں کو، ماضی کی وحشت ناکیوں اور ستم ظریفیوں کو غزل کا لطیف پیکر عطا کر کے اردو شاعری کے لیے ایک قیمتی تحفہ بنا دیا ہے۔ ان کی رقت قلبی اور محزونِ فکر دیکھنی ہو یا ان کی بے بسی اور ناتوانی دیکھنی ہو تو یہ دو اشعار بطور نمونہ کے ملاحظہ کیجیے:

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے
دل تھام کے کروٹ پہ لیے جاؤں ہوں کروٹ
وہ آگ لگی ہے کہ بجھائے نہ بنے ہے

یہی وہ احساس ہے جو سوزش دل سے پیدا ہوتا ہے۔ کلیم عاجز سراپا سوز ہیں۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں سنگن کی کیفیت اور آواز میں، لہجے میں درد کا رقص نظر آتا ہے:

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے

مگر کلیم عاجز نے اس سوزش دل اور آتشِ جنوں کی لپک یا شعلے کو اپنے دامن میں سمیٹ کے رکھا جس کے سبب دوسروں کا دامن یا وجود مامون ومحفوظ رہا:

وہ تو کہیے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لیے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے

کلیم عاجز نے اس آگ سے دوستی کا رشتہ نبھایا ہے۔ یہ آگ دور سے چل کر نہیں آئی ہے۔ کلیم کی شاعری میں درد، چوٹ اور زخم جیسے تلازمات ان کے اپنے ہیں بلکہ ان کی ہی سرزمین وطن کی فصل ہے۔ اپنے مجموعہ کلام 'جب فصل بہاراں آئی تھی' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''یہ آگ اسی زمین کی، زخم یہیں کی تلوار کے، چوٹ یہیں کے پتھر کی۔ اس کا علاج یہیں ہے اس کا مرہم یہیں ہے۔'' اس آگ اس خاک وخوں کے ملبے میں زندگی ہے اس سے باہر موت ہے۔ یہ ملک سمندر ہے یہاں کودنا حیات جاوداں ہے۔'' (ص76-74)

کلیم کا پورا وجود زخمی ہے:

''چوٹ مسلسل آتی ہے، زخم پے در پے لگتے رہے۔ اس سوراخ کو تھاما تو اُدھر سے لہو نکلا، اُدھر دبایا تو ادھر سے خون کی دھار نکلی—''

اور پھر یہ شعر:

مجھ سے نہ پوچھ حال دل اب قابل بیاں نہیں
زخم کدھر کدھر نہیں درد کہاں کہاں نہیں

آپ نے غور کیا کہ کلیم عاجز کا وجود کتنا چھلنی ہے اور کس طرح اس زخمی وجود سے لہو بہہ رہا ہے۔

کلیم عاجز پر ایک زمانہ خاموشی کا بھی گزرا ہے۔ دراصل جابر زمانے نے اُن کے قصر احساس کو چور چور کر دیا ہے اور وہ ہمیشہ اسی قصر کے خشت ہائے شکستہ کو مجتمع کرنے میں لگے رہے۔ ان کی شاعری میں کسی مابعدالطبیعیاتی یا ماورائے شعور انسانی یا کسی طلسمی یا ہوش ربائی کتھا سنسار کا خمیر نہیں بلکہ ایک سلگتی روح، ایک آتش خاموش، ایک وجدانی کرب ونشاط کی کشید ہے۔ ان کی شاعری جو ادب کے قارئین کو بھی نامعلوم طور پر اپنے حصار میں لے لیتی ہے، جہاں لوری اور نغمے کی کیفیت اور ایک دکھی انسان کا عمل تنفس جاری وساری ہے۔ مگر یہ دکھی انسان ڈھیٹ اور ضدی بھی ہے:

ترے ابرو پہ مگر بل نہیں آیا عاجز
دل کچل بھی گیا ٹوٹا بھی جلا بھی تیرا
بڑی ٹوٹیں دل پہ مصیبتیں بہت آئی دل پہ بلائے دل
مگر اب تک اپنی زبان سے کبھی یہ نہ نکلا کہ ہائے دل

کلیم کا کمال یہ ہے کہ وہ چاکِ دل کی بخیہ گری غزل سے کرتے ہیں۔ یہ ہمت مردانہ اور وضع داری اور غم گساری کا سلیقہ کلیم کے حصے میں آیا ہے:

غزل سے چاک دل کی بخیہ کاری کون جانے ہے
جو ہم جانے ہیں ایسی وضع داری کون جانے ہے

اس وضع داری اور سلوک انسانی کو فراق بخوبی سمجھتے تھے۔ انھوں نے کلیم عاجز کے پہلے مجموعہ کلام 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' پر اظہار خیال کرتے شاید اسی لیے کہا تھا کہ ٹھیٹ آدمیت یا آدمیت کے ٹھیٹ پن کی بلاغت کلیم عاجز کے شاعرانہ کردار میں نغمہ بن کر جھلک جایا کرتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں کلیم عاجز کی شاعری پر کچھ بھی کہتے ہوئے اپنے آنسو مشکل سے روک پاتا ہوں۔ اگر اس پس منظر میں خود فراق کی شاعری دیکھیں تو وہی لہک وہی غم اور نشاط کا ملا جلا رنگ یہاں بھی نظر آتا ہے، بقول فراق:

غزلیں کب کہتا ہوں یارو میں غم کو لوریاں دیتا ہوں
کچھ رات گئے سو جاتا ہوں جب غم کو نیند آجاتی ہے

مگر صاحب، کلیم کہاں سوتے ہیں۔ ان کا غم بھی جاگتا رہتا ہے اور ان کے وجود میں غم کی لہریں پیہم متموج رہتی ہیں بلکہ ان کا غم ان کے خون میں حلول کر جاتا ہے:

اک درد ہے جو شام سے اُٹھے ہے سحر تک
اک سوز ہے جو صبح سے تا شام رہے ہے

یہی سوز پیہم اور کرب مسلسل کلیم عاجز کے لیے گنج گرانمایہ ہے۔ ان کی شاعری میں پیش ہونے والا غم اور دکھ درد صرف ان کا نہیں، بلکہ انھوں نے زمانے کے دکھ درد کو بھی سمیٹ لیا ہے۔ دوسروں کو سسک سسک کر کے سارے غم کو اپنے دامن میں بھر لیا ہے:

اوروں کا دکھ درد اپنا کر نکلے ٹھوکر کھانے ہم
سب سے دیوانہ تھا مجنوں اس سے بھی دیوانے ہم

کلیم عاجز کی شاعری میں وہی زلف وگیسو اور وہی محبوب، وہی حسن اور وہی عشوہ و ناز و ادا کا ذکر ملتا ہے۔ یہ سچ ہے، مگر یہ تمام عوامل شعری علائم کا روپ اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام کے مقدمہ سے بھی یہ بات واضح ہے اور پھر نئے مجموعہ کلام 'جب فصل بہاراں آئی تھی' میں انھوں نے اپنی شاعری کے تین ادوار بتائے ہیں، ان سے بھی ان کی شاعری کی توجیہات سمجھ میں آجاتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے "(1) زخم خوردہ ہونے کا دور (2) زخم دینے والوں کی پہچان (3) جس میں زخم دینے والے ایک شخصیت میں سمٹ آتے ہیں اور پھر مستقلاً وہی شخصیت تنہا میری غزلوں کا محبوب بن جاتی ہے۔ اس شخصیت میں علامات کی پوری دنیا سما گئی ہے۔"

(جب فصل بہاراں آئی تھی، ص81)

اب شاید التباس کی کوئی صورت نہیں رہ گئی۔ وہی شخصیت ہے جو محبوب ہے، معشوق ہے، سراپا ناز ہے۔ زخم خوردگی اور زخم دہندوں کی شناخت کے بعد کلیم کو ان سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ ان کے دامن کو خار سے بچانے کی خاطر خود بڑھ کر کانٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیتے ہیں۔ یہی تو ہے وضع داری، یہی تو ہے بانکپن، یہی تو ہے خوش سلیقگی:

بڑھ کے خود کانٹوں پہ رکھ دیں ہم نے اپنی انگلیاں
اُس سراپا ناز کا دامن بچانے کے لیے

جب میر کہتے ہیں

دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

تو فوراً اس کے پس منظر میں دلی کی تباہی اور اس کے اجڑنے کا نقشہ ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ کلیم کے اشعار سے ان کے تناظر کو سمجھا نہ جاسکے:

آنسوؤں کی مے بنی زخموں کا پیمانہ بنا
سیکڑوں میخانے اجڑے ایک میخانہ بنا

کلیم عاجز کی شاعری میں وہی زلف و گیسو اور وہی محبوب، وہی حسن اور وہی عشوہ و ناز و ادا کا ذکر ملتا ہے۔ یہ سچ ہے، مگر یہ تمام عوامل شعری علائم کا روپ اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام کے مقدمہ سے بھی یہ بات واضح ہے اور پھر نئے مجموعہ کلام 'جب فصل بہاراں آئی تھی' میں انھوں نے اپنی شاعری کے تین ادوار بتائے ہیں، ان سے بھی ان کی شاعری کی توجیہات سمجھ میں آجاتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے "(1) زخم خوردہ ہونے کا دور (2) زخم دینے والوں کی پہچان (3) جس میں زخم دینے والے ایک شخصیت میں سمٹ آتے ہیں اور پھر مستقلاً وہی شخصیت تنہا میری غزلوں کا محبوب بن جاتی ہے۔ اس شخصیت میں علامات کی پوری دنیا سما گئی ہے۔"

مری بیتاب آنکھیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں گلشن میں
صبا تو نے کہاں لے جا کے خاک آشیاں رکھ دی

وہی کلیم سنانے غزل کے پردے میں
حکایتِ ستم صبح و شام آیا ہے

ان کی شاعری میں جتنے بھی اشارے اور کنایے ہیں سب کا مرجع اور تناظر وہی یعنی تلہاڑہ اور اس کے فسادات ہیں۔ اسی تناظر نے کلیم عاجز کو 'درد' کی دولت سے نوازا ہے۔ بقول کلیم عاجز:

"درد بیداری کی علامت ہے، سکون خواب ہے، درد تیز بینی کا ثبوت ہے، بلند آگہی کا ثبوت ہے۔ درد ہی سے وہ روشنی پیدا ہوتی ہے جو پس پردہ کو پیش پردہ کر دیتی ہے۔ درد ہی سے گفتار میں سلیقہ، باتوں میں حلاوت اور اشعار میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔"

(جب فصلِ بہاراں آئی تھی، ص47)

جبھی تو وہ کہتے ہیں:

سلگنا اور شے ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا
جو ہم سے ہو رہا ہے کام پروانے سے کیا ہوگا

درد کو وہ شاعری کے لیے اہم تصور کرتے ہیں۔ اسی درد نے ان کے اندر وضع داری، رقت اور روحانی توانائی پیدا کی ہے۔ ان کا فلسفہ حیات عقل و عشق کی جگہ عقل اور درد کا ہے۔ درد کے قمقموں سے وہ ظلمت کدۂ دل میں چراغاں کرتے ہیں۔ عقل سے وہ بیزار نہیں ہوتے مگر 'درد' کی معیت میں چل کر ان کی منزل آسان ہوجاتی ہے:

کس مشکل سے چل کر عاجز اس منزل تک پہنچے ہیں
عقل کا دامن چھوٹ گیا تو درد کا دامن تھام لیا

اس طرح ہم کلیم عاجز کی غزلوں میں محبوب اور اس کے انسلاکات و تلازمات کو دیکھتے ہیں تو ان کی تفہیم میں کبھی کبھی التباس پیدا ہوتا ہے۔ مگر جب ان کی شاعری میں پیش ہونے والی شخصیت (جو متفرق روپ دھارتی ہے) کو پہچان لیا گیا ہے تو فریب خوردگی کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ وہ کبھی کبھی اپنے قاتل سے بڑی جرأت مندانہ گفتگو کرتے ہیں:

دن ایک ستم ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

مخاطب سراسر اقدار وقت ہے۔ کلیم عاجز کا خاندان لٹ گیا۔ یادوں اور آہوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ اس تناظر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کئی زاویوں سے مماثلت کے باوجود میر اور کلیم ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ بین فرق تو یہی ہے کہ میر نے جگ بیتی کو آپ بیتی بنایا تھا جبکہ کلیم عاجز نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنایا ہے اور شاید اپنے احساس کو اس طرح پیش کرنا کہ دوسرے بھی سمجھنے لگیں کہ ان کے احساسات بھی شاعر کے احساس سے ملتے جلتے ہیں۔ بڑی بات ہے۔ آخر میں دو چند اشعار پڑھیے اور مجھے اجازت دیجیے:

سینے کی جلن جائے نہ آنکھوں کی نمی جائے
یہ فصل بہاراں ہے تو گلشن سے چلی جائے

اس طرح مرے ساتھ ملی ہے مری غزل
ہر شعر زندگی کا سفر نامہ ہوگیا

بہت ہو سرخیِ دامن پہ نازاں
یہ کس کا ہے لہو، پہچانتے ہو؟

■

Prof. Kausar Mazhari., Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia , New Delhi-110025

حسن مثنیٰ

کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے

کلیم عاجز اردو کے شاید تنہا شاعر ہیں جنھیں ہم میر ثانی اور ہم زبان میر کے نام سے بھی جانتے ہیں۔وہ میر ثانی کب اور کیسے بنے یہ بھی ہمارے لیے ایک لمحۂ فکر یہ ہے کہ میر کے بعد کوئی ان کی جگہ نہ لے سکا، کچھ کچھ پیروی تو ضرور ہوئی جس میں کلام کلیم کا بھی اپنا حصہ ہے۔کلیم عاجز کی ابتدائی شاعری سے لے کر ان کی زندگی کے آخری لحاتِ شاعری کا مطالعہ کریں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس میں ایسا سوز و گداز ہے جو ہماری شاعری کی عاشقانہ روایت سے کوسوں دور ہے لیکن اس میں غور و فکر اور ادراک و احساس کے سبھی عنصر پائے جاتے ہیں۔ ایسا کیوں کر ممکن ہو سکا اس کی بنیادی وجہ ان کے شعری سرچشمے میں ہی تلاش کی جانی چاہیے۔ یہ بات صدفی صد حقیقت پر مبنی ہے کہ ان کی شاعری کا خمیر 1946 کے فساد سے تیار ہوا تھا جس میں انھوں نے ان اپنوں کو کھو دیا تھا جو پھر کبھی ان کے نہ ہو سکے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہی وہ حادثہ ہے جس نے کلیم عاجز کو میر کا پیرو کار بنا دیا اور ان کی شاعری میں قنوطی عناصر در آئے لیکن وہ ایک فنکار تھے، ایسے فنکار جسے غم جاناں کو غم دوراں بنانے کا ہنر معلوم تھا۔ یوں تو ان کے چار شعری مجموعے: وہ جو شاعری کا سبب ہوا (1976)، جب فصلِ بہاراں آئی تھی (1993)، کوچۂ جاناں جاناں (2003) اور پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا (2008) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ دیگر تصانیف میں مجلس ادب' (تنقید) 1959، یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ (سفرنامۂ حجاز) 1978، ایک دیس ایک بدیسی (سفر نامۂ امریکہ) 1979، جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی (خود نوشت) 1982، ابھی سن لو مجھ سے (خودنوشت) 1992، دیوانے دو (مکاتیب) 2000 اور دفتر گم گشتہ (تحقیقی مقالہ) 2000 وغیرہ نے بھی ادبی دنیا میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کی ہے لیکن مجھے ان کے اولین مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کو دیکھنے کا جب بھی اتفاق ہوا ،اس میں ایک عجیب کشش نظر آئی۔اس کے کور پیج کا ڈیزائن جس میں مسجد کی مناریں اور سنسان و ویران قصبہ کے لینڈ اسکیپ سے ہی بہت ساری باتیں مترشح ہوتی نظر آئیں، اس میں سرخ و سیاہ رنگ اس خونچکاں داستان پر اصرار کرتے نظر آئے جس سے ان کے گھر والے، وطن والے گزرے تھے۔دراصل یہ مجموعہ اس حساس شاعر کی آپ بیتی بھی ہے جس نے خود اس خون کے دریا کی شناوری کی ہے۔ 332 صفحات پر مشتمل اس مجموعے کا انتساب بھی ان سب چیزوں کی گواہی دیتا نظر آتا ہے جسے انھوں نے اپنی شہید ماں کے نام معنون کیا ہے۔

''اپنی والدۂ محترمہ کے نام جن کی شہادت کا غم میرا سرمایۂ حیات ہے''

کلیم عاجز کے شاعر بننے اور پھر ہم زبان میر بننے کی بات شاید اسی ایک جملے میں پوشیدہ ہے۔کلیم عاجز جیسا فنکار زندگی سے روگردانی نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کی حقیقتوں پر غور کرتا ہے، اس کا سامنا کرتا ہے، اسے جذبہ و احساس کی شکل عطا کرتا ہے پھر اسے صفحۂ قرطاس پر رقم کرتا ہے ۔ یہ خواہ نثر کی شکل میں ہو یا پھر شعر کی شکل میں۔ایک مجبور و مغموم شخص جس نے اپنی زندگی کی صرف بیس بہاریں دیکھی ہوں اور پھر اس پر رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں وہ اپنے خیالات کچھ یوں ہی ظاہر کر سکتا ہے، ان کی شاعری کو ٹوٹے ہوئے دل کی شاعری سے تعبیر کر کے خاموش ہو جانا شاید صحیح نہیں۔ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے، ان کی شاعری کو مصائب کے بیان کے طور پر بھی انگیز کرنا چاہیے جو ان معصوم لاشوں کے درمیان دلخراش چیخ کی صورت میں نکلی ہوگی جب وہ دوران فساد اپنے گاؤں گئے ہوں گے۔ان کے کلام میں جو درد اور تاثیر ہے وہ جذبات غم میں موجود خلوص پر ہی مبنی ہے۔ دیکھیں یہ اشعار جن میں میر کے ان شہرہ آفاق اشعار کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو زباں زد خاص و عام ہیں:

کتنا دکھ ، کتنی جفا، کتنا ستم دیکھا ہے
ہم نے اس عمر میں ایک عمر کا غم دیکھا ہے
کلیجہ تھام لو روداد غم ہم کو سنانے دو
تمھیں دُکھتا ہوا دل ہم دکھاتے ہیں دکھانے دو
ایسی حالت میں بھی دل ہے کہ جیے جاتا ہے
کون سا درد نہیں کون سا آزار نہیں
ہم نے جو دیا ہے وہ ہمیں جان رہے ہیں
سرمایۂ غم مفت کہاں ہاتھ لگے ہے
اب کے پھر برسات میں گنج شہیداں پہ چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

کلیم عاجز کے مجموعہ کلام کا مطالعہ کرنے پر بارہا یہ احساس ہوگا کہ ان کے یہاں تفکر کا پہلو اس قدر نمایاں نہیں جس قدر جذبات کا سیل رواں موجزن ہے۔ان کی شاعری صرف ان کے ذاتی غم کا بیان نہیں ہے بلکہ ہمیں اسے اس اجتماعی کرب کے ترجمان اور نقیب کے طور پر دیکھنا چاہیے

جو ہماری تہذیب وثقافت اور بھائی چارے کو گزند پہنچانے والی ہے۔اس کی مثالیں اولین جنگ آزادی سے لے کر آج تک جاری ریشہ دوانیوں میں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں بلکہ اس سے قبل کی تاریخ میں بھی، اگر میر کے زمانے میں مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا جس کی پاداش میں ابتری پیدا ہورہی تھی تو کلیم عاجز کے زمانے میں بھی کچھ ایسے ہی حالات تھے کہ اب کمپنی بہادر یعنی انگریزی سامراجیت آخری سانسیں لے رہی تھی اور اس نے اپنی سامراجی چالوں سے ملک کو تہہ و بالا کر رکھا تھا لیکن ہر دور میں عزم محکم کو فتح نصیب ہوئی ہے، ہر دور میں میر وکلیم پیدا ہوتے رہے جنھوں نے بہ زبان قلم تاریخ رقم کی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ کلیم عاجز اپنے عزم و حوصلے پر، اپنی شاعری کی غمناکی اور المناکی پر نازاں ہیں۔

بڑی شاعری میں صرف جذبات کا اظہار کافی نہیں ہوا کرتا کیونکہ اگر اس میں سلیقہ نہ ہو، فنکاری نہ ہو تو اسے نغمہ نہیں قرار دیا جاسکتا، اسے تو محض چیخ و پکار ہی کہا جائے گا۔کلیم عاجز کا کمال یہ ہے کہ ان کے ذہن و دل میں جب بھی جذبات نے انگڑائی لی، کوئی نیا خیال آیا نہیں کہ وہ اسے اشعار کے قالب میں ڈھالتے چلے گئے۔ایسے دلفریب انداز سے کہ اس میں نغمگی بھی ہو، ترنم بھی ہو اور تفکر بھی۔ظاہر ہے خیالات جب ان کے ذہن پر چوٹ کرتے ہیں، انھیں بے چین کرتے ہیں ،انھیں جذباتی بناتے ہیں تب ہی جاکر شعر وجود میں آتا ہے جس میں وہ تاثر پایا جاتا ہے کہ شعر پڑھتے ہی لگتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔یعنی آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے کہ اسے ہی شاعرانہ فن کاری کہا جانا چاہیے۔بقول سید علی عباس:

"کلیم بالعموم غزل کہتے ہیں کسی بڑے حادثے، کسی المناک سانحے، کسی ظلم ناروا، یا کسی دل ہلا دینے والے واقعہ کے زیر اثر۔سیاسی طوفان، سماجی ہیجان، دنیا کے ستم، انصاف کا خون اور انسانیت کی کمی دیکھ کر وہ تلملا اٹھتے ہیں اور اپنے دل کی دھڑکنوں کا جب کوئی علاج نظر نہیں آتا تو غزل کہنے بیٹھ جاتے ہیں... کلیم جو غزل کہتے ہیں وہ محض شاعری نہیں ہوتی۔اس میں مقصد ہوتا ہے، مطلب ہوتا ہے، سبق ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ لطف غزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ان کی غزلیں ذی فہم و ذی ہوش کے لیے بانگ درا سے کچھ کم نہیں۔ہاں ان کے کلام کا لباس واعظ کا لبادہ نہیں ہوتا، غزل کا شبنمی پیرہن ہوتا ہے۔غور کیجیے تو ان کی غزلوں میں آپ کو تواریخ بھی ملے گی اور فلسفہ بھی۔حال پر تبصرہ بھی اور مستقبل کا جائزہ بھی۔دکھے دلوں کی پکار بھی پایئے گا اور باغی کی للکار بھی۔"

کلیم عاجز: وہ جو شاعری کا سبب ہوا: ص-3134، پہلا ایڈیشن، شری ہمالیہ پریس پٹنہ 1976

مندرجہ بالا بیان سے قطع نظر ذرا باریک بینی سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ کلیم عاجز کی شاعری تجربات و حوادث کا بیان ہے، ان میں وہ تجربات زیادہ اہم ہیں جن سے وہ خود گزر رہے ہیں۔ایسے میں خودکلامی نے انھیں سہارا دیا ہے، ان کے مسائل کا حل دیا ہے۔اس کا اقرار انھوں نے بھی کئی بار کیا ہے کہ ان کی شاعری ایک خاموش خودکلامی ہے، یہ بات سچی بھی ہے کہ ایک حساس دل شاعر

"کلیم بالعموم غزل کہتے ہیں کسی بڑے حادثے، کسی المناک سانحے، کسی ظلم ناروا، یا کسی دل ہلا دینے والے واقعہ کے زیر اثر۔ سیاسی طوفان، سماجی ہیجان، دنیا کے ستم، انصاف کا خون اور انسانیت کی کمی دیکھ کر وہ تلملا اٹھتے ہیں اور اپنے دل کی دھڑکنوں کا جب کوئی علاج نظر نہیں آتا تو غزل کہنے بیٹھ جاتے ہیں...کلیم جو غزل کہتے ہیں وہ محض شاعری نہیں ہوتی۔اس میں مقصد ہوتا ہے ،مطلب ہوتا ہے ،سبق ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ لطف غزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ان کی غزلیں ذی فہم و ذی ہوش کے لیے بانگ درا سے کچھ کم نہیں۔ہاں ان کے کلام کا لباس واعظ کا لبادہ نہیں ہوتا ،غزل کا شبنمی پیرہن ہوتا ہے۔

خودکلامی نہ کرے تو اسی میں اسے سکون میسر ہوسکتا ہے۔اگر وہ ایسا نہ کر پائے تو نغمہ سرائی نالہ وشیون اور سینہ کوبی میں تبدیل ہوجائے گی جو کہ ایک عام انسان بھی کر سکتا ہے کہ اسے فن کاری ہرگز نہیں قرار دیا جائے گا۔بقول شاعر:

کچھ اپنی زندگی نالوں میں کچھ فریاد میں گزری
جو باقی رہ گئی اندیشۂ بیداد میں گزری
خزاں کا دور گزرا خانہ بربادی کے ماتم میں
بہار گل، بہار آشیاں کی یاد میں گزری

یا پھر یہ اشعار کہ:

رنج خزاں میں شوق بہار چمن میں ہے
دیوانہ آج تک اسی دیوانہ پن میں ہے
آتی ہے صاف صاف جھلک زخم و داغ کی
دل اور بے حجاب نقاب سخن میں ہے

سچ پوچھیے تو سوگواری یوں بھی خودکلامی کا شاخسانہ ہے جس سے وہ کم عمری میں ہی گزر چکے تھے شاید اسی نے اس کو مزید پختگی دی بلکہ یوں کہا جائے کہ ان کی شاعری اس سوگوار تنہائی کو اپنا مونس وہمنوا بنا دینے کی ایک عملی کوشش تھی جس میں انھیں کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے۔دراصل میر تقی میر اور کلیم عاجز کا درد مشترک ہے وہ یوں کہ میر تقی میر (پیدائش 1722) کو بھی اپنے دور میں ملکی انتشار، بے چینی اور طوائف الملوکی کا سامنا تھا، ان کی دلی پر تباہی و بربادی کے بادل منڈلاتے رہتے تھے، کبھی مرہٹوں اور جاٹوں کی شکل میں تو کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حرفت بازیوں سے ،لیکن ان سب سے زیادہ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی کے ظلم نے میر کو میر بنایا، ان کے دل اور دلی کو یک جان دو قالب بنا دیا۔بعینہٖ کلیم عاجز کو بھی کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا کہ اس زمانے میں بھی ہندوستان ایک عجیب قسم کے انتشار، بے چینی اور قتل و غارت گری کا شکار تھا۔سنہ 46 کے فساد نے، جس میں ان کا گھر بار سب تباہ ہوگیا، وہ اپنی جڑوں سے اکھڑ گئے بلکہ وہ ایک قسم کی ہجرت سے بھی دوچار ہوئے۔اسی پر بس نہیں اس کے فوراً بعد تقسیم ملک کا زخم جو کبھی بھر نہ سکا۔لیکن ایک فن کار کی فنکاری تو اسی میں مضمر ہے کہ وہ غم جاناں کو غم دوراں بنا کر پیش کردے بلکہ اسے غزل کی ایسی چاشنی عطا کردے کہ ہم اسے ادبی شہ پارہ قرار دینے لگیں۔شاید یہی وہ بنیادی خصوصیات ہیں جس کے پیش نظر علامہ جمیل مظہری نے ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"میر کی یہ میراث خاص تو خالق نطق نے ایک ایسے نوجوان کے لیے وقف کر رکھی تھی جو اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے ہی نہیں، میر کی خانگی، معاشرتی، سماجی اور ان کے عہد کے سیاسی حالات کی مشابہت کے اعتبار سے بھی میر کے تاثرات تغزل کا حامل ہونے والا تھا۔"

کلیم عاجز: وہ جو شاعری کا سبب ہوا ص12، پہلا ایڈیشن، شری ہمالیہ پریس پٹنہ 1976

علامہ جمیل مظہری کے اس بیان میں کئی باتیں اہم ہیں۔بہر حال کلیم عاجز بھی میر کی طرح ہی خوش اطوار، خوش اخلاق اور وضع دار شخصیت کے مالک تھے۔انھوں نے نہایت نامساعد حالات میں بھی ثابت قدم رہنے کا ہنر میر سے ہی سیکھا ہو یہ بھی بعید نہیں۔وہ اپنی دھن کے پکے تھے شاید اسی لیے انھوں نے نہ کبھی اپنا طرز سخن ترک کیا نہ ہی اپنے وطیرۂ زندگی میں کوئی تبدیلی کی، کہ یہی ان کی شناخت بنتی چلی گئی اور وہ عوام و خواص سبھی میں مقبول ہوتے چلے گئے۔اس مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری

میں اردو کی ان کلاسیکی روایات کی پاسداری بھی ملتی ہے جو ان کی شاعری کوتوانائی بخشتی ہے۔انھوں نے اپنے متقدمین سے بخوبی استفادہ کیا ہےلیکن میران کے دل سے قریب تر ہیں۔ دیکھیں میر کا یہ شعرجس میں انھوں نے دو عام سے الفاظ'سنو ہو' سے شعر کا لطف دوبالا کر دیا ہے، اسی طرز میں کلیم صاحب نے' کرو ہو'، 'چلو ہو' جیسی غزلیں کہیں ہیں اور ان سے شہرت ومقبولیت بھی حاصل کی ہے اسے پیرویِ میر نہیں کہیں گےتو اور کیانام دیں گے:

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو ، یہ بستی اجاڑ کے

اسی پس منظر میں دیکھیں یہ غزلیہ اشعار جن میں ان کا لب و لہجہ ان کی شناخت آپ تو ہے ہی اس میں میر کا رچاؤ بھی جلوہ گر ہے:

دیوانہ گل قیدی زنجیر ہیں اور تم
کیا ٹھاٹھ سے گلشن کی ہوا کھائے چلو ہو
مے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ
پینا نہیں آئے ہے تو چھلکائے چلو ہو
ہم کچھ نہیں کہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا
تم کیا ہو تمھیں سب سے کہلوائے چلو ہو
وہ شوخ ستمگر تو ستم ڈھائے چلے ہے
تم ہو کہ کلیم اپنی غزل گائے چلو ہو

غزل کی کامیابی اسی بات میں مضمر ہے کہ اس میں جذبات کی صداقت ،معصومیت اور خلوص و دردمندی کا کتنا عنصر شامل ہے اگر یہ سبھی باتیں کسی شاعر کے یہاں پائی جاتی ہوں اور وہ اس میں اپنے لب و لہجے کی نرمی، گھلاوٹ، سادگی ، بے تکلفی اور پرکاری سے شعر کو تیر ونشتر کی شکل دے دے تو غزل 'غزل' بنتی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں یہ اشعار:

لگے ہے پھول سننے میں ہر اک شعر
سمجھ لینے پہ انگارہ لگے ہے
لوگ کہتے ہیں کہ عاجز کی غزل
پھول پوشیدہ ہے اور پتھر کھلا
تم دوست ہو کیسے کہ دُکھاؤ ہو دلِ دوست
دشمن کا بھی دل ہم سے دُکھائے نہ بنے ہے

ان اشعار کی قرأت کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کا فن کن بلندیوں پر تھا، اور انھوں نے ان ہی حوالوں سے کیا کیا گل بوٹے نہ کھلائے ہوں گے۔

ظاہر ہے مندرجہ بالا باتیں زیب سخن کے لیے نہیں کہی گئی ہیں بلکہ سچ تو یہی ہے کہ ان ہی کیفیات کو اکثر و بیشتر وہ اپنے اشعار میں بھی پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو اس امر پر دلالت کریں گے اور ان کے فن کو سمجھنے میں بھی معاون ہوں گے:

مری شاعری میں ہے رقصِ جامِ نہ مے کی رنگ فشانیاں
وہی دل جلوں کی حکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں
یہ جو آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کے رفیق ہیں یہی میری رات کی رانیاں

ادیب و شاعر اسی سماج کی پیداوار ہوتا ہے، وہ آسمان سے اترا ہوا کوئی فرشتہ نہیں ہوتا کہ اس پر سماجی ناہمواریوں بوالعجبیوں اور ناانصافیوں کا کوئی اثر نہ ہو بلکہ سچ تو یہی ہے کہ وہ ناگفتہ بہ حالات میں ہی قلم کا سپاہی بن کر ابھرتا ہے۔کلیم عاجز نے اپنی شاعری کے ذریعے ہر زمانے میں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ان کی بہت ساری غزلوں نے ہر خاص وعام کو اپنی جانب متوجہ کیا بلکہ عوام سے ایوان حکومت تک سبھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔اپنے اشعار میں نہ صرف عوامی جذبات واحساسات کی نمائندگی کی ہے بلکہ اس میں ان لوگوں کو آئینہ بھی دکھایا گیا ہے جو نشہ حکومت وغرور میں مبتلا تھے:

میرے ہی لہو پر گزر اوقات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو
دن ایک ستم ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سر بام
پاس آ کے ملو دور سے کیا بات کرو ہو

اس غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیم عاجز کو کس سادگی سے، کس بیباکی کے ساتھ اپنی بات پیش کرنے کا فن آتا ہے۔ یہ بات مبنی برحقیقت ہے کہ ابتدائے پرورش ولوح و قلم سے ہی انھوں نے یہی انداز اپنایا اور تمام عمر اسی روش پر قائم رہے،کلیم عاجز کی جگہ شاید کوئی دوسرا شخص ایسا نہ کر پاتا کہ اسے یا تو سماج سے نفرت ہو جاتی یا پھر وہ کسی او راستے پر چل پڑتا۔ ادبی حوالوں سے ہر ممکن مجاہدہ ومجادلہ کرتے رہنا شان کلیم ہے کہ یہی ایک محافظ امن وآشتی کی شان ہوا کرتی ہے۔اسی لیے تو انھوں نے کہا بھی ہے کہ محبت اور پیار، شیفتگی اور وارفتگی یہی میری زندگی کا واحد تصور ہیں اور زندگی کا سب سے اونچا آدرش بھی۔کلیم عاجز کی شاعری میں ایک الگ قسم کا جوش ہے ولولہ ہے کچھ کر گزرنے کی تمنا ہے جو ہر دور میں لائق ستائش قرار پائے گا خصوصاً ان کا پیغام ان نوجوانوں کو اپنی طرف ملتفت کرتا ہے جو عصبیت کے شکار ہونے والے ہیں۔ یہ بات سچ بھی ہے کہ اتنے بڑے حادثے سے دوچار ہونے کے باوجود جب ان کی زندگی یا شاعری میں کہیں بھی قنوطیت کا نام و نشان نہیں تو پھر اس جذبہ کو ہی کیوں نہ مٹا دیا جائے۔ ان کی شاعری کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اشعار رجائیت کا مظہر ہیں جو عام قاری کو بھی ہمت، جواں مردی اور حوصلہ مندی کا درس دیتے ہیں۔

شعر ملاحظہ فرمائیں:

نہ اہل بتکدہ چاہیں نہ ارباب حرم چاہیں
زمانے میں جسے کوئی نہ چاہے اس کو ہم چاہیں

کلیم عاجز کی غزلوں میں درد وغم کا دریا موجزن ہے ،ایسا دریا جس کی روانی میر سے لے کر فانی اور پھر ناصر کاظمی تک بلکہ اس قبیل کے دیگر شعرا کے یہاں بھی نظر آتی ہے،لیکن کلیم عاجز ان معنوں میں زیادہ اہم ہیں کہ ان کی شاعری میں جگ بیتی تو ہے ہی آپ بیتی کا بھی وقیع ترین حصہ ہے جسے انھوں نے غزل کا قالب عطا کر دیا۔وہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے الفاظ کے علاوہ کوئی چیز حتیٰ کہ تجربات بھی مستعار نہیں لیے ہیں۔اس کی خالص وجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ ہی زندگی اور اس کے نشیب وفراز پر مرکوز رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ان کا یہ انداز جو اس پر دلالت کرتا ہے:

رونے نہ دیجیے گا تو گایا نہ جائے گا
درد اتنا تیز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
اب پیار کے فریب میں آیا نہ جائے گا
گھر ہی کہاں رہا کہ جلایا نہ جائے گا
کہتے ہیں کس ادا سے چھری پھیرتے ہوئے
کیا ہوگا وہ لہو جو بہایا نہ جائے گا

کلیم عاجز کی شعری کائنات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیے اس میں غم، مایوسی اور سوز کا عنصر غالب نظر آئے گا، اس میں جا بجا شکستہ دلوں کی آواز سنائی دے گی، جس میں ان کے لب ولہجہ کی غمناکی نے ایک سماں پیدا کر دیا ہے۔ میری نظر میں ان کے اسی وصف خاص نے انھیں ایک بلندی وسرفرازی بھی عطا کی ہے۔ بقول مجنوں گورکھپوری سرور وانبساط کے شاعر سے بڑا رتبہ غم واندوہ کے شاعر کا ہوتا ہے۔کلیم عاجز کی شاعری کے لیے ایسا کیوں نہ کہا جائے کہ اس میں وہ آفاقیت ہے جس میں پسپائی کا گزر نہیں، اس میں ایک حوصلہ مندی اور نبرد آزمائی کی قوت ہے جو انھیں نغمہ سرائی کی دعوت بھی دیتا ہے۔ بقول کلیم عاجز:

وہی زندہ رہنے کا فن جانتے ہیں
جو آداب دار و رسن جانتے ہیں

■

Hasan Musanna., G-2, Madhumati Apartment, Jora Talab Road, Bariyatu, Rahnchi - 834008 (Jharkhand)

اشرف استھانوی

حکایاتِ غم کا شاعر: کلیم عاجز

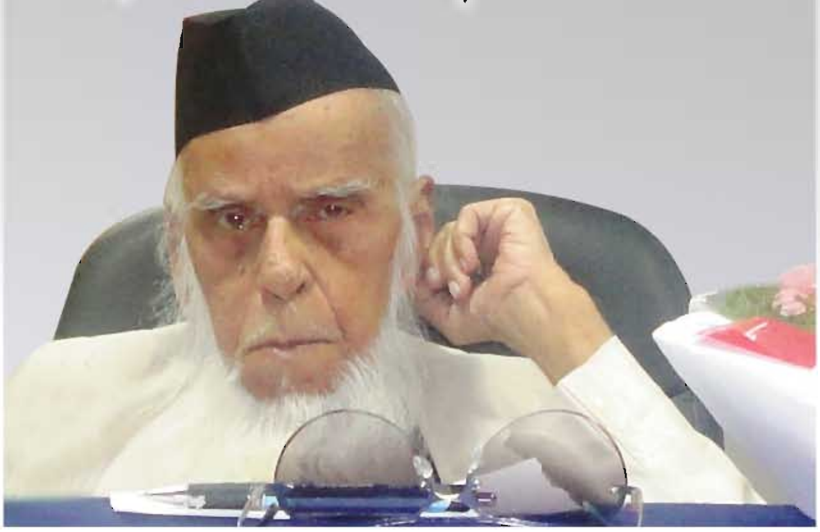

ثانی میر، روشن ضمیر، انسانیت، شرافت، اور وضعداری کی منہ بولتی تصویر، ملت کے غم خوار، دبستان عظیم آباد کے گوہرِ آبدار اور اقلیم سخنِ کے تاجدار پدم شری ڈاکٹر کلیم احمد عاجز۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں سے آزادی پاکر اور دنیائے آب و گل کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرکے 15 فروری 2015 کو صبح 7 بجے اپنے لاکھوں پرستاروں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دارِفانی سے دارالبقا کی طرف کوچ کر گئے۔

کلیم احمد عاجز انتہائی وضعدار اور تہہ دار شخصیت کے مالک تھے۔ نئے لب ولہجہ کے بلند پایہ شاعر، بہترین نثرنگار، کامیاب مدرس کے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی کا دینی، دعوتی اور تبلیغی پہلو بھی نہایت روشن اور تابناک ہے۔ تبلیغی جماعت حلقہ بہار کے امیر کی حیثیت سے آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ آپ کا دل نورِ ایمانی اور جوشِ ایمانی کی حرارت سے منور تھا۔ آپ کی سحر خیزی اور نالۂ نیم شبی کا کرشمہ تھا کہ غموں کے اتھاہ سمندر میں بھی آپ کے چہرے پر کبھی شکن تک نہیں آئی۔ پژمردگی نہیں آئی، ہمیشہ ہشاش بشاش اور مسکراتے رہے۔ دل ہے لہولہان مگر جبیں پرشکن نہیں۔ چہرے کی رونق، خوبصورتی اور جاہ وجلال دیکھ کر بلا شبہ کسی بزرگ، ولی اور صوفی کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ انھوں نے تبلیغی جماعت کے امیر کی حیثیت سے اہم کارنامے انجام دیے۔ دعوت تبلیغ کے لیے دور دراز گاؤں اور علاقوں کا دورہ کیا۔ دھوپ، گرمی، جاڑا، برسات، راہ کی دشواریوں اور کٹھن مرحلوں کو جھیلتے، برداشت کرتے ہوئے دعوتی مشن کو آگے بڑھایا۔ پوری دل جمعی اور دل سوزی کے ساتھ آخری دم تک اس فریضے کو بطریق احسن انجام دیا۔ ہمیشہ اختلافی مسائل سے گریز کرتے رہے۔ امت مسلمہ کو کلمۂ وحدت کی بنیاد پر ایک لڑی میں پرو کر زندگی گذارنے کا پیغام دیتے رہے۔ ان کی زندگی اس کی مکمل آئینہ دار تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہر مسلک اور مشرب کے لوگ ان کا یکساں طور پر احترام کرتے تھے۔

ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کی ایک خاص شناخت قدیم تہذیب و ثقافت کی پاسداری، پرانی وضع داری اور رکھ رکھاؤ تھی۔ کلیم عاجز کو شاعری کا ذوق فطری تھا۔ بچپن سے ہی علمی وادبی ماحول میسر ہوا جہاں علم وادب اور شعروسخن کی محفلیں جمتیں۔ پٹنہ کے انجمن رفیق الشعرا کے طرحی مشاعرں سے شاعری کی ابتدا کی۔ 1950-51 سے باضابطہ شاعری شروع کی اور بتدریج ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے عالمی شہرت حاصل کی۔ ان کی شاعری دکھے دلوں کی صدا اور شکستہ دلوں کی آواز ہے۔ دکھ بھروں کی حکایتیں ہیں اور دل جلوں کی کہانیاں ہیں۔ آہ ونالہ درد ہیں اور سوزِ دل کی حرارتیں ہیں۔ لیکن ان کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا سنگم ہے۔ غمِ ذات کو غمِ دوراں بنا دینے کی فنکارانہ مہارت و صلاحیت نے ذاتی غم کو بھی آفاقیت اور عمومیت عطا کی ہے۔ درد و غم، عشق ومحبت، خلوص ووفا اور شرافت وانسانیت آپ کی غزلوں کا عنوان بن گیا:

وہ پوچھے ہیں جب خیریت سے ہو عاجز
جگر تھام کر مسکرانا پڑے ہے

یہ عنوان کیوں اور کیسے بنا اس کی داستان دلخراش بھی ہے اور دلدوز بھی ہے۔ ان کی شاعری کو ان کی زندگی سے الگ کرکے دیکھنا ناانصافی ہوگی۔ ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کی زندگی درد وکرب اور مصائب وآلام سے لبریز رہی ہے۔ ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم ہی رکھا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ کچھ دنوں بعد بھائی بھی دنیا سے چل بسے۔ والد اور بھائی کے غم ابھی تازہ ہی تھے کہ 1946 میں بہار کے چھپرہ ضلع میں ہونے والے فرقہ وارانہ فساد کی آگ ان کے آبائی وطن تیلہاڑہ پہنچی جس میں ان کی والدہ، بہن اور دوسرے بہت سے قریب ترین اعزہ واقربا اور رشتہ دار شہید ہوگئے۔ اس پورے سانحہ کا نقشہ وہ جو شاعری کا سبب ہوا کے طویل مقدمہ میں کلیم عاجز نے کھینچا ہے۔ اس میں ایسی تاثیر اور سحر بیانی ہے کہ پڑھنے والا آہیں بھرنے لگتا ہے۔ دل زخمی ہو جاتا ہے۔ آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ کمزور دل کا قاری جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ اس حادثے نے کلیم احمد عاجز کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ زندگی ان کے لیے تاریک ہو گئی، دنیا ویران ہوگئی اور خوشیاں ناپید ہوگئیں۔

مری شاعری میں نہ رقص و جام نہ مے کی رنگ فشانیاں
وہی دکھ بھروں کی حکایتیں، وہی دل جلوں کی کہانیاں
یہ جو آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کے رفیق ہیں، یہی میری رات کی رانیاں
یہ مری زباں پہ غزل نہیں، میں سنا رہا ہوں کہانیاں
کہ کسی کے عہدِ شباب پر مٹی کیسی کیسی جوانیاں

کلیم احمد عاجز اپنے ساتھ گزرنے والے سانحات و واقعات کو ذہن و دل میں یاد اور تازہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے جو طرز اسلوب اختیار کیا وہ بہت سحر انگیز اور اثر انگیز ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ کلیم عاجز اپنی زبان میں اس کے دل کی بات کہہ رہے ہیں:

جہاں غم ملا اٹھایا، پھر اسے غزل میں ڈھالا
یہی دردِ سر خریدا، یہی روگ ہم نے پالا

کلیم عاجز غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی ترجمانی بڑی فنی مہارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس طَور پر کہ نہ غزل کی نازک خیالی متاثر ہوتی اور نہ ہی مضمون کی معنی آفرینی۔ ان کی المیہ شاعری کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی غمگینی، المناکی اور کربناکی میں مریضانہ پن اور یاسیت نہیں ہے۔ بلکہ اس میں جینے اور جلانے کا حوصلہ ہے۔ دنیا سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت ہے۔ مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہے۔

جب ملک میں ایمرجنسی نافذ تھی، زبانوں پر تالے لگے ہوئے تھے، قلم کی روشنائی خشک ہو چکی تھی، آنجہانی اندرا گاندھی کے رعب و دبدبہ کے سامنے بڑے بڑے لیڈر بھیگی بلی

بنے ہوئے تھے اس وقت بھی کلیم احمد عاجز نے لال قلعے کی فصیل سے محترمہ اندرا گاندھی کوللکارتے ہوئے کہا تھا:

یہ شہسوار وقت ہیں اتنا نشے میں چور
گر جائیں گے اگر یہ اتارے نہ جائیں گے

جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔کلیم عاجز کی شاعری،شاعری نہیں ساحری ہے جو سر چڑھ کر بولتی ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے ادیبوں،شاعروں اورنقادوں سے اپنی صلاحیت وقابلیت کالوہامنوایا۔رگھو پتی سہائے فراق گورکھپوری جیسے انانیت پسند شاعر بھی آپ کی شاعری کی ساحری سے نہ بچ سکے۔انھوں نے ان الفاظ میں آپ کی شاعری کوسراہا ہے۔

"میں اپنی زندگی کی اہم خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے جناب کلیم عاجز صاحب کا کلام خودان کے منہ سے سننے کے موقعے ملے۔ اب تک لوگوں کی شاعری پڑھ کر یا سن کر پسندیدگی اور کبھی کبھی قدر شناسی کے جذبات میرے اندر پیدا ہوتے رہے۔لیکن جب میں نے کلیم عاجز صاحب کا کلام سناتو شاعراور اس کے کلام پر مجھے ٹوٹ کر پیار آیا۔ہم آہنگی،محبت او رنا قابل برداشت خوشی کے جذبات میرے اندر پیدا ہو گئے۔ان کا کلام مجھے اتنا پسند آیا کہ مجھے تکلیف سی ہونے لگی او رکلیم عاجز صاحب پر غصہ آنے لگا کہ یہ کیوں اتنا اچھا کہتے ہیں۔ان کے اس جرم اور قصور کے لیے میں انہیں کبھی معاف نہیں کرسکتا۔اتنی دھلی زبان، یہ گھلاوٹ،لب ولہجہ کا یہ جادو جو صرف انتہائی خلوص سے پیدا ہوسکتا ہے اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کونہیں ملاتھا۔میں ان کا کلام سن کرخود اپنا کلام بھول گیا۔"

یہ بات بالکل درست ہے کہ ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کی زبان میں سادگی ہے،سلاست ہے، پیچیدگی اورژولیدگی نہیں ہے۔روز مرہ استعمال ہونے والے عام فہم الفاظ کے استعمال نے ان کی شاعری کو سہل ممتنع بنادیا ہے۔کلیم احمد عاجز وارداتِ قلب اور سچے جذبات کے اظہار کے لیے دقت پسندی اور تخیل پسندی سے کام نہیں لیتے ہیں۔میرے خیال میں یہ میر کے بعد پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عام بول چال کی زبان کوشاعری کا خوبصورت جامہ پہنایا ہے۔عام ناقدین شعروادب کا خیال ہے کہ کلیم احمد عاجز میر کے پیروکار ہیں اور ان کا اسلوب میر کے اسلوب سے ہم آہنگ ہے۔انھوں نے خود بھی اس کا دعویٰ کیا ہے:

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے

اس بات میں ایک حد تک تو صداقت ہوسکتی ہے کہ میر کی طرح کلیم عاجز بھی ابتلا و آزمائش سے دوچار ہوئے۔ دونوں کی زندگی میں دکھ،درداور مصیبتیں ہمیشہ لگی رہی ہیں۔اس لیے ایک دوسرے کے اثرات کوقبول کرنا بالکل فطری بات ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ کلیم احمد عاجز نے اپنی الگ انفرادیت قائم کی ہے۔میر کے اسلوب کی پیروی کے باوجودان کی شاعری میر سے الگ اور بھر پور ندرت وجدت لیے ہوئے ہے۔اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ کلیم عاجز، میر کے کبھی مقلد نہیں رہے۔جیسا کہ انھوں نے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا۔۔۔' کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے۔مگر اس کے باوجود دونوں کے اسلوب و طرز میں جو ہم آہنگی اور مماثلت پائی جاتی ہے وہ فن سے نہیں بلکہ زندگی سے حاصل ہوئی ہے۔علامہ جمیل مظہری کلیم احمد عاجز کے اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کلیم احمد عاجز اپنی کیفیات تغزل میں میر کے فرمانبردار پیروکار تو ہیں،لیکن یہ نہ سمجھیے کہ ان کے دائرہ فکروفن میں میر کی تقلید کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ان کی غزلوں میں تغزل جدید کا پرتو بھی ملتا ہے،ان کے اندازِ بیان میں نہ صحیح،ان کے اندازِ فکر میں بھر پور ندرت اور جدت ہے۔ اندازِ فکر میں جدت اور اندازِ بیان میں قدامت کلیم عاجز کے تغزل کا مخصوص آرٹ ہے جو سیکڑوں شعرا کے ہزاروں اشعار کے ہجوم میں جانا اور پہچانا جاسکتا ہے۔"

کلیم احمد عاجز کی غزلوں کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا، نیا لب ولہجہ عطا کیا، نیا رنگ وآہنگ بخشا،منفرد طرز وادا سے ہمکنار کرایا۔میر کے اسلوب کی تجدید کی۔اسے نئی زندگی بخشی۔میر کا سادہ مگر پرتاثیر لہجہ جو ماضی کی تاریکیوں میں گم ہو چکا تھا اس میں نئی روح پھونکی۔انھوں نے پرانی زبان،کلاسیکی الفاظ کو نیا پیرہن عطا کیا۔اردو غزل کو عشق وعاشقی،لب ورخسار،زلف وکمر کی تنگ دامنی سے نکال کر بڑے بڑے مسائل کو بھلا کراور میٹھا رس دے کر غزل کے سانچے میں ڈھال دیا اور پہلی مرتبہ انھوں نے بہار کے مگدھ علاقے کی زبان مگہی آؤ ہو، جاؤ ہو، کہو ہو، کرو ہو، سنو ہو، وغیرہ کا استعمال اس فنی چابکدستی سے کیا کہ اسے عالمگیر شہرت حاصل ہوگئی۔یہ میر کی زبان نہیں ہے۔جیسا کہ عام طور پر ناقدین ادب کا خیال ہے۔ڈاکٹر کلیم احمد عاجز نے خود اس بات کی تردید کی ہے۔ یہ بہار کی وہ بولی ہے جو مگدھ، نالندہ، گیا، جہان آباد، اورنگ آباد، پٹنہ اور اس کے اطراف میں بولی جاتی ہے۔ یہ ان کا اعزاز ہے کہ انھوں نے مقامی بولی کو ادبی مقام عطا کیا اور اسے شہرت دوام بخشا:

میرے ہی لہو پر گذر اوقات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کروہو
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

مشہور ادیب کنہیالال کپور کلیم عاجز کے اسلوب پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"کلیم عاجز کی غزلوں میں خدائے سخن میر تقی میر دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔کلیم عاجز دورِ جدید کے پہلے شاعر ہیں جنھیں میر کا انداز نصیب ہوا۔ان کی غزلوں کے تیور نہ صرف میر کی بہترین غزلوں کی یاد دلاتے ہیں بلکہ ہمیں اس سوز وگداز سے بھی روشناس کراتے ہیں جو میر کا خاص حصہ تھا۔"

ڈاکٹر کلیم احمد عاجز نہ صرف یہ کہ ایک مخصوص لب ولہجہ کے بڑے شاعر تھے بلکہ یہ شاعر جتنے بڑے تھے،اس سے بھی بڑے یا کم از کم اسی رتبے کے نثر نگار بھی تھے۔شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی بلا کا جادو اور سحر بیانی پائی جاتی ہے۔نثر میں انھوں نے اپنی کئی یادگار کتابیں چھوڑی ہیں۔ جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ، ایک دیس ایک بدیسی، سفر نامہ امریکہ، ابھی سن لو مجھ سے، بہار میں اردو شاعری کا ارتقا، پہلو نہ دکھے گا، دفتر گم گشتہ، مجلس ادب(خطوط کا مجموعہ) میری زبان، میرا قلم(دو جلدیں) ان کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلیم احمد عاجز ایک بہترین نثر نگار اور ایک واضح نقطہ نظر رکھنے والے مبصر اور تنقید نگار تھے۔ان کی ہر تحریر سوزِ دروں میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کلیم عاجز تنقید یا خاکہ نگاری کی سمت توجہ دیتے تو وہ بہترین ناقد اور کامیاب خاکہ نگار بن سکتے تھے۔'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں جگہ جگہ خاکہ نگاری کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔سراپا کھینچنے میں ایسا ملکہ حاصل ہے کہ ہو بہوان کی تصویریں متحرک ہو کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔امید ہے کہ ناقدین فن وادب اس جانب بھی توجہ دیں گے اور کلیم عاجز کی نثری خدمات پر کام کریں گے۔اسی طرح کلیم احمد عاجز کو سفر نامہ لکھنے میں بھی مہارت حاصل تھی۔انھوں نے دو سفر نامے لکھے،جن کے پڑھنے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے اندر اچھے سفر نامے لکھنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ان کے سفر نامے کی ایک خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خود بھی سفر کر رہا ہے۔ یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ۔اس سفر نامہ حج میں انھوں نے جو منظر نگاری کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر لفظ عشق ومحبت اور سوز دروں میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ تاریخی واقعات اور اہم معلومات کو حسب ضرورت انھوں نے اس انداز سے کھپایا ہے کہ سفر نامے کی مقصدیت بھی متاثر نہیں ہوتی ہے اور قارئین کو معلومات کا خزانہ بھی ہاتھ لگ جاتا ہے۔مذکورہ بالا کتابیں شائقین ادب کے لیے آنکھوں کے سرمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔اتنے بڑے شاعر اور نثر نگار کا اس دارِ فانی سے کوچ کر جانا یقیناً اردو ادب کا بڑا نقصان ہے۔کلیم عاجز آج اس دنیا میں نہیں ہیں،لیکن ان کی یادیں ہیں، ان کی باتیں ہیں ان کی خدمات ہیں،ان کی تخلیقات ہیں۔اپنی علمی، ادبی اور دعوتی خدمات کے سبب وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

■

Ashraf Asthanvi, Faqeer Bara, Bankiur, Patna 800004 (Bihar)
E-mail.: ashrafasthanvi@yahoo.com

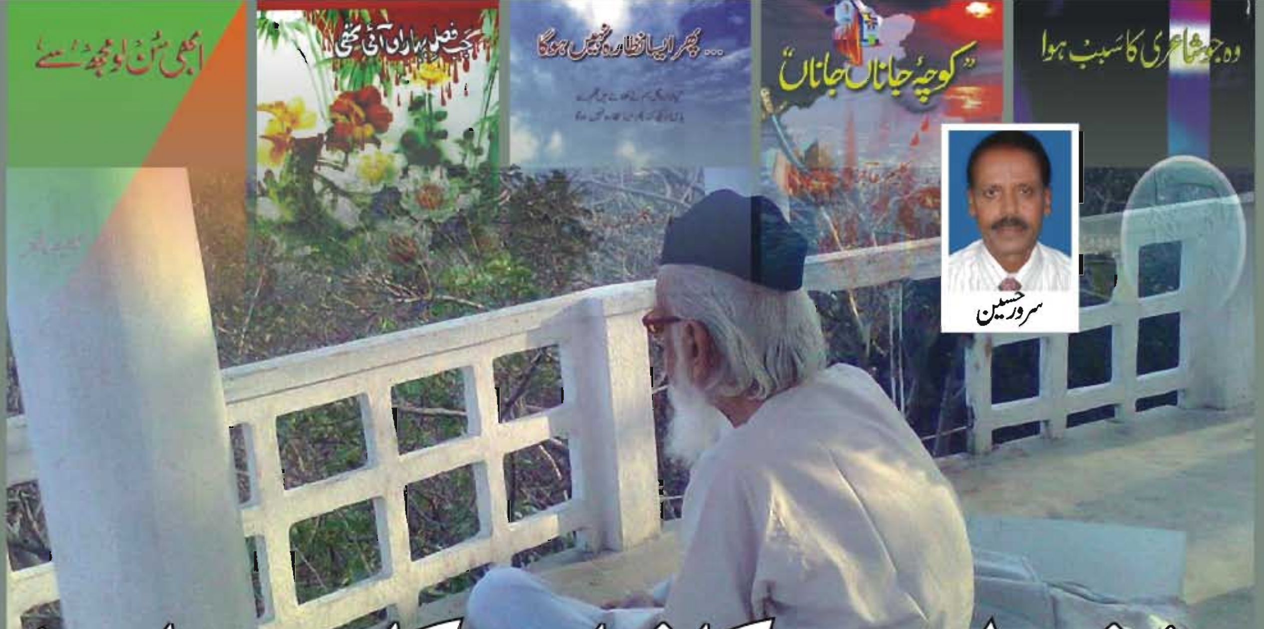

منفرد لہجے کا شاعر: کلیم عاجز

کسی شاعر، ادیب یا نقاد کی عظمت اس بات میں مضمر نہیں ہوتی کہ وہ کس بڑے شاعر، ادیب یا نقاد کے انداز اور روایات کا تتبع کرتا ہے یا اس کے اسلوب، زبان و بیان یا فکر کی پیروی کو اپنا مطمحِ نظر بناتا ہے بلکہ کسی فن پارے کی عظمت اور اس کے خالق کی پہچان اُس کی اپنی تخلیقی روش سے قائم ہوتی ہے جو اس کی انفرادیت کے نقوش کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ میر، غالب، اقبال، فیض، اور فراق کے یہاں بعض قدریں مشترک ہوسکتی ہیں لیکن اُن کے تخلیقی اوصاف قطعی مشترک نہیں کہے جاسکتے۔ اکثر شعرا کے بعض کلام اور اُن کے کہنے کا انداز اس قدر ایک دوسرے سے ملتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ قاری مغالطے میں پڑ جاتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھتا ہے کہ پیشِ نظر شاعر یا ادیب پر اس کے مقابل کا اثر اور رنگ و آہنگ غالب ہے۔ اردو کے معروف شاعر کلیم عاجز کے حوالے سے بھی بعض قارئین کی طرف سے ایسے خیالات ظاہر کیے جاتے رہے ہیں کہ اُن کی شاعری میر کی زبان و روایات اور اُن کے اسلوب کی امین نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس مغالطے کی وجہ خود عاجز کے کلام کا وہ حصہ ہے جس میں اُنھوں نے خود کو میر کا وارث بتانے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں اُن کے چند اشعار پر نظر ڈالیں تو اس بات کا احساس ہوگا کہ ان اشعار کو پڑھ کر ادب کے عام قاری کے لیے مغالطے میں پڑ جانا ممکن نہیں:

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے

طبیعت کو قابو میں لانا پڑے ہے
اُٹھے ہے کہاں غم اُٹھانا پڑے ہے

ہم نے جو دیا ہے وہ ہمیں جان رہے ہیں
سرمایۂ غم مفت کہاں ہاتھ لگے ہے

موسمِ گل کی کچھ باتیں ہیں لیکن تم سے کون کہے
تم تو بس سنتے ہی عاجز دیوانے ہو جاؤ ہو

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

یہ فتنے جو ہر اک طرف اُٹھ رہے ہیں
وہی بیٹھا بیٹھا شرارت کرے ہے

مندرجہ بالا محض چند اشعار ہیں جو نمونتاً پیش کیے گئے ہیں۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کلیم عاجز کی پوری شاعری میں تلاش کیے جانے پر ایسے اور بھی کئی اشعار مل جائیں گے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان اشعار میں سوز و گداز کی کیفیت تغزل کا رنگ زبان و بیان کا انداز، مزاج کا والہانہ پن اور سپردگی کا وہ جذبہ جو میر کی شاعری کا وصف ہے ہمہ دم موجزن نظر آتا ہے۔ لیکن محض ان اوصاف کی بنا پر اُن کی شاعری پر میر کے رنگ اور اُن کے انداز کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ میر اور کلیم عاجز کے حالات میں یکسانیت غم و اندوہ کی کیفیت، زمانے کی سختی اور تجربات کی تلخی میں بعض مماثلت کے باوجود ایسے نمایاں اختلافات رہے ہیں جو دونوں کے درمیان حدِ فاصل بھی قائم کرتے ہیں۔ یہ فاصلہ دونوں کے عہد سے بھی واضح طور پر جھلکتا ہے اور دونوں کے مزاج سے بھی۔ میر کے جاگیردارانہ سماج کی گھٹن اُس کا جبر، اُس کا تضاد اور اس کے نتیجے میں عام انسان کی وہ بے چارگی و محرومیاں ہی تھیں جو اُن کی فکر میں جذب ہو کر اُن کے مزاج کی تشکیل میں معاون ہوئی تھیں۔ میر کے اپنے تجربات نے ہی اُنھیں ذات کے آئینے میں کائنات کو دیکھنے کی طرف مائل کیا تھا۔ یہ صورتِ حال کلیم کے یہاں بدل جاتی ہے۔ یہاں جاگیردارانہ سماج اپنی آخری سانسیں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں بدیسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگ میر کے عہد کی طرح محض بے بس و مجبور نہیں بلکہ زنجیروں کو توڑنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ ان میں ظلم و جبر اور سماجی نا انصافی کا احساس بھی ہے اور یہ اس کے خلاف لڑنے اور نئے سماج کی تشکیل کے جذبے سے لیس بھی ہیں۔ کلیم عاجز نے ذاتی طور پر سماج کے ظلم و ستم کا سامنا بھی کیا اور خارجی احوال کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہوئے۔ اس نے ان کی شخصیت کو میر کی طرح تماشائی نہیں بننے دیا بلکہ خود بھی تماشے کا حصہ بن کر اُن میں زندگی کے اسرار کو تلاش کرنے کی چاہت پیدا کی۔ ذیل کے اشعار دیکھیے:

وہ آئیں قتل کو جس روز چاہیں
یہاں کس روز تیاری نہیں ہے

> **میر اور کلیم عاجز کے حالات میں یکسانیت غم و اندوہ کی کیفیت، زمانے کی سختی اور تجربات کی تلخی میں بعض مماثلت کے با وجود ایسے نمایاں اختلافات رہے ہیں جو دونوں کے درمیان حدِ فاصل بھی قائم کرتے ہیں۔ یہ فاصلہ دونوں کے عہد سے بھی واضح طور پر جھلکتا ہے اور دونوں کے مزاج سے بھی۔ میر کے جاگیردارانہ سماج کی گھٹن اُس کا جبر، اُس کا تضاد اور اس کے نتیجے میں عام انسان کی وہ بے چارگی و محرومیاں ہی تھیں جو اُن کی فکر میں جذب ہو کر اُن کے مزاج کی تشکیل میں معاون ہوئی تھیں۔**

اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آکے ملو دور سے کیا بات کرو ہو

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

جدا جب تک تری زلفوں سے پیچ وخم نہیں ہوں گے
ستم دنیا میں بڑھتے ہی رہیں گے کم نہیں ہوں گے

الگ بیٹھے ہیں جو آدابِ مے نوشی سے واقف تھے
جسے پینا نہیں آتا اسی کے ہاتھ جام آیا

بڑھ کے خود کانٹوں پہ رکھ دیں ہم نے اپنی انگلیاں
اُس سراپا ناز کا دامن بچانے کے لیے

ظاہر ہے محبوب کے دامن کی حفاظت کے لیے کانٹوں پر انگلی رکھ دینے کا یہ حوصلہ کلیم عاجز کا ہی حصہ ہے میر کا نہیں۔ میر تو عالمِ فراق میں کسی گوشے میں تنہا بیٹھ کر اپنے محبوب کے لیے محض آنسو بہا سکتے ہیں یا دعائیں کر سکتے ہیں۔ میر ہی کا شعر ہے:

کہیو قاصد جو وہ پوچھیں ہمیں کیا کرتے ہیں
جان و ایمان و محبت کی دعا کرتے ہیں

البتہ عاجز کی طرح زندگی کا سامنا کرنے کا یہ جذبہ میر کے بجائے غالب کے یہاں ضرور ملتا ہے جو اپنی تمام تر کم مائیگی کے باوجود اپنے حالات پر ہنستے بھی ہیں اور جاں سے گزر جانے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

میر کی طرح کلیم عاجز کی محبت بھی ایک عبادت تھی لیکن میر کی محبت کسی صوفی کے اس جذبۂ محبت سے مشابہہ نظر آتی ہے جو خالقِ مطلق کی ذات میں اپنی ذات کو جذب کر دینے کی خاطر خانقاہوں کی دیواروں اور اپنے محبوب کے تصور کے ایک ایسے حصار میں خود کو قید کر لیتا ہے جس میں اُس کی خوشیاں بھی ہوتی ہیں اور اس کا غم بھی اس کی محرومیاں بھی ہوتی ہیں اور اس کی کامرانیاں بھی اس کی رندی بھی ہوتی ہے اور اُس کی سرمستی بھی۔ لیکن کلیم عاجز کی محبت محض داخلیت کے گھٹے ہوئے ماحول میں سانس نہیں لیتی، خارج کے کھلے ماحول کا احساس بھی رکھتی ہے۔ عاجز کے یہاں محبوب کے وجود کا ایسا نرم وگرم احساس ہے جو اپنے غم کے وجود کا یقین بھی دلاتا ہے اور دوسروں کے غم کو اپنی ذات اور فکر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ بھی عطا کرتا ہے۔ عاجز کی منزل محض شوقِ وصالِ یار تک محدود نہیں بلکہ فضائے لامحدود کو اپنی دسترس میں سمیٹ لینے کا دوسرا نام ہے۔ وہ کہتے ہیں:

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل
ہم مسافر ہیں بہت دور کے جانے والے

یا

چراغِ سرِ رہ گذر ہم کو سمجھ
نہ منزل نہ ہم انجمن جانتے ہیں

مر کر بھی دکھا دیں گے ترے چاہنے والے
مرنا کوئی جینے سے بڑا کام نہیں ہے

کلیم عاجز زندگی کا شاعر ہے۔ وہ جینے کو مرنے پر ترجیح دیتا ہے۔ اُس کی آپ بیتی بہت تلخ رہی ہے لیکن اُس نے اپنی آپ بیتی میں جگ بیتی نہیں تلاش کیا، بلکہ جگ بیتی میں آپ بیتی تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ اُس کی دروں بینی میں عصری سماج کا شعور بھی ملتا ہے اور آنے والے عہد کی بصیرت بھی۔ اس بصیرت سے میر کو کوئی علاقہ نہیں تھا۔ تاہم بعض قارئین کو کلیم عاجز کے یہاں میریت کی موجودگی کا گمان دونوں کے یہاں الفاظ کے یکساں استعمال کے سبب بھی ہوتا ہے۔ لیکن کلیم عاجز اور میر کی زبان ایک نہیں کہی جاسکتی کیونکہ ہر عہد اپنی زبان خود تشکیل دیتا ہے۔ زبان محض الفاظ کے مجموعے کا نام نہیں۔ الفاظ تو بے جان ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے خیالات و جذبات کی ترسیل کا محض واسطہ ہوتے ہیں۔ الفاظ میں جان وہ معنویت اور بلیغ اشارے ڈالتے ہیں جو سماج اور عہد متعین کرتا ہے۔ میر کی زبان اُن کے عہد کی زبان تھی۔ وہ اُنیسویں صدی کے زوال آمادہ جاگیردارانہ عہد کی زبان تھی جہاں حاشیے پر کھڑا ہوا عام انسان محض تماشائی ہوتا تھا اور جبر سہنا اُس کا مقدر۔ کلیم عاجز کی زبان بیسویں صدی کی زبان ہے بلکہ آج کی اکیسویں صدی کی بھی جو عصری سماج کی فکر و نظر اور تقاضوں کا احاطہ کرتی ہے۔ میر اپنے حالات پر

صرف رو سکتے تھے۔ اُن میں حالات کا مقابلہ کرنے اور اسے بدلنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ عاجز حالات کا سامنا کرنا بھی جانتے ہیں اور اسے بدلنے کا جگر بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے میر سے اُن کی زبان مختلف ہے۔ ذیل کے اشعار سے دونوں کا فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ میر کہتے ہیں:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
(میر)

کلیم عاجز، میر کی طرح خود کو بے بس و نڈھال نہیں پاتے۔ وہ آگ کو پی کر بھی زندہ رہنے کا ہنر جانتے ہیں اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کرتے ہیں:

وہ تو کہیے رکھ لی ہم نے آشیانے کے لیے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے
(کلیم عاجز)

ذیل کے یہ اشعار بھی دیکھیے:

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
(میر)

خشک ہو جاتے ہیں جب آنسو تو آتا ہے لہو
غم وہ دولت ہے کبھی جس پہ زوال آتا نہیں
(کلیم عاجز)

اوپر کی مثالیں دونوں کی انفرادیت کی محض نشاندہی کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ اس سے غرض میر کی اہمیت کے سامنے کوئی سوال کھڑا کرنا نہیں۔ کیونکہ میر کی شاعرانہ عظمت اور اہمیت سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میر الفاظ و بیان کے جادوگر ہیں۔ لفظوں کے پس منظر سے جھانکتی ہوئی زندگی کو اس طرح مجسم کر دینا کہ کیفیتیں احساسات کے تاروں کو مسلسل ضرب لگاتی رہیں جادوگری نہیں تو کیا ہے؟ یہ میر کا ہی حصہ ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ کلیم عاجز میر سے متاثر بھی رہے ہیں اور اُن کے مداح بھی۔ تاہم متاثر ہونا اور پیروی یا تقلید کرنا دو الگ باتیں ہیں۔ اقبال داغ کے شاگرد تھے لیکن اُنھوں نے داغ کی پیروی نہیں کی۔ فیض بھی غالب سے متاثر تھے لیکن اُنھوں نے غالب کی تقلید کرنے کے بجائے اپنی روش خود بنائی۔ بڑا شاعر اپنی راہ خود بناتا ہے اور اپنی انفرادیت سے پہچانا جاتا ہے۔ کلیم عاجز منفرد لب و لہجے کے ایک باکمال شاعر ہیں۔ اُن کی شاعرانہ روش کا میریت سے کوئی علاقہ نہیں۔ اُن کی عظمت و اہمیت بلاشبہ اُن کی انفرادیت میں ہی مضمر ہے۔

■

Sarwar Hussain, 201, Shahid Place, Samanpura, Patna - 800014
e-mail.:syedhussain3343@yahoo.com

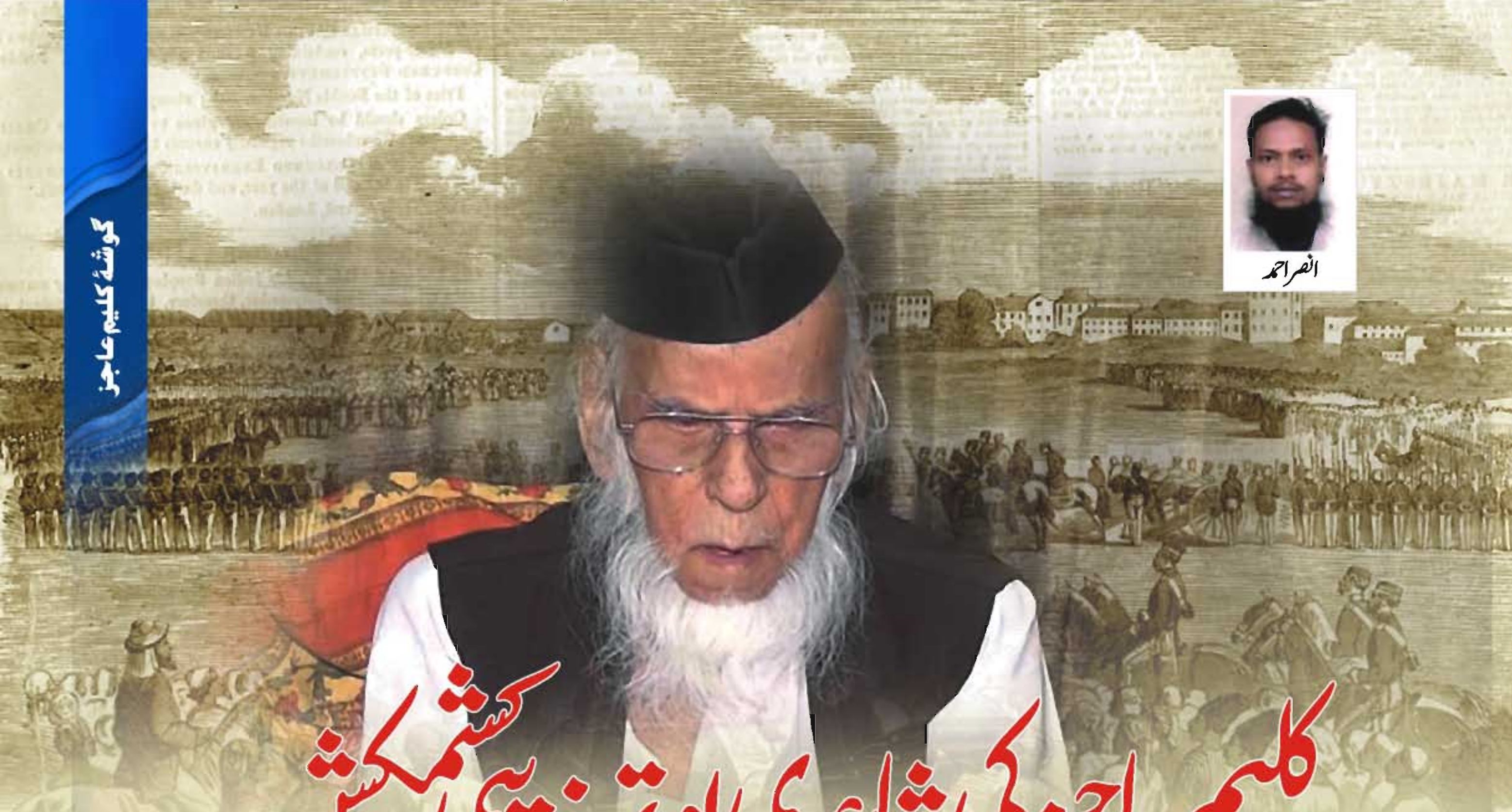

انصر احمد

کلیم عاجز کی شاعری اور تہذیبی کشمکش

تقسیم ہند کے بعد اردو شاعری کے افق پر ایک نیا نام ابھر کر سامنے آیا جسے دنیائے شاعری کلیم عاجز کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ کلیم عاجز کو جانشین میر بھی کہا جاتا ہے، کیوں نہ کہا جائے کہ غالب سے لے کر فراق تک تقریباً دو صدیوں سے شعرائے اردو نے میر کے رنگ میں شعر کہنے کی کوششیں کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اثر لکھنوی اپنے نام کے آگے پیرو میر لکھا کرتے تھے اور میر کے اتباع پر فخر کیا کرتے تھے لیکن ان کی شاعری میں خدائے سخن کا رنگ کہیں جھلکتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ذوق دہلوی نے بھی خوب فرمایا تھا:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

عہدِ جدید کے عظیم فن کار فراق گورکھپوری نے بھی میر کی پیروی کی اور کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر جانشین میر کا لقب قدرت نے کسی اور کے حق میں ودیعت فرما دیا تھا۔ وہ شخص پٹنہ کا نازک بدن شاعر کلیم احمد عاجز ہے۔

تہذیب ایک کثیر الجہات لفظ ہے جو کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً: خوش اخلاقی، اصلاح کرنا، شائستگی، پاک کرنا وغیرہ۔ لفظ تہذیب سے بہت سارے لوگ یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ تہذیب کے زیر اثر صرف اچھے کام اور اچھی عادتیں ہی آتی ہیں، ایسا نہیں ہے تہذیب کے زیر اثر اچھے کام کے ساتھ بری عادتوں اور برے اعمال اور طریقۂ کار کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ملک ہندوستان میں بہت ساری تہذیبیں بیک وقت زندہ و تابندہ ہیں اور سب کی الگ الگ شناخت ہے۔ مشہور انگریزی اسکالر، ریمنڈ ولیمز Raymond Williams کہتا ہے:

''تہذیب کبھی بھی مکمل نہیں ہوتی ہے، یہ ہمیشہ بننے کی شکل میں ہوتی ہے۔''

درج بالا اقتباس میں ریمنڈ ولیمز کے قول سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ تہذیب کبھی ایک منزل پر نہیں ٹھہرتی بلکہ یہ اپنا سفر ہمیشہ جاری و ساری رکھتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم ہندو تہذیب یا آٹھویں صدی کے اوائل (مسلم تہذیب) سے لے کر آج تک دونوں تہذیبوں میں ایک بہت بڑا بعد واقع ہو چکا ہے، ایک بہت بڑا فرق وقوع پذیر ہو چکا ہے اور آئندہ زمانوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

تہذیب کی پیچیدگی اور کثیر الجہتی کے تعلق سے مشہور نقاد گوپی چند نارنگ اپنی کتاب 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب' میں لکھتے ہیں:

''تہذیبی مطالعے کا موضوع اتنا وسیع، پیچیدہ اور کثیر الجہات تھا کہ سمیٹنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ یہ ہمت اب بھی نہیں ہوتی تاہم نوٹس میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور مباحث میں توسیع کا مسئلہ جاری ہے۔''

کلیم عاجز کی شاعری کی ابتداء ہی کش مکش سے ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے ان کی کتاب زندگی کا مطالعہ کیا ہوگا وہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ کس طرح بے چارگی سے ابھر کر انھوں نے 1950 میں اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ رب کائنات نے انھیں اتنا وسیع ظرف عطا کیا تھا کہ ان کے ساتھ گزرے جاں سوز حادثے کے باوجود انھوں نے اپنی شاعری میں محبت و اخوت اور بھائی چارے کی بات کہی ہے۔ مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کا شکوہ تو انھوں نے صدہا اپنی شاعری میں کیا ہے، لیکن ساقی و میکدہ کے پیرائے میں، محبوب و معشوق کے استعارے میں، حد تو یہ ہے وہ اپنے دشمنوں کو بھی دوست، پیارے، جاناں، ہم نشیں اور ساقی جیسے الفاظ سے نوازتے ہیں۔ کبھی کبھی درد کی ٹیس زیادہ ہو جاتی ہے تو سنجیدگی سے فرماتے ہیں:

وہ تو کہیے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لیے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لیے

کلیم عاجز کی پوری شاعری میں کش مکش کے عناصر موجود ہیں۔

1957 میں مجاہد آزادی سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین بہار کے گورنر بن کر پٹنہ تشریف لائے تو پٹنہ کے سرخیل لوگوں نے کلیم عاجز سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے استقبال و جشن آزادی کے موقع سے ایک نظم بہ صورتِ تہنیت لکھ دیں۔ کلیم عاجز 1950 سے شاعری کر رہے تھے مگر انھوں نے آج تک کوئی نظم نہیں لکھی تھی۔ یہ صورت حال ان کے لیے کسی چیلنج سے کم نہ تھی، بہر کیف کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے انھوں نے ایک نظم 'جشن بہاراں' کے عنوان سے

لکھ لی۔ 57 کے جشن آزادی میں ارباب ذوق نے تو یہ سمجھ کر کلیم عاجز کو آواز دی کہ آزادی ملی ہے، بہار آئی ہے تو وہ اس تعلق سے کچھ اشعار سنائیں گے، مگر یہاں تو معاملہ ہی جدا تھا۔ کلیم عاجز مائک پر آتے ہیں تو ایک بے خودی، ایک دیوانگی اور خود فراموشی کی کیفیت ان پر طاری ہوجاتی ہے:

ہوشیاروں کو نہیں معلوم رازِ فصلِ گل
مجھ سے پوچھو میں اسی موسم میں دیوانہ بنا

مائک پر کلیم عاجز آئے تو ان کی نگاہوں کے سامنے ان کے سارے غم تصویر کی طرح آویزاں ہو گئے، یہ غم دینے والے کوئی اور نہیں ان کے دن رات کے ساتھی، صبح وشام کے دوست ہی تھے۔ 57 کے جشن آزادی میں اپنے ایک ایک زخم ایک ایک غم کو وہ یوں یاد دلاتے ہیں:

یاد ہے آپ کو وہ حادثۂ موسمِ گل
شعلہ شعلہ جو ہوا صحنِ گلستان کہیے
آپ کو یاد تو ہوگا وہ تماشا یعنی
رقصِ شمشیر بہ ہنگامِ بہاراں کہیے
یاد تو ہیں آپ کو وہ منظرِ صبحِ وطن
جن کی تقدیر میں تھی شامِ غریباں کہیے
یاد تو ہوگا وہ بے راحلہ و زادِ سفر
رخصت قافلہ خانہ بدوشاں کہیے
یاد ہیں آپ کو وہ ہر روشِ گلشن پر
پھول روندے ہوئے مسلی ہوئی کلیاں کہیے

(کوچہ جاناں، ص110)

داناپور کھگول میں سرکاری مشاعرہ ہوا، یہ مشاعرہ غیر طرحی تھا۔ ملک کے نامور شعراء کے ساتھ پنڈت جگن ناتھ آزاد بھی شریک مشاعرہ تھے۔ اس وقت آزاد کا طوطی بول رہا تھا، جب وہ اپنے وطن لائل پور (پاکستان) سے جدا ہونے کی تمہید کے ساتھ اپنی دو تین مشہور غزلیں تقریباً ہر مشاعرے میں پڑھا کرتے تھے اور مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔

ان کی پہلی غزل:

نہ پوچھ جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گذری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گذری

اور دوسری غزل:

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

(وطن میں اجنبی، اشاعت 1954، بار اول)

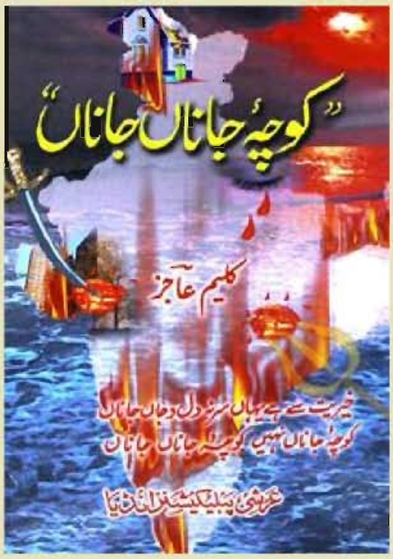

کلیم عاجز کا جگن ناتھ آزاد کے ساتھ یہ پہلا مشاعرہ تھا اور اتفاق سے انھیں آزاد کے بعد بلایا گیا۔ کلیم عاجز مائک پر آئے، بغیر کسی جذبے، بغیر کسی تمہید اور کوئی خاص ارادے سے انھوں نے اپنی غزل شروع کی:

کلیجہ تھام لو رودادِ غم ہم کو سنانے دو
تمھیں دُکھتا ہوا دل ہم دکھاتے ہیں دکھانے دو
اسی کے دم سے تھوڑی روشنی ہے خانۂ دل میں
بجھاتے کیوں ہو شمعِ آرزو کو جھلملانے دو
یہ بجلی اس دلِ خوابیدہ کو اک تازیانہ ہے
مری محرومیوں پر آسماں کو مسکرانے دو
سنا ہے عشق کی معراج پنہاں ہے شہادت میں
چھری لاؤ ہمیں بھی اپنی قسمت آزمانے دو
نہ داغ آئے گا اپنے دامنِ حسنِ طبیعت پر
وفا پر جو مری تہمت لگاتے ہیں لگانے دو
زمانہ صبر کر لیتا ہے عاجز ہم بھی کر لیں گے
خلش دل کی مٹا لینے کو دو آنسو بہانے دو

کلیم عاجز کے دیرینہ دوست غلام سرور جوان کی غزلوں پر جھوم جھوم کر داد دیا کرتے تھے، مگر آج اس غزل (درج بالا) کو سننے کے بعد وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ غلام سرور خاموش تھے مگر پورا مجمع ان کا کام کر رہا تھا۔ "واہ....... وا.......... سبحان اللہ.......... سبحان اللہ۔" کے شور سے چھت پٹی جا رہی تھی اور وقفے وقفے کے بعد یہ آواز بلند ہو رہی تھی، "کیا دندان شکن جواب دیا ہے........... سبحان اللہ کیا جواب دیا ہے"

کلیم عاجز جواب دینے کے نیت سے غزلیں نہیں پڑتے تھے۔ ان کی شاعری کا ایک خاص رنگ و آہنگ ہے جس کے زیر اثر غزلیں کہتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ آزاد کا وطن لائل پور تھا جو چھوٹا تو انھوں نے ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا۔ کلیم عاجز کا وطن لوٹا گیا، احباب قتل کیے گئے تو انھوں نے ہجرت نہیں کی، نقل مکانی نہیں کی بلکہ اپنی جلی ہوئی بستی اور جلے ہوئے مکان کی خاکستر سے غزل کی چنگاریاں نکالی اور شاعری کے افق پر سجا دیں۔

کلیم عاجز کی غزل کے بعد سامعین کا respond ملاحظہ کرتے ہوئے بہ ظاہر جگن ناتھ آزاد مسکرا رہے تھے، مگر ان مسکراہٹوں کے پس پردہ اضطراب کا بحر ذخار موجزن تھا۔

1962 میں کلیم عاجز نے لال قلعے کے مشاعرے میں سامعین کو اپنی غزل سے مسحور کیا تو وہیں پر موجود علی گڑھ مسلم یونورسٹی طلبہ کے سیکریٹری یونین بصیر احمد خان نے کلیم عاجز سے وعدہ لے لیا کہ واپسی میں علی گڑھ ہوتے ہوئے پٹنہ کو تشریف لے جائیں اور یونین کے مشاعرے میں بھی شرکت فرمائیں۔ کلیم عاجز علی گڑھ گئے، مشاعرے میں شریک ہوئے۔ بصیر احمد خان نظامت کے فرائض

انجام دے رہے تھے اور کرنل بشیر حسن زیدی مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے تقریباً سبھی چوٹی کے شعراء موجود تھے۔ راہی معصوم رضا صدر کے بغل میں تشریف فرما تھے۔ یہ وہی راہی معصوم رضا تھے جنھوں نے کلیم عاجز کے ساتھ پٹنہ اور کلکتہ کے دو تین مشاعرے میں شرکت کی تھی، اور کلیم عاجز کے سامنے جن کا چراغ نہ جلا تھا، شاید اس وجہ سے وہ کلیم عاجز سے نالاں تھے۔

ناظمِ اجلاس نے کلیم عاجز کا نام پکارا تو راہی معصوم رضا کو موقع مل گیا۔ کلیم عاجز کے بعد وہ بھی مائک پر آگئے، چونکہ وہ بہاری اور غیر بہاری طلبہ کی کش مکش کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مائک پر آئے اور کلیم عاجز کا یوں تعارف کرایا:

''جناب کلیم عاجز صاحب بہار کے مشہور شہر عظیم آباد سے تشریف لائے ہیں۔''

پھر کیا تھا، ایسا لگا کہ کسی نے بارود کے ذخیرے میں آگ لگا دی ہو۔ اس جملے کو سننے کے بعد بہاری اور غیر بہاری طلبہ کا تناؤ شدت اختیار کر گیا۔ لڑکے ہوٹنگ، شور شرابا اور ہنگامہ کرنے لگے ساتھ ہی آوازیں کسنے اور فقرے چست کرنے لگے۔ کلیم عاجز کا ایسا استقبال دیکھ کر بہاری طلبہ بھی بھڑک گئے۔ جن میں سرخیل، ارشد علی اور ان کے ساتھیوں نے مشتعل ہو کر کہیں سے لاٹھی ڈنڈے کھینچ لائے، قریب تھا کہ تصادم ہو جاتا، پیش از تصادم صدر جلسہ کرنل حسن زیدی اور دوسرے اساتذۂ یونیورسٹی اسٹیج کے سامنے آئے اور مجمع کو پیار اور قاعدے سے سمجھانے لگے۔ مشتعل بہاری طلبہ کو بٹھایا اور عام مجمع کو سنجیدگی و شرافت برقرار رکھنے کی ترغیب دی۔ اس کے بعد مشہور شاعر سلام مچھلی شہری مائک پر آئے اور بڑے مستحسن انداز میں کلیم عاجز کا تعارف کرایا، جو واقعی تعارف ہوتا ہے جبکہ اس ہنگامے کو دیکھ کر کلیم عاجز نے غزل پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا لیکن سلام مچھلی شہری کی ترغیب پر انھوں نے اپنے حافظے سے بے قصد بے ارادہ ایک غزل شروع کی:

تم تو بے درد ہو بے تابیِ غم کیا جانو
اہل دل پر جو گذرتے ہیں ستم کیا جانو
شمع کیوں جلتی ہے سرتا بہ قدم کیا جانو
ہائے کیا چیز ہے مجبوریِ غم کیا جانو
تم سے ناحق ہے مجھے چشمِ وفا کی امید
تم بھلا شیوۂ اربابِ کرم کیا جانو
رسن و دار کو خاکِ کفِ پا بھی نہ ملا
کس جگہ اہل جنوں کا ہے قدم کیا جانو

کلیم عاجز کے ان اشعار نے مشتعل ماحول پر گویا شبنم کی بارش کر دی۔ غزل سننے سے پہلے جہاں شور و غوغا سے چھت پٹی جا رہی تھی وہیں خاموشی کی فضا قائم ہو گئی۔

1961 سے 1972 تک تواتر کے ساتھ کلیم عاجز لال قلعے کے مشاعرے میں شریک ہوتے رہے۔ لال قلعے کے مشاعرے کی نسبت سے ان کی ایک بہت مشہور غزل:

آنسوؤں کی مے بنی زخموں کا پیمانہ بنا
سیکڑوں میخانے اجڑے ایک میخانہ بنا
شاخِ گل کی چھاؤں میں گلچیں ہیں اب آرام سے
دشمنِ خانہ ہی آخر صاحبِ خانہ بنا

لال قلعے کی مناسبت سے اس غزل کا نام 'لال قلعہ' ہو گیا، جس کی بہت فرمائش کی گئی اور جو کئی مرتبہ لال قلعے میں سنائی گئی۔ 1971 میں لال قلعے کے مشاعرے میں انھوں نے اپنی ایک مشہور غزل پڑھی:

کلیم عاجز کی شاعری پر عصیت اور سیاست کا الزام لگایا جاتا ہے۔ حفیظ بنارسی، جنھوں نے ان کے ساتھ تقریباً تین دھے تک مشاعرے پڑھے۔ کلیم عاجز کے ساتھ جس مشاعرے میں ہوتے تو حفیظ کے اشعار پر 'سبحان اللہ' اور کلیم عاجز کے اشعار پر 'ہائے اللہ' کی آوازیں مجمع سے آتی تھیں۔ کہاں کہاں کلیم عاجز کی شاعری میں کش مکش و تصادم کو دکھایا جائے ان کی پوری شاعری میں کشا کش کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بالآخر کچھ متفرق اشعار دیے جا رہے ہیں، جن سے تہذیبی کش مکش کو سمجھنے اور محسوس کرنے میں مدد ملے گی۔

بلاتے کیوں ہو عاجز کو بلانا کیا مزا دے ہے
غزل کم بخت کچھ ایسی پڑھے ہے دل ہلا دے ہے
تیرے ہاتھوں کی سرخی خود ثبوت اس بات کا دے ہے
کہ جو کہہ دے ہے دیوانہ وہ کر کے بھی دکھا دے ہے
غضب کی فتنہ سازی آئے ہے اس آفتِ جاں کو
شرارت خود کرے ہے اور ہمیں تہمت لگا دے ہے
مری بربادیوں کا ڈال کر الزام اوروں پر
وہ ظالم اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر مسکرا دے ہے

ایک حساس شاعر یا ادیب سماج میں رونما برائیوں کا جب مشاہدہ کرتا ہے تو اسے اپنی تخلیقات میں پیش کر دیا کرتا ہے۔ یہی کام کلیم عاجز نے بھی کیا۔ کلیم عاجز اصلاً غزل کے شاعر تھے، باوجود اس کے انھوں نے موقع بہ موقع نظمیں اور نعت پاک بھی لکھی ہیں۔

مظلوم فلسطینیوں پر یہودیوں کے مظالم، جنگ اردن اور خانۂ کعبہ میں حجازی کی کسی شدت پسند جماعت کے حملے اور اس سے پیدا شدہ کشاکش کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے:

لے کے اردن کے جوانانِ بنی ہاشم کا
حوصلہ آئے ہیں دم آئے ہیں خم آئے ہیں
لے کے ہم پیش کشِ خدمت عالی کے لیے
تحفۂ خونِ شہیدانِ حرم آئے ہیں
بیتِ مقدس کے غریب الوطنوں کا لے کر
جگر سوختہ و دیدۂ نم آئے ہیں

کلیم عاجز کی شاعری پر عصیت اور سیاست کا الزام لگایا جاتا ہے۔ حفیظ بنارسی، جنھوں نے ان کے ساتھ تقریباً تین دہے تک مشاعرے پڑھے۔ کلیم عاجز کے ساتھ جس مشاعرے میں ہوتے تو حفیظ کے اشعار پر 'سبحان اللہ' اور کلیم عاجز کے اشعار پر 'ہائے اللہ' کی آوازیں مجمع سے آتی تھیں۔

کہاں کہاں کلیم عاجز کی شاعری میں کش مکش و تصادم کو دکھایا جائے ان کی پوری شاعری میں کشاکش کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بالآخر کچھ متفرق اشعار دیے جا رہے ہیں، جن سے تہذیبی کش مکش کو سمجھنے اور محسوس کرنے میں مدد ملے گی۔

تلہاڑہ گاؤں کو وہ اپنی جنت ارضی کہا کرتے تھے، اس گاؤں کا حال اور اس کش مکش کو بھی دیکھیے:

جب سے ترے دیوانے نکلے تری محفل سے
کیا حال ہے محفل کا دیکھا نہیں جائے ہے

ہجرت کا درد ملاحظہ فرمائیے جب مسلمان بے یار و مددگار، بے راحلہ و زادِ سفر نامعلوم منزل کی طرف کوچ کر گئے:

ایسا بھی کوئی قافلہ دیکھا ہے آپ نے
جو موسمِ بہار میں گلزار سے چلے

وطن کی محبت کا خیال گزرتا ہے تو یوں بول اٹھتے ہیں:

مر کر بھی دکھا دیں گے ترے چاہنے والے
مرنا کوئی جینے سے بڑا کام نہیں ہے

■

Ansar Ahmed, Phd research Scholar, Room No: 204, Old Boy's Hostel MANUU, Gachibowli, Hyderabad - 500032

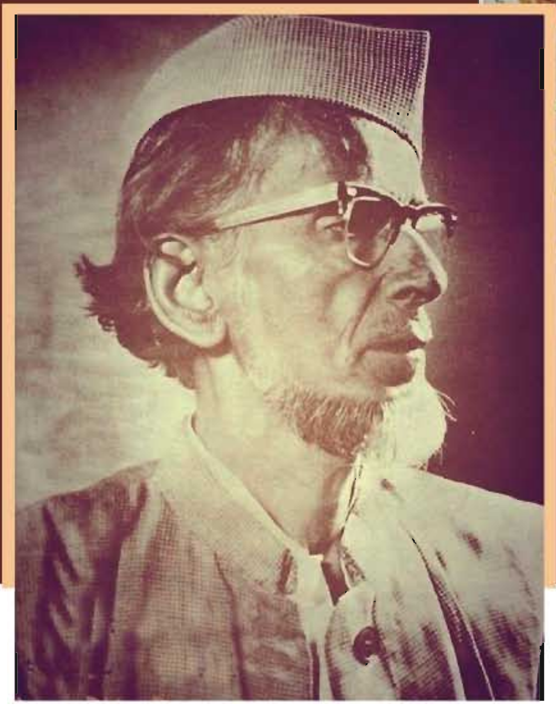

اردو غزل میں کلیم عاجز کا امتیاز

مجاہد اسلام

ایک سچا شاعر اپنے دور کا رہنما و قائد ہوتا ہے۔ اچھائی و برائی کو پیش کرنا اس کا فرض عین ہے۔ اس کا کام عوام کو باخبر کرنا، ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنا، اچھائیوں کی طرف عوام کو دعوت دینا اور برائیوں سے رکنے کی صلاح دینا ہے۔ کلیم عاجز ایک مسلمان ہیں اور ہر مسلمان کا فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے۔ اس فرض کو کلیم عاجز بخوبی ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر شعرا و ادبا کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ حکومت کی گرفت میں نہ آجائیں۔ اس وجہ سے شعرا طرز اظہار میں چالاکی و فن کاری برتتے ہیں تاکہ پکڑ سے بچ جائیں۔ یہ فنکاری کلیم عاجز کے اندر بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے طنز کی دھار بہت تیز ہے مگر گرفت میں کبھی نہیں آئے۔ بلکہ حکومت ہند نے انھیں پدم شری ایوارڈ سے نوازا۔

کلیم عاجز کی شاعری درد کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں سچائی، حقیقت وصداقت ہے۔ وہ کہتے ہیں:

حقیقتوں کا جلال دیں گے صداقتوں کا جمال دیں گے
تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دیں گے

واقعی جو انھوں نے کہا کر دکھایا۔ اردو میں حقیقی شاعری کی مثال میر، حالی، فیض اور اقبال کے بعد اگر کسی کو دی جاسکتی ہے تو وہ ہیں کلیم عاجز۔ ان کا کلام تصنع سے پاک ہے۔ کلیم عاجز کی شاعری کا غم کیسا ہے اس شعر سے محظوظ ہوں:

غم جاں بھی غمِ جاناں بھی غمِ دوراں بھی
ایک دل کے لیے سامان ہیں دنیا بھر کے

کلیم عاجز کا قلم بے خوف چلتا ہے مگر سلیقے کے ساتھ چاہے غزل رقم کر رہے ہوں یا نظم ان کی بے باکی کی تعریف پروفیسر عبدالحق صاحب یوں کرتے ہیں:

''کچھ شعرا کے چند اشعار سے داستانِ شہادت قلم بند نہیں کی جاسکتی۔ ہاں اس سیاق میں کلیم عاجز کا کلام اس خون آشام درد کا عہد نامہ قرار دیا جائے گا اور دوسرے تمام شاعر و صورت گر و افسانہ نویس سکوتِ قلم کے سبب مصلحتوں کے مجرم اور مذموم قرار پائیں گے۔ کلیم عاجز کی اس پہچان کے لیے ہم ممنون قلم ہیں کہ ہماری صفوں میں سماجی احساسات کی دل گرفتگی کا ایسا شعور دینے والا ایک فنکار موجود ہے جو مشاعروں، مسجدوں، محراب و منبر تک شرف رسائی رکھتا ہے۔''

('داغ دروں کا شاعر' مضمون نگار: پروفیسر عبدالحق، ص 71)

پروفیسر عبدالحق کے اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے شعرا و ادبا مظالم کے خلاف آواز بلند نہیں کر رہے ہیں۔ شاذ و نادر بے باک قلم کار پیدا ہوتے ہیں۔ کلیم عاجز چپ و خاموش رہنے والے قلم کار اس لیے نہیں ہیں کیوں کہ وہ قومی اور انسانی فرض ادا کرنے میں ہچکچاتے نہیں ہیں۔ وہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل
ہم مسافر ہیں بہت دور کے جانے والے

کلیم عاجز سیاسی شخص نہیں ہیں۔ ان کا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں رہا ہے اور نہ کسی تحریک سے کبھی جڑے مگر اُن کی شاعری میں سیاست ہی اہم موضوع ہے۔ کلیم الدین احمد ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں تحریر کرتے ہیں:

''ان کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی، سیاسی باتیں غزل کی زبان میں ہیں۔ ان کے شعروں میں 'پھول' بھی ہیں اور 'پتھر' بھی۔ اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول بن جاتے ہیں۔''

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا، ص 33)

واقعی کلیم عاجز کی غزلوں میں انسانی جذبات کا عکس ہے، پرتو ہے مگر ان کی غزلوں میں ایک طنزیہ پہلو بھی ہے جو خالص سیاسی لوگوں سے کیسے روبرو ہوتے ہیں، انھیں کیا کہہ کر پکارتے ہیں، انھیں ہی اپنی غزل کا محبوبۂ فن بناتے ہیں، وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ کلیم عاجز سفرنامۂ 'امریکہ اک دیسی اک بدیسی' میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ایک غزل جسے میں نے وزیر اعظم ہند کو مخاطب کر کے دہلی میں پڑھا تھا جس کا مطلع یہ ہے:

وہ ستم نہ ڈھائے تو کیا کرے اُسے کیا خبر کہ وفا ہے کیا
تو اسی کو پیار کرے ہے کیوں یہ کلیم تجھ کو ہوا ہے کیا؟

کلیم جانتے ہیں کہ وہ ظالم ہے، ستم گر ہے، حکومت کرنے کے لیے جائز کام میں اکثریت کا ساتھ دے رہا ہے اور ناجائز کام میں بھی اکثریت کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس کے باوجود اُس کو غیرت دلانے کے لیے اُسے ایسا معصوم کہتے ہیں جیسا کہ اُسے معلوم ہی نہ ہو یہ ان کا اندازِ گفتگو ہے جس سے ستمگر کو برا بھی نہیں لگتا اور شاعر اپنی بات کہہ ڈالتا ہے۔

کلیم عاجز انگریزی نقاد کالرج کے معتقد ہیں۔ 'میری زبان میرا قلم' میں کلیم عاجز کالرج کا قول یوں نقل کرتے ہیں:

"Sweetest song comes of the saddest heart."

(میری زبان میرا قلم، 468)

اس قول سے بات واضح ہوجاتی ہے کہ غزل مغموم دلوں کی آواز ہے۔ کلیم عاجز کے ذاتی درد سے ان کی شاعری جنم لیتی ہے۔ شاعر جب درد میں تڑپتا ہے، بے چین ہوتا ہے تو ان کے دل سے ایک پکار آتی ہے جس کا نام غزل ہے۔ ان کی شاعری کے کئی رنگ ہیں۔ ان میں سے ایک رنگ حب الوطنی کا ہے۔ اس سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم اسی گلی کی ہیں خاک سے، یہیں خاک اپنی ملائیں گے

نہ بلائے آئے ہیں آپ کے، نہ نکالے آپ کے جائیں گے

عزیز کیوں نہ ہو خاکِ رہِ وطن مجھ کو
یہ میرے ساتھ مرے پیرہن میں آئی ہے

اب بھی کوئی وفادار کہتا ہمیں
سہہ گئے بے وفائی کا الزام تک

ہم تو اس دردِ جفا میں بھی ہیں اتنے وضع دار
خواب میں بھی بے وفائی کا خیال آتا نہیں

مذکورہ اشعار سے کلیم عاجز کی حب الوطنی آشکار ہوتی ہے۔

طرزِ اظہار کے علاوہ ان کے اندر دوسری چیز یہ ہے کہ وہ سیاست کے تمام نشیب وفراز سے واقف ہیں۔ وہ سیاسی آدمی نہیں ہیں مگر ہندوستانی سیاست سے باخبر ہیں، واقف ہیں۔ کسی بھی چیز پر طنز کرنے کے لیے اُسے جاننا ضروری ہوتا ہے اور پھر اپنے دفع کے لیے بھی ہنر چاہیے۔ کلیم عاجز سیاست سے واقفیت بھی رکھتے ہیں اور دفع کرنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ کلیم عاجز ایسے رہنماؤں وحکمرانوں پر طنز کرتے ہوئے کیا ہی بہتر اشعار کہے ہیں:

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

اس ناز اس انداز سے تم ہائے چلو ہو
روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو

شمشیر کبھی قتل کی چل ہی نہیں سکتی
جب تک تری چتون کا اشارہ نہیں ہوتا

یہ فتنے جو ہر اک طرف اٹھ رہے ہیں
وہی بیٹھا بیٹھا شرارت کرے ہے

یعنی کلیم عاجز کی مجبوری ہے کہ وہ سیاست وسیاسی لوگوں کو چھیڑتے ہیں اور کبھی 'ستم گر' تو کبھی 'پیارے' کہتے ہیں اور اپنی شاعری میں ظالم زمانہ کو محبوب بناتے ہیں۔ اُس ظالم کے ظلم سے نفرت کرتے ہیں اور پھر اُسی انسان سے محبت بھی کرتے ہیں اور پُرامید ہیں کہ وہ کبھی نہ کبھی اپنی عادت سے باز آجائیں گے۔ اِسی لیے اُسی گلی ودیار میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے حکمراں طبقے نے ان کی گرفت نہیں کی بلکہ ہمدردی جتائی ہے۔

حکمراں طبقے کے ظلم وستم کے ردعمل میں کلیم عاجز غزل کہتے ہیں۔ جب جب ان کو دکھ پہنچتا ہے تب تب ان کے قلم سے صفحۂ قرطاس کالا ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے یوں کہا ہے:

جہاں درد ملا اٹھایا پھر اُسے غزل میں ڈھالا
یہی دردِ سر خریدا یہی زخم ہم نے پالا

کلیم عاجز جس زبان میں سوچتے ہیں اُسی زبان میں لکھتے ہیں اور بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ عام ضرورتوں کو پورا کرنے والی زبان روز مرہ کہلاتی ہے۔ اردو شاعری میں سب سے پہلے روزمرہ کو شاعری کا روپ میر تقی میر نے دیا اور اِس عہد میں روزمرہ کو شاعری کی زبان بنانے والا کوئی واحد شاعر ہے تو وہ کلیم عاجز ہے، اس سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کلیم نے میر کی پیروی کی ہے؟ یہ قابل غور ہے۔ کلیم عاجز نے کس حد تک میر کی پیروی کی ہے اور کیوں کی ہے اس کا جواب وہ خود یوں دیتے ہیں:

"اگر پیروی میرے مزاج میں ہوتی تو میں بہ آسانی غالب کی پیروی کرسکتا تھا۔ لیکن اتباع میری خمیر فطرت کے خلاف ہے۔ میر سے کسی قدر جو مشابہت ہے، یہ مشابہت فن سے نہیں زندگی سے آئی ہے، جس کا شعوری احساس بہت بعد میں ہوا۔" (وہ جو شاعری کا سبب ہوا، ص71)

روزمرہ کا بر محل استعمال اگر اردو شاعری میں کسی نے کیا ہے تو وہ ہیں کلیم عاجز اور میر تقی میر۔ دونوں ماہر فن ہیں۔ دونوں شاعروں کی زبان عام فہم، سلیس اور شیریں ہیں۔ ان کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں۔ غزل (تقریباً 470) کے علاوہ انھوں نے 17 نعتیہ کلام، 49 سہرے، 37 رباعیاں اور 81 نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی غزلوں کی لفظیات، اصطلاحات و تراکیب قدیم ہیں مگر فکر میں ندرت ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری پرانی بوتل میں نئی شراب کی سی ہے۔

ہر انسان اپنا ہم خیال انسان کھوجتا ہے۔ کیونکہ ہم خیال وہم مزاج شخص کے ساتھ انسان کی زندگی اچھی گزرتی ہے۔ اسی لیے کلیم عاجز نے اردو شاعری میں میر کو اپنا ہم خیال بنایا ہے اور ہر جگہ اس کا سچے دل سے اقرار کیا ہے۔ روزمرہ کا ایسا استعمال ہے کہ وہ شاعری کا حصہ بن چکا ہے۔ گویا شاعری اور بول چال کی زبان میں شیر وشکر جیسی حالت پیدا ہوگئی ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ ان کے معاصرین ان کی شاعری کی زبان کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

فراق گورکھپوری اپنے تاثرات ایک خط کے ذریعے یوں ظاہر کرتے ہیں:

"اتنی ڈھلی ہوئی زبان، یہ گھلاوٹ، لب ولہجہ کا یہ جادو جو صرف انتہائی خلوص سے پیدا ہوسکتا ہے اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا تھا، میں ان کا کلام سن کر خود اپنا کلام بھول گیا۔"

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا، سرورق کا بیک)

واقعی فکر کی صداقت ہی سے ان کی زبان میں تاثیر پیدا ہوئی ہے۔ ان کے استاد علامہ جمیل مظہری ان کی شاعری کے رنگ تغزل کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"اندازِ فکر میں جدت اور اندازِ بیان میں قدامت کلیم عاجز کے تغزل کا مخصوص آرٹ ہے جو سیکڑوں شعرا کے ہزاروں اشعار کے ہجوم میں جانا اور پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ان کے عہد کے سماجی اور سیاسی تصورات بڑے سلیقۂ فن کے ساتھ اپنے کو نمایاں کرتے ہیں۔" (ایضاً، ص39)

علامہ جمیل مظہری کا بیان صد فی صد صحیح ہے ان کی شاعری کے اندازِ فکر میں جدت اور انداز بیان میں قدامت ہے وہ اپنے زمانے کے مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں اور اپنے مسائل کو طرزِ اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح غم جاں، غم جاناں اور غم دوراں پیش کرتے ہیں۔

کنہیالال کپور ان کی زبان کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

"ایک غزل گو کے لیے سب سے اہم مسئلہ زبان کا ہوتا ہے۔ نظم کی اپنی زبان ہے، غزل کی اپنی۔ غزل کی زبان جتنی سلیس اور ڈھلی ہوئی ہوگی، اتنا ہی غزل کا جادو سر چڑھ کر بولے گا۔ اس کے برعکس، اگر وہ ثقیل اور غیر مانوس ہوگی، غزل گو طلسم باندھنے میں ناکام رہے گا۔ کلیم عاجز غزل کی زبان سے کماحقہ واقف ہیں۔ انھیں 'روزمرہ' کہا جاتا ہے اور جس میں خاص وعام اہلِ زبان تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ گھلاوٹ اور گداز کی خاطر انھوں نے وہ الفاظ استعمال کرنے سے بھی گریز کیا ہے جنھیں کچھ اساتذہ نے متروک قرار دیا ہے۔" (ایضاً، ص39)

روزمرہ کا بر محل استعمال اگر اردو شاعری میں کسی نے کیا ہے تو وہ ہیں کلیم عاجز اور میر تقی میر۔ دونوں ماہر فن ہیں۔ دونوں شاعروں کی زبان عام فہم، سلیس اور شیریں ہیں۔

ان کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں۔ غزل (تقریباً 470) کے علاوہ انھوں نے 17 نعتیہ کلام، 49 سہرے، 37 رباعیاں اور 81 نظمیں تخلیق کی ہیں۔

ان کی غزلوں کی لفظیات، اصطلاحات وتراکیب قدیم ہیں مگر فکر میں ندرت ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری پرانی بوتل میں نئی شراب کی سی ہے۔ ان کے کلام سے اردو ادب میں اضافہ ہوا ہے جس طرح میر، غالب، اقبال، فیض و دیگر نامور شعرا کی گنتی صف اول کے شعرا میں ہوتی ہے، ان کی بھی ہونی چاہیے۔ میں اپنی بات کلیم عاجز کے مقبول شعر پر ختم کرتا ہوں:

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے

Dr. Mujahide Islam, 220, Kaveri Hostel, JNU, New Delhi - 110067

محمد ضمیر رضا

کلیم عاجز کی خودنوشت: ایک جائزہ

بہار کی خودنوشتوں میں ایک اہم خودنوشت کلیم احمد عاجز کی 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' بھی ہے۔ کیونکہ اس خود نوشت میں جو اسلوب اور طرز اظہار استعمال کیا گیا ہے وہ نہایت ہی دلکش اور پر لطف ہے جس سے اس خودنوشت کی قدرومنزلت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

کلیم صاحب کی خودنوشت جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی پرایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب محض آپ بیتی نہیں ہے بلکہ ایک بہادر مخلص، انسان دوست فنکار کی محبت اوراخلاق، ہمدردی اور شفقت کا ملاجلا ایک ایسا نایاب تحفہ ہے جو بناوٹ، دکھاوے اور جھوٹ کی خامیوں سے پاک ہے۔

کلیم عاجز کی خودنوشت کی ابتدا ان کے کلکتہ میں دوران قیام کے کچھ واقعات سے ہوتی ہے اور یہ تمام واقعات 1936 کے آس پاس کے معلوم پڑتے ہیں جن میں سب سے پہلے غفار بھائی کا ذکر ہے جو اخبار اور رسالہ فروخت کرنے والے ایک ایسے انسان ہیں جنھیں کلیم صاحب بے حد عزیز رکھتے ہیں اور یہی محبت تھی کہ غفار بھائی کے ساتھ گزارے ہوئے تمام لمحوں کو ہو بہو درج کرتے چلے گئے ہیں حالانکہ آپ نے اپنی یادداشت کو کمزور بتایا ہے۔ کہتے ہیں میرا ٹیلی فون نمبر مجھے خود یاد نہیں ہے مگر حیرانی اس بات کی ہے کہ غفار میاں کے ساتھ گزرے ہوئے ہر واقعے کو کتنی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہم لوگ کھڑے کھڑے گھنٹے دو گھنٹے گزار دیتے۔ وہ باتیں کرتے اور میں سنتا۔ میں سمجھتا ہوں جتنا کچھ ان کے دل میں تھا ان رسالوں میں بھی نہ ہوگا۔''

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، ص 4)

حیرت کی بات ہے کہ کلیم صاحب نے 1936 سے 1941 تک کلکتہ کی یادوں میں سے صرف غفار میاں کی باتوں کو ہی پیش کیا ہے۔ ان پانچ سالوں میں ممکن نہیں کہ کلیم صاحب کے رفقا میں کوئی اور نام نہیں ہو مگر خودنوشت میں مصنف کو یہ آزادی ہے کہ وہ جس شخص کو چاہے اپنے ساتھ پیش کرسکتا ہے۔ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ خودنوشت نگار اپنی وابستگی کا اظہار مشہور اور بڑی شخصیتوں کے ساتھ کرتے ہیں، مگر کلیم عاجز نے اس روایت سے یکسر انحراف کیا ہے اور ایک معمولی رسالہ فروخت کرنے والے غفار میاں کی تمام سرگزشت کو خلوص سے بیان کیا ہے۔ یہ کلیم صاحب کی اپنی انفرادیت اور اپنا انداز ہے جس میں صداقت اور والہانہ محبت کی جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔

ویسے آپ خود اپنے مزاج کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ابتدائے ہوش سے ہی اپنے مزاج کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے رغبت اور اس رغبت کے نتیجے میں سروکار اور تعلق ان لوگوں سے رہا جو کسی نہ کسی پہلو سے ادب و شاعری سے متعلق تھے۔ اخبار والے، کتاب فروش، مصنّفین اڈیٹر، تھیٹر کے ایکٹر، صحافی ڈرامہ نویس، شاعر وغیرہ وغیرہ۔ (جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، ص 5)

کلکتہ کے ہریسن روڈ اور چیت پور چوراہے سے تھوڑی دور اشفاق صاحب کی کتاب کی دکان پر کلیم صاحب کا اکثر آنا جانا ہوتا تھا۔ آپ نے پہلے ہی یہ بتا دیا ہے کہ ان کو کتاب والوں سے رغبت تھی۔ لہٰذا آپ کی زندگی میں کتاب اور رسائل فروخت کرنے والوں کا ساتھ خوب رہا جسے جا بجا آپ نے اپنی آپ بیتی میں بھی رقم کیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی کلیم صاحب کی خاکساری کا عالم یہ ہے کہ یہ ابتدا ہی میں ان لوگوں کی بات کرتے ہیں جن کی زندگی مصیبتوں اور پریشانیوں سے بھری رہی ہے۔ کلیم صاحب ایسے لوگوں کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہی نہیں بلکہ شریک غم بھی رہے ہیں۔

کلیم صاحب نے اپنی آپ بیتی کا نام 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' رکھا۔ ظاہر ہے اس نام کے انتخاب کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ہوسکتا ہے مصنف کو خوشبو سے بے حد قربت ہو یا مصنف کی زندگی خوشبو کی طرح گزری ہو مگر پہلی نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی گزری ہوئی زندگی خوشبو سے پر تھی گویا خوشبو کی مانند تھی۔ پر اس خوبصورت اور شاداب زندگی کے کھوجانے کا غم آپ کو شدید ہے انہیں گم شدہ تہذیب وثقافت کی تلاش ہے اور آنکھیں وہ پرانی قدروں اور خوشبوؤں کے گم ہوجانے پر نمناک ہیں۔ آپ نے اس درد کا اظہار یوں کیا ہے:

اس انجمن میں ہم بھی عجب وضع دار ہیں
دل ہے لہو لہان جبیں پر شکن نہیں

لوگ حسن حسن کی بہت رٹ لگاتے ہیں ہر زبان پر ہر لمحہ اس کے کرشموں کے ذکر۔ اس کے جلووں کی باتیں۔ اس کی تمناؤں کی داستانیں اس کی آرزوؤں کے افسانے رہتے ہیں۔

یہ کیا حسن ہے کہ صرف پلکوں کی چلمن سے چھن کر نگاہ تک آسکتا ہے دل تک پہنچتا ہی نہیں۔ یہ کیا حسن ہے کہ دل برف ہو رہے ہیں ذرا گرمی پہنچا ہی نہیں سکتا یہ کیا حسن ہے کہ دل پر کوئی نشتر لگا ہی نہیں سکتا؟ یہ کیا حسن ہے کہ دل پر کوئی تیر چلتا ہی نہیں؟ یہ کیا حسن ہے کہ آنکھوں کے آگے بجلیاں کوند

رہی ہیں اور دلوں میں اماوس کی رات کروٹیں لے رہی ہے۔ یہ کیا حسن ہے کہ آنکھیں روشن ہیں اور دل اندھیرا ہے؟ لاکھوں من صابن روز بک رہے ہیں اور ہزاروں ٹن کریم، اسنو، لیونڈر، روغن اور پاؤڈر بازاروں میں روزانہ لٹ رہے ہیں سرخیاں بہہ رہی ہیں خوشبوئیں برس رہی ہیں۔ نزاکتوں کی ریل پیل ہے ... کہاں ہیں وہ حسن کہاں ہے عشق؟ جس کی داستانیں اب کتابوں میں بھی نہیں۔ جو کتابوں میں ہے وہ اصل کم ہے اصل تو لوگ اپنی زندگیوں میں چھپا کر لے گئے۔ کچھ پرچھائیاں چھوڑ گئے ان کے حسن کی وہ بجی کچھی ہوئی پرچھائیاں جو وہ چھوڑ گئے ہیں آج بازاروں میں گلیوں میں سڑکوں پر کوچوں میں محلوں میں اور بالا خانوں میں سجی دکانوں، آراستہ محفلوں میں برسات کی موسلا دھار بارش کی طرح برستے ہوئے حسن سے، بہت زیادہ گراں بہا بہت زیادہ گراں وزن ہیں۔"

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، ص 7 تا 9)

کلیم عاجز صاحب نے دس بارہ صفحات پر اپنے خاندان کے احوال اور بزرگوں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی تفصیل پیش کی ہے جس میں خاص طور سے واعظ نانا اور بڑی نانی کا ذکر ہے نانی کے ساتھ کی ہوئی گفتگو کو ہو بہو پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی نانی کے یہاں جناتوں کا قیام اور ان کی شرارتوں کو بھی قلمبند کیا گیا ہے۔ اطہر نانا کو بھی کلیم صاحب نے فراموش نہیں کیا ہے بلکہ تین سال کی عمر میں بھی اطہر نانا کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ اپنی بڑی بہن محمودہ، بڑے بھائی جنھیں کلیم صاحب 'پری بھیا' کہتے ہیں کا بے شمار تذکرہ ملتا ہے۔ جو ایک بہادر انسان تھے۔ جن کے جسم کی طاقت اور شجاعت کے ڈھیر سارے واقعات کو آپ نے بیان کیا ہے۔ بالخصوص ڈاکوؤں اور چوروں کے ساتھ ہوئی لڑائی کے دوران 'پری بھیا' کے زخمی ہونے سے لے کر ان کی بیماری اور گھر میں غم کے ماحول کا ذکر روح فرسا انداز میں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کی بہن محمودہ کی شادی کے تین سال بعد انتقال نے کلیم صاحب کو بچپن میں تنہا کر دیا بلکہ بھائی جان کی موت کے غم سے بھی آپ باہر بھی نہیں ہوئے تھے کہ بہن کی موت نے انہیں وقت سے پہلے ہی سنجیدہ کر دیا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ان سب حادثوں کا ذکر نہایت ہی سنجیدگی، بردباری اور حلیمی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

کچھ واقعے ایسے بھی ملتے ہیں جن میں لاٹھی ڈنڈے سے لیس ان لڑائیوں کا ذکر ہے جن کے درمیان کلیم صاحب نے تعلیمی سفر شروع کیا تھا مکتب میں دوسرے مکتب کے لڑکوں کے ساتھ جھگڑے فساد کی ہو بہو تصویر پیش کی گئی ہے آٹھویں کلاس تک کلکتہ میں زیر تعلیم رہنے کے بعد پٹنہ مسلم اسکول میں داخلے کی سرگزشت بیان کرتے کرتے جمال گھونٹہ کھانے تک کا واقعہ بیان کر گئے ہیں۔ جب وہ خود کو مٹا دینے کی غرض سے جمال گھونٹہ کھاتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ کلیم صاحب جب کوئی بات یا واقعہ بیان کرتے ہیں تو وہاں سے ایک دوسرا قصہ شروع کر دیتے ہیں۔ اور پھر پہلے واقعہ پر واپس آ جاتے ہیں جس سے روانی و یکسوئی میں کمی پیدا ہوتی ہے۔ مسلم اسکول میں داخلے کے بعد کے کچھ واقعات نہایت ہی صاف انداز میں بیان کیے گئے ہیں جن میں سب سے دلچسپ واقعہ ماسٹر قدوس صاحب کے غلط شعر لکھنے پر کلیم صاحب کا درست کرنا اور پھر قدوس صاحب کا بے پناہ محبت سے نوازنا ہے۔

'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' میں کلیم صاحب کی کچھ عادتوں کا بھی ذکر ملتا ہے جس میں خاص طور سے ڈرامے پڑھنا اور تھیٹر میں جا کر ڈرامے دیکھنا شامل ہے۔ آغا حشر، منشی نازاں، منشی عباس، منشی رحمت علی منشی نرائن پرساد بیتاب، منشی

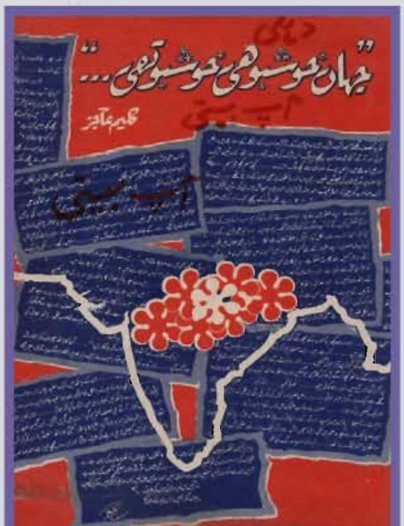

ہری کرشن جوہر وغیرہ کے ڈرامے آپ پابندی سے پڑھا کرتے تھے۔ کلکتہ کے الفریڈ اور الفنسٹن تھیٹر کے تمام ڈرامے دیکھتے تھے لیکن ایک ایسے شخص کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جس نے انھیں بار بار ڈرامے دیکھنے سے روکنے کی کوشش کی اور اس کے لیے انہیں طمانچے بھی رسید کیے۔ آج کئی سال گزرنے کے بعد کلیم صاحب پھر سے اس طمانچے کو قیمت ادا کر کے خریدنے کی بات کرتے ہیں چنانچہ کلیم صاحب کی زندگی کے کچھ ایسے گوشے بھی آپ بیتی میں آشکار ہیں جن سے ان کو قدم قدم پر حوصلے ملتے رہے ہیں۔

کلیم عاجز نے کلکتہ کی سڑکوں اور محلوں میں کچھ غریبوں مگر دبنگ لوگوں کے مزاج، خاندان اور ان کے کارناموں کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور افسوس زدہ ہیں کہ تاریخ ان گلیوں میں نہیں جھانکتی جن میں لوگ تو ضرور رہتے ہیں مگر وہ بہادر ہوتے ہیں وہ نہ ظلم کرتے ہیں اور نہ ظلم ہونے دیتے ہیں۔

کلکتہ کی سڑکوں پر پھر ایک بار عام انسان سے ٹکرا جانے اور اس کے حال دل سننے پر خود کو بھی اس کے غم میں شریک کرتے ہیں۔ بہار شریف کے رہنے والے غفور میاں جو ایک گویتے تھے اور کلیم صاحب کو ہارمونیم سکھاتے تھے۔ اس سے کلیم صاحب نے کئی راگ راگنیاں سیکھ لیں مثلاً اساوری، گندھاری، بھیروی، شام کلیا، بہاگ، میاں کی ٹوڑی اور دیس راگنی وغیرہ۔

کچھ سرگزشت پہلوانوں سے وابستگی کی بیان کرتے ہیں جو ان کی زندگی میں وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے پہلے ہی یہ بیان کر دیا ہے کہ ان کے خاندان میں اکثر لوگ پہلوان تھے گویا ان کے اندر بھی پہلوانوں سے رغبت موجود تھی۔ اس لیے گاما پہلوان، امام بخش، حمیدہ پہلوان، وغیرہ کے واقعات کو بڑی دلچسپی سے بیان کرتے ہیں۔

اس کے بعد کچھ واقعات دلچسپ ہیں جیسے ڈرامے کی لت سے والد محترم کا ناراض ہونا کلیم صاحب کا گھر سے نکلنا اور خودکشی کرنے کی کوشش سے پہلے ماں کا دیا ہوا تعویذ دیکھنا، اس میں 100 کا نوٹ پانا اور پھر خودکشی کے ارادے کو ترک کرنا وغیرہ آپ بیتی کو ڈرامائی حسن عطا کر دیتے ہیں۔

کلیم صاحب اپنا جو مضمون پہلی بار شائع کرواتے ہیں اس کی بھی ایک تاریخ رقم ہو جاتی ہے جس کا ذکر کلیم صاحب نے بڑے پر لطف انداز میں کیا ہے۔ ہوا یوں کہ غفور میاں کی پوری روداد کو مضمون کی شکل میں لا کر کسی رسالے میں شائع کروا دیا مگر کمپوزنگ کی غلطی کہیں کہیں رہ گئی۔ کلیم صاحب نے اس پرچے کی کئی کئی کاپیاں خریدیں اور اپنے دوست احباب کے نذر کیا اور غلطیوں کو سدھار کر نیچے یہ درج کر دیا کہ 'باز باز غلطیاں رہ گئی تھیں اسے درست کیا گیا ہے اس پر ان کے بہنوئی اکرام الحق مرحوم کا ایک خط کلیم صاحب کے نام ملتا ہے جو اس طرح تھا:

"بیشک 'باز باز' سے کام چل جائے تو بعض بعض لکھنے کی کیا ضرورت۔" (جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، ص 92)

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کلیم صاحب نے اپنی خود نوشت میں چھوٹی چھوٹی ایسی باتوں کا بھی ذکر کیا ہے جس میں ان کی رسوائی اور کمی کا اظہار پوشیدہ تھا۔ 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' کے کچھ صفحات پر اپنی شادی کے متعلق احوال درج کیے ہیں جس میں جہیز میں تلوار کی فرمائش کا دلچسپ واقعہ بھی شامل ہے پھر آگے یہ اپنے ٹھاٹ باٹ اور رہن سہن کے متعلق بھی بتاتے ہیں۔ ساتھ ہی اپنے مزاج سے روشناس کراتے ہیں۔

تقریباً دس بارہ صفحے پر کلیم صاحب نے اپنی بیماری کی سرگزشت لکھی ہے اور اس دوران ان کے ساتھ ان کے عزیز دوستوں کے واقعات درج ہیں جن میں خاص طور سے ان کے تیماردار خالہ زاد بھائی جناب مسعود الحسن جو ایک بہت بڑے نقاش تھے جنھوں نے کلیم صاحب کی بیماری کے دوران کلکتہ سے ان کے گھر واپس آنے کا پورا انتظام کیا تھا۔ گھر پہنچنے پر والد محترم کا کمزور جسم دیکھ کر اپنی حالت اور اس وقت کے پیش ہونے والے واقعات کو دردآمیز لفظومیں بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے ادھر کلیم عاجز خود بیمار اور ادھر ان کے والد ان سے زیادہ بیمار۔ دونوں ایک دوسرے کو یہ کہتے ہوئے نظر آرہے ہیں کہ میں بہت اچھا ہوں گویا دونوں ایک دوسرے سے اپنا درد چھپا رہے ہیں۔ بہر حال والد کی بیماری اور تیز ہوتی گئی آخر کار ان کو پٹنہ لایا گیا۔ کئی روز تک علاج چلا مگر شاید اوپر والے کو ان کا انتظار تھا اور اس نے ان کو اپنے پاس بلالیا۔

تقریباً دس بارہ صفحے پر کلیم صاحب نے اپنی بیماری کی سرگزشت لکھی ہے اور اس دوران ان کے ساتھ ان کے عزیز دوستوں کے واقعات درج ہیں جن میں خاص طور سے ان کے تیماردار خالہ زاد بھائی جناب مسعود الحسن جو ایک بہت بڑے نقاش تھے جنھوں نے کلیم صاحب کے بیماری کے دوران کلکتہ سے ان کے گھر واپس آنے کا پورا انتظام کیا تھا۔ گھر پہنچنے پر والد محترم کا کمزور جسم دیکھ کر اپنی حالت اور اس وقت کے پیش ہونے والے واقعات کو دردآمیز لفظوں میں بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے ادھر کلیم عاجز خود بیمار اور ادھر ان کے والد ان سے زیادہ بیمار۔ دونوں ایک دوسرے کو یہ کہتے ہوئے نظر آرہے ہیں کہ میں بہت اچھا ہوں گویا دونوں ایک دوسرے سے اپنا درد چھپا رہے ہیں۔ بہر حال والد کی بیماری اور تیز ہوتی گئی آخر کار ان کو پٹنہ لایا گیا۔ کئی روز تک علاج چلا مگر شاید اوپر والے کو ان کا انتظار تھا اور اس نے ان کو اپنے پاس بلالیا۔

”وہ راحت اور آسودگی نصیب ہورہی تھی کہ کھانے پینے سونے کی احتیاط ختم ہوگئی تھی...... آخر کے تین دن وہ بالکل بے ہوش تھے۔ دوائیں اور پانی بھی بڑی مشکل سے فرو ہورہا تھا۔...... میں ان سے کان میں کہتا...... کیسے ہیں ابا؟ اور کان ان کے لبوں سے لگاتا اور صاف آواز آتی...... اللہ کا شکر ہے بیٹا...... اچھا ہوں بیٹا۔ تقریباً ہر دس پندرہ منٹ پر میں یہ سوال کرتا اور ہر بار مجھے یہ جواب ملتا...... آواز بتدریج بہت کمزور اور دھیمی ہوتی گئی...... اور رک رک کر آنے لگی...... اللہ...... کا شکر ہے.......... بیٹا۔ یہاں تک کہ صرف لبوں کی ہلکی ہلکی جنبش لب اور ایک بہت بہت نمایاں جاوداں اور لافانی مسکراہٹ پر اس مردعجیب کا خاتمہ ہوا۔ جو تھا کچھ اور نظر آتا رہا کچھ اور...... اس وقت جو بڑے بوڑھے وہاں پر موجود تھے مولوی جسو صاحب، مولوی عابد حسین صاحب...... شاہ محمد بشیر الدین صاحب عرف شاہ نمو صاحب...... وہ آپس میں یہی کہہ رہے تھے کہ کسی مرے ہوئے شخص کا اتنا حسین چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ تیلہاڑہ میں دو یا دگار اب تک قائم ہیں۔...... بالکل مشرقی کنارے پر شاہی سنگی جامع مسجد اور اس سے سو قدم پر یوسف ابدالؒ کا مزار مبارک...... اور اسی بستی کے بالکل مغربی کنارے پر عید گاہ جس کی پشت پر شجر نیم کے سائے میں اس مرد دنیا دار کی قبر ہے جو زندگی میں اکثر روتا رہا اور ہنستا ہوا رخصت ہوا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

(جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، ص 142)

والد کے انتقال کے صدمے سے کلیم صاحب کی کیا حالت ہوئی اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ خود بیمار ہوتے ہوئے بھی اپنی بیماری کو نظر انداز کرتے ہوئے خود والد محترم کی تیمارداری کرتے رہے اور ایک ایسا لمحہ بھی آیا جب کلیم صاحب کے سامنے ہی ان کے والد اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خودنوشت نہیں ہے بلکہ کسی بہادر، ہمدرد اور انسان دوست کے ماضی کا ایسا مرقع ہے جس میں کلکتہ، عظیم آباد اور عظیم آباد کے دیہات خصوصاً تلہاڑہ کی علمی، ادبی، فکری، تہذیبی اور معاشرتی آثار کی بجھتی ہوئی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔
خاص طور سے ایک حصہ اس کا اتنا درد میں ڈوبا ہوا ہے کہ پڑھنے والا چاہے پتھر دل بھی ہو تو بھی اس کا دم نکل جائے۔ اس حادثے کا ذکر جو کتاب میں اہم حصہ رکھتا ہے وہ بے حد پر درد ہے۔

’جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی‘ میں مزید کلیم صاحب اپنی کتاب ’وہ جو شاعری کا سبب ہوا‘ کے متعلق کچھ اہم باتیں بتاتے ہوئے اپنے گاؤں کی ان تمام مقدس جگہوں کو زیر تحریر لاتے ہیں جو ان کے ذہن میں آج تک محفوظ ہیں جن میں خاص طور سے اپنے نانا مولوی ضمیر الدین مرحوم کے کتب خانے کا ذکر اہم ہے۔ اہم اس معنی میں کہ اس مکتب میں گاؤں کے ہندو اور مسلم دونوں مذہب کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ اس کے علاوہ محلے کی پشت پر درگا استھان اور دسہرہ میں لگنے والے میلے کا ذکر بھی ملتا ہے۔

یہاں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ خودنوشت کے جو تقاضے ہیں یعنی مصنف اپنے آس پاس کے ثقافتی، تہذیبی اور سماجی روش اور رسم و رواج کو زیر بحث لائے اس اصول سے کلیم صاحب کافی قریب دکھائی پڑتے ہیں۔ چونکہ آپ نے گاؤں کی چھوٹے بڑے تمام کلچر کو پیش کیا ہے چنانچہ یہاں خود ان کی تحریر کی ہوئی چند سطریں ملاحظہ کریں جن میں کلیم صاحب کے گاؤں کی جیتی جاگتی تصویر صاف دکھائی پڑ رہی ہے۔ جہاں معمولی افراد کا بھی ذکر ہے۔ انسانیت کے رشتے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ گاؤں کے ہندوؤں اور ان کے تہواروں کا بھی ذکر کشادہ دلی سے کیا گیا ہے۔

”میرے محلہ کی پشت پر درگا استھان تھا۔ ایک بڑا اسہہ درہ...... دسہرہ کے موقع پر اس میں درگا بٹھائی جاتی اور اس کے بعد پورے سال بھر اس میں منشی سوداگر لال کا پاٹھ شالہ کام کرتا۔ دسہرہ کے دنوں میں بڑا میلا لگتا۔ مجھے بالکل بچپن کی بات یاد ہے کہ اس میلے میں گاؤں کے مسلمان چائے ناشتہ کی دکان بڑی نفاست سے لگاتے تھے۔

یہ آپ بیتی 1936 سے شروع ہو کر تقسیم ہند کے سال 1947 کے حالات تک تمام ہوتی ہے۔ ابتدا سے انتہا تک مضامین میں ایک تسلسل صاف دھائی دیتا ہے۔ بات سے بات نکالنے کا ہنر بھی نمایاں ہے کسی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر اتنی لمبی ہوگئی کہ اس کی تحسین و تعریف بھی ہوتی ہے اور تنقید بھی۔ مگر بیان کرنے میں لب و لہجے کی شیرینی میں کمی نہیں آتی۔

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود نوشت نہیں ہے بلکہ کسی بہادر، ہمدرد اور انسان دوست کے ماضی کا ایسا مرقع ہے جس میں کلکتہ، عظیم آباد اور عظیم آباد کے دیہات خصوصاً تلہاڑہ کی علمی، ادبی، فکری، تہذیبی اور معاشرتی آثار کی بجھتی ہوئی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

خاص طور سے ایک حصہ اس کا اتنا درد میں ڈوبا ہوا ہے کہ پڑھنے والا چاہے پتھر دل بھی ہو تو بھی اس کا دم نکل جائے۔ اس حادثے کا ذکر جو کتاب میں اہم حصہ رکھتا ہے وہ بے حد پر درد ہے۔ جسے آپ نے کہیں کہیں افسانوی رنگ میں بھی بیان کیا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آپ بیتی ایک دردمند دل انسان کی زندگی کی وہ سچی دستاویز ہے جس میں نہ کوئی ترتیب نہ کوئی بناوٹ اور نہ کوئی دکھاوا نظر آتا ہے بلکہ حافظے کی بنیاد پر جو واقعہ یاد آیا اس سے بے ساختہ بیان کرتے چلے گئے ہیں اور کوشش بس اتنی کی ہے کہ کوئی معمولی سے معمولی شخص بھی اگر ان سے کبھی وابستہ رہا ہے یا زندگی کے کسی موڑ پر ملا ہوا سے بھی ماضی کے پردوں سے باہر نکال کر اس کی یادوں کو تازہ کیے ہیں۔

■

Md. Zameer Raza, Dept. of Urdu, Magadh Mahila College, Patna University, Patna- 4 (Bihar)

انتخاب کلام

•

مان لیتے ہیں ستم کی تمھیں عادت ہوگی
ہم جو مرجائیں گے پھر کس پہ عنایت ہوگی
نہ جہاں درد نہ ارمان نہ حسرت ہوگی
اے خدا وہ مرے کس کام کی جنت ہوگی
میرے نالوں سے نہ ہو آپ کے ٹھوکر سے سہی
اک نہ اک روز تو ہونی ہے قیامت ہوگی
سنتا ہو خانۂ دشمن پہ گری ہے بجلی
ہو نہ ہو یہ میرے آہوں کی شرارت ہوگی
عشق میں بات بنانی ہمیں آتی ہی نہیں
ہم تو جو عرض کریں گے وہ حقیقت ہوگی
حشر میں پردہ اٹھائے گا جو وہ فتنہ طراز
منہ چھپائے ہوئے دامن سے قیامت ہوگی
لاش کیوں اس کی گلی سے نہیں بڑھتی آگے
چارہ گر دیکھنا دل میں کوئی حسرت ہوگی
جان جاتی ہے حسینوں پہ تو پروا کیا ہے
جی بھی لیں گے کبھی مرنے سے جو فرصت ہوگی
قتل بھی آپ کریں گے تو نہ شکوہ ہوگا
ہم اگر اُف بھی کریں گے تو شکایت ہوگی
میں نے تو کر ہی دیا نام وفا کا روشن
کچھ نہ ہوگی تو چراغِ شب فرقت ہوگی
صبح وصل آ نہ سکے گی مرے غم خانے تک
راہ رو کے ہوئے ظالم شب فرقت ہوگی
خاک پروانہ بچھائے گی وفا کی چادر
دامن شمع سے لپٹی ہوئی حسرت ہوگی

•

ظالم تھا وہ اور ظلم کی عادت بھی بہت تھی
مجبور تھے ہم اس سے محبت بھی بہت تھی
اس بت کے ستم سہہ کے دکھا ہی دیا ہم نے
گو اپنی طبیعت میں بغاوت بھی بہت تھی
واقف ہی نہ تھا رمز محبت سے وہ ورنہ
دل کے لیے تھوڑی سی عنایت بھی بہت تھی
یوں ہی نہیں مشہور زمانہ میرا قاتل
اس شخص کو اس فن میں مہارت بھی بہت تھی

•

کیا دور غزل تھا کہ لہو دل میں بہت تھا
اور دل کو لہو کرنے کی فرصت بھی بہت تھی
ہر شام سناتے تھے حسینوں کو غزل ہم
جب مال بہت تھا تو سخاوت بھی بہت تھی
بلوا کے ہم عاجز کو پشیماں بھی بہت ہیں
کیا کیجیے کم بخت کی شہرت بھی بہت تھی

•

واللہ کس غضب کے ہو ہنس مکھ دکھائے جاؤ
ہم آہ آہ کرتے ہیں تم مسکرائے جاؤ
ہم تو غزل کے پھول کھلائے ہی جائیں گے
تم جانتے ہو زخم لگانا لگائے جاؤ
فنکار تم ستم کے ہو ہم شاعر وفا
ہم اپنی گائے جائیں تم اپنی سنائے جاؤ
میرے فسانے پر ہے تمھارا ہی اختیار
جو بات چاہو اپنی طرف سے ملائے جاؤ
اہلِ وفا کے جلتے بدن سے رہو الگ
ہم دھوپ دھوپ جائے ہیں تم سائے سائے جاؤ
اپنوں کو ہم تو غیر تمھارے لیے بنائیں
اور تم ہمارے غیر کو اپنا بنائے جاؤ
ہم ہیں اگر تو خونِ جگر کی کمی نہیں
جتنے چراغ بزم میں چاہو جلائے جاؤ
آتی نہیں ہے آج تو کل آئے گی بہار
غنچو خزاں کا غم نہ کرو مسکرائے جاؤ
وہ سن کے ان سنی جو کرے ہے کیا کرے
تم اے کلیم اپنی غزل گنگنائے جاؤ

•

میخانے میں چھوڑ آئے کہ گھر بھول گئے ہم
اے زندہ دلی تجھ کو کدھر بھول گئے ہم
دیوانے ہیں کیا خاک زمانے سے لڑیں گے
شمشیر اٹھائی تو سپر بھول گئے ہم
ہر سمت ہے اک بھیڑ کرشموں کی تمھارے
دل کس نے لیا کس نے جگر بھول گئے ہم
غربت ہی کی اب خاک مقدر میں لکھی ہے
وہ راہ جو پہنچاتی ہے گھر بھول گئے ہم

رستہ ہی دکھانا تو نہیں کام نظر کا
ٹھوکر بھی کھلاتی ہے نظر بھول گئے ہم
اوروں کو بھی اس زخم سے دیکھا جو پریشاں
اپنی خلش زخم جگر بھول گئے ہم
مرنے کا تو فن کب کا فراموش ہوا تھا
جینے کا بھی دنیا میں ہنر بھول گئے ہم
دھجی کوئی دامن کی ترے واسطے رکھنا
اس سال بھی اے دیدۂ تر بھول گئے ہم
سودا ہی لیا عشق میں سر بھول گئے ہم
کچھ لے چلے کچھ زادِ سفر بھول گئے ہم
کیا کیا نہ ترا ظلم ہوا جانِ حزیں پر
بھولا نہیں جاتا تھا مگر بھول گئے ہم
دنیا کی خبر سے کیا دنیا کو خبردار
وقت آیا تو اپنی ہی خبر بھول گئے ہم
اتنا تو رہا یاد نظر ان کی اٹھی تھی
کیا کہہ گئی ان کی نظر بھول گئے ہم
اس در پہ جھکائی تو جھکی رہ گئی گردن
ہے بھی کہ نہیں دوش پہ سر بھول گئے ہم

•

بتا پھر آج کیوں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
ہوا کیوں اس قدر شیر و شکر آمیز ہے ساقی
یہ کس جانِ جہانِ آرزو کی آمد آمد ہے
یہ کس کی آرزو میں نبض محفل تیز ہے ساقی
مزاج وقت کی چلمن سے باہر کس نے جھانکا ہے
نقاب آزاد کس کا حسن آفت خیز ہے ساقی
یہ کس کے پیار کی مستی نے سب کو مست کر ڈالا
یہ کس کے پیرہن کی خوشبو اتنی تیز ہے ساقی
جسے گجرال کہتے ہیں وہ خود شاعر نہیں لیکن
مجسم شعر ہے اور شعر معنی خیز ہے ساقی
وہی اس شعر معنی خیز کو پہچان جائے گا
نظر باریک جس کی ذہن جس کا تیز ہے ساقی
کنارِ آب رودِ گنگا ہے گرچہ قیام اس کا
لہو میں اس کے جھیلم کا بھی آبِ تیز ہے ساقی
وہی جو آج ہے پیرِ مغاں ایوانِ دہلی کا
وہی لاہور کا اک شہری نوخیز ہے ساقی

سنی ہے گفتگو اس کی اگرچہ گفتگو اس کی
نہ جوش آمیز ہے ساقی نہ شور انگیز ہے ساقی
دلوں کو گرم کرتا ہے مستی محبت سے
زباں میں اس کی وہ آبِ نشاط انگیز ہے ساقی
کمی آتی نہیں گرچہ بہت تقسیم کرنا ہے
ہمیشہ پیار سے اس کا سبو لبریز ہے ساقی
مرے دل کی تمنا بار بار اٹھ اٹھ کے کہتی ہے
بدل جائے یہ دنیا کیا تعجب خیز ہے ساقی
یہ اس کی ہمت مردانہ سے امید ہے مجھ کو
جلائے گا دیا ہر چند طوفاں تیز ہے ساقی
خدا توفیق دے چاروں طرف وہ پھول برسا دے
زمانے کی ہوا گرچہ شرر انگیز ہے ساقی
دعا کر دامن گجرال کے محفوظ رہنے کی
چمن میں ہر طرف کانٹوں کا ناخن تیز ہے ساقی
بھروسہ کر خدا پر چھیڑ سازِ آرزو اپنا
ترے ہی ہم بغل عاجز بھی نغمہ ریز ہے ساقی

•

ان کی زلفوں میں جتنی شکن چاہیے
ہم کو اتنا ہی دیوانہ پن چاہیے
چاہیے ان کو رنگین قبا اور ہمیں
چاک کرنے کو اک پیرہن چاہیے
یہ بھی ہے ایک سامان دل بستگی
کچھ تماشائے دار و رسن چاہیے
میرے جیسے مسافر بہت آئیں گے
ان کے جیسا حسیں راہزن چاہیے
قتل کرنے ہی کا اک سلیقہ سہی
کچھ تو مشہور ہونے کو فن چاہیے
آج کل سب کا بدلا ہوا بھیس ہے
شیخ ڈھونڈھو اگر برہمن چاہیے
دل کا ایک ایک قطرہ لہو دے دیا
اور کیا اے بہار چمن چاہیے
ہم تو جلتے ہیں تم بھی جلو دوستو
شمع کے واسطے انجمن چاہیے
اپنے ٹھنڈے دلوں کے لیے مانگ کر
ہم سے لے جاؤ جتنی جلن چاہیے
کہنے والے پہ گزرے سو گزرا کرے
سننے والوں کو لطفِ سخن چاہیے

•

اس ناز اس انداز سے تم ہائے چلو ہو
روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو
رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو
دیوانہ گل قیدی زنجیر ہیں اور تم
کیا ٹھاٹ سے گلشن کی ہوا کھائے چلو ہو
مے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ
پینا نہیں آئے ہے تو چھلکائے چلو ہو
زلفوں کی تو فطرت ہی ہے لیکن میرے پیارے
زلفوں سے زیادہ تمھیں بل کھائے چلو ہو

•

ہم نے بے فائدہ چھیڑی غم ایام کی بات
کون بیکار یہاں ہے کہ سنے کام کی بات
شمع کی طرح کھڑا سوچ رہا ہے شاعر
صبح کی بات سنائے کہ کہے شام کی بات
ہم غریبوں کو تو عادت ہے جفا سہنے کی
ڈھونڈ ہی لیتے ہیں تکلیف میں آرام کی بات
دھوپ میں خاک اڑا لیتے ہیں سائے کے لیے
پیاس لگتی ہے تو کرتے ہیں مے و جام کی بات
اب تو ہر سمت اندھیرا ہی نظر آتا ہے
خوب پھیلی ہے تری زلف سیہ فام کی بات
صبح کے وقت جو کلیوں نے چٹک کر کہہ دی
بات چھوٹی سی ہے لیکن ہے بڑے کام کی بات
کوئی کہہ دے کہ محبت میں برائی کیا ہے
یہ نہ تو کفر کی ہے بات نہ اسلام کی بات
گرچہ احباب نے سر جوڑ کے ڈھونڈا عاجز
نہ ملی میری غزل میں روشِ عام کی بات

•

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا
تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا
گو ستم نے تیرے ہر ایک طرح مجھے ناامید بنا دیا
یہ میری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کرکے دکھا دیا
کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں ایک چراغ جلا دیا
تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں
تیرے گیسوؤں کو سنوار کر تجھے آئینہ بھی دکھا دیا
میری شاعری میں تیرے سوا کوئی ماجرا ہے نہ مدعا
جو تیری نظر کا فسانہ تھا وہ میری غزل نے سنا دیا
یہ غریب عاجز بے وطن یہ غبار خاطر انجمن
یہ خراب جس کے لیے ہوا اسی بے وفا نے بھلا دیا

•

جب صبا آئی اِدھر ذکرِ بہار آہی گیا
یاد ہم کو انقلابِ روزگار آہی گیا
کس لیے اب جبر کی تکلیف فرماتے ہیں آپ
بندہ پرور میں تو زیرِ اختیار آہی گیا
لالہ و گل پر جو گزری ہے گزرنے دیجیے
آپ کو تو مہرباں لطفِ بہار آہی گیا
دہر میں رسم وفا بدنام ہوکر ہی رہی
ہم بچاتے ہی رہے دامن غبار آہی گیا
ہنس کے بولے اب تجھے زنجیر کی حاجت نہیں
اُن کو میری بے بسی کا اعتبار ہی آگیا
شکوہ سنجی اپنی عادت میں نہیں داخل مگر
دل دُکھا تو لب پہ حرفِ ناگوار آہی گیا

•

میرے ہی لہو پر گزر اوقات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو
دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو، دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
ہم خاک نشیں، تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آکے ملو، دور سے کیا بات کرو ہو
ہم کو جو ملا ہے وہ تمھیں سے تو ملا ہے
ہم اور بھلا دیں تمھیں، کیا بات کرو ہو
یوں تو ہمیں منہ پھیر کے دیکھو بھی نہیں ہو
جب وقت پڑے ہے تو مدارات کرو ہو
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو
بکنے بھی دو عاجز کو جو بولے ہے، بکے ہے
دیوانہ ہے، دیوانے سے کیا بات کرو ہو

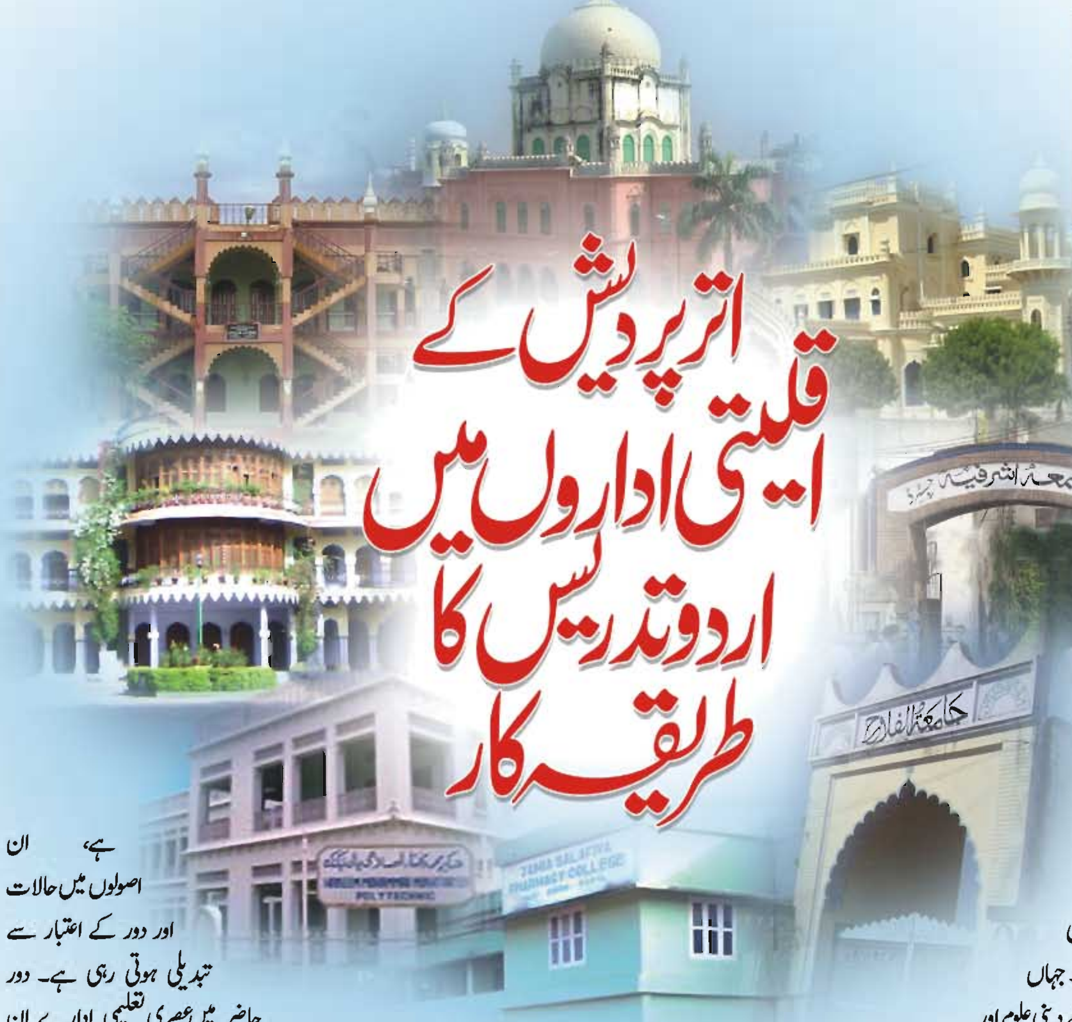

واثق الخیر

اتر پردیش کے اقلیتی اداروں میں اردو تدریس کا طریقہ کار

ہندوستان میں دور قدیم سے ہی کچھ ریاستوں کو علمی مرکزیت حاصل رہی ہے۔ جہاں کے حکمرانوں اور لوگوں نے دینی علوم اور عصری علوم کی بھرپور نمائندگی کی ہے، جن کی وجہ سے ان علاقوں میں علمی درسگاہیں قائم ہوئیں اور ان کی شہرت غیر ممالک میں زور وشور سے ہوئی۔ اتر پردیش انھیں مراکز میں سے ایک ہے، جس کے تمام خطے میں علم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں ایک طرف ان کے مغربی علاقے سہارنپور، رام پور، علی گڑھ اور آگرہ کو علمی مرکزیت حاصل ہے وہیں ان کے مشرقی علاقے اعظم گڑھ، جونپور اور بنارس اپنی علم دوستی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں جبکہ اتر پردیش کا مرکزی علاقہ اودھ جہاں نوابوں کی حکمرانی تھی، علم کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے مقبول ہے اور جسے آج بھی علمی مرکزیت حاصل ہے۔

ہندوستان کی اس ریاست میں عصری علوم کے لیے بنارس ہندو یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ چھوٹی بڑی اور بھی کئی یونیورسٹیاں قائم ہیں، جو اپنے نصاب اور طریقہ تدریس کے ذریعے ایسے طلبا پیدا کررہی ہیں جو ملک کی ترقی میں بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں جس کی وجہ سے ہندوستان کی شمولیت ترقی پذیر ممالک میں ممکن ہوسکی۔ جبکہ اسی سرزمین میں دین کی بقا کے لیے 1857 کی جنگ آزادی کی شکست اور بے شمار علما کرام کی شہادت کے بعد دانشوروں نے ایک ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا جو دارالعلوم دیوبند کی صورت میں قائم ہے۔ جو اب بھی پوری عظمت وشان سے دین کی اشاعت میں قابل ذکر کردار ادا کررہا ہے۔ دور حاضر میں ملک میں دین کی بقا اور اس کی نشرواشاعت کے لیے نہ جانے کتنے مدارس ومکاتب اپنی خدمات پیش کررہے ہیں۔ لیکن اس ریاست کے کچھ مدارس ایسے ہیں جو کلیدی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلما، مدرستہ الاصلاح، جامعۃ الفلاح، جامعہ اشرفیہ اور جامعہ سلفیہ یہ وہ اقلیتی ادارے ہیں جن کی طرز تعلیم سے متاثر ہوکر ملک کے کونے کونے میں بے شمار ادارے وجود میں آئے۔ جو درج بالا اقلیتی اداروں میں سے کسی ایک کے طریقہ تدریس اور نصاب کو قبول کرکے علم کی شمع روشن کررہے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کسی کام کو صحیح طریقے سے انجام تک پہنچانا مقصد ہوتا ہے تو اس کے لیے ایک اصول مرتب کیا جاتا ہے تاکہ وہ کام بحسن وخوبی انجام کو پہنچ جائے۔ تعلیم تو ایک اعلیٰ شے ہے جسے سماج ومعاشرہ نے وقتاً فوقتاً اپنی مادی زندگی کے تقاضے کو پورا کرنے اور اپنی امتیازی تہذیبی و تمدنی اقدار کے استحکام اور ترویج واشاعت کے لیے وضع کیا ہے، ان اصولوں میں حالات اور دور کے اعتبار سے تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ دور حاضر میں عصری تعلیمی ادارے ان اصولوں کی بھرپور پابندی کررہے ہیں۔

قدیم زمانے میں بچوں کو درس وتدریس کے لیے ایک لفظ 'حکمت' کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لفظ کے معنیٰ وہی ہیں جو انگریزی کے لفظ Technic کے ہیں، اسی کو ماہرین تعلیم نے 'طریقہ' سے موسوم کیا ہے۔ پھر اس میں یہ وضاحت بھی کردی ہے کہ مختلف عمر اور مختلف سطح کے طلبا کو پڑھانے کے لیے الگ الگ طریقہ کار کو اختیار کیا جائے، کیونکہ ہر عمر اور ہر سطح کے بچوں کی دلچسپیاں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اور ان کے ذہنوں میں کسی چیز کو قبول کرنے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جب ان باتوں کا اندازہ ہوجائے گا تو اسے یہ طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ سبق کے کن مباحث کو کس طرح پیش کرنا چاہیے تاکہ طلبا کی سبق میں دلچسپی بنی رہے۔

ماہرین تعلیم نے درس وتدریس کے لیے مختلف طریقے بتائے ہیں، ان میں چند طریقہ تعلیم کی طرف اشارہ ضروری ہے جو زیادہ مقبول ہیں۔ استقرائی طریقہ (inductive method)، استخراجی طریقہ (Deductive Method)، سوال وجواب کا طریقہ (Question, Answer Method)، خطابت کا طریقہ (Lecture Method)، قصصی طریقہ (Story telling

Method)، کرکے سیکھنا (Learning by Method)، اشاراتی طریقہ (Demonstrative Method)، وسائلی طریقہ کار (Source Method)، زیرنگراں طریقہ کار (Supervised Study Method)، سروے کا طریقہ (Survey Method)، لیبارٹری طریقہ (Laboratory Method)، اکائی طریقہ (Unit Method)، مسئلہ کو حل کرنے کا طریقہ (Problem Method) پروجکٹ طریقہ (Project Method) اور بحث ومباحثہ کا طریقہ (Discussion Method)۔

مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی ایک یا کئی طریقوں کو مضامین کے اعتبار سے خلط ملط کرکے پڑھانے کا عمل اس حالت میں کامیاب ثابت ہوسکتا ہے جب بچے کو اس کی ذہنی سطح کے مطابق قدرتی ماحول میں کسی ڈر، خوف یا دباؤ کے بغیر پڑھ کر، دیکھ کر، سن کر، تجربہ اور مشاہدہ کرکے، کسی مسئلے کو حل کرکے یا مسئلے کے حل کرنے کے عمل میں ذاتی شرکت کرکے عمل کرکے، بحث ومباحثہ کے ذریعے یا استدلال کے ذریعے سیکھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ بلاشبہ اس میں استاد کا رول غیرمعمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

بچوں کی انفرادی ضرورت، ان کی افتادِ طبع اور دیگر عوامل کو پیش نظر رکھ کر ان میں خود کام کرنے اور اپنی مشکلات خود حل کرنے اور خود کرکے سیکھنے کی صلاحیت پیدا کی جاسکے اور استاد کی اعلیٰ سیرت نیز اس کے قول وعمل میں مطابقت اور ان کی تدریس بچے کی تعمیری سیرت میں جان ڈال دے اور طلبہ میں عالم گیر اتحاد کا احساس، مشترک انسانی اقدار کا احترام اور انسانی ہمدردی کا اعلیٰ ترین جذبہ پیدا کرسکے اور ان میں جرأت، دیانتداری، غوروفکر کی قوت، قوت عمل، اعلیٰ بصیرت، تدبر، معاملہ فہمی، فراست، فکر ونظر کی وسعت، دلکش اور مدلل انداز میں اپنی بات کہنے کی صلاحیت پیدا ہو، احساس ذمے داری، انسان دوستی اور خودداری پروان چڑھے، دوران تعلیم تجسس کا جذبہ پیدا ہو، غرض کہ استاد طلبہ کی عمر وذہن کے استعداد کے مطابق ان کے سامنے عملی محرکات مہیا کرے تاکہ وہ قوم وملک کے لیے اعلیٰ نمونہ بن سکے۔

ماہرین تعلیم نے طریقہ درس وتدریس کے جن پہلوؤں پر زور دیا ہے ان میں بچے کو تدریس میں مرکزی حیثیت دینا، آسان سے مشکل کی طرف چلنا، ہر بچے پر انفرادی توجہ دینا، تدریس کے مواد کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کرنا، رٹنے کے بجائے تفہیم اور غوروفکر کی صلاحیت پیدا کرنے پر زور دینا اور اندازِ قدر کو پوری تعلیمی مدت میں ایک اہم اور ناگزیر چیز کی حیثیت سے استعمال کرنا وغیرہ شامل ہے۔

ہندوستان کے اقلیتی اداروں پر تحقیقی نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں تدریس کی بنیاد کتابوں پر رکھی گئی ہے۔ یعنی پورا نظام تعلیم 'کتاب مرکوز' (Book Oriented) بن کر رہ گیا ہے جب کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں ماہرین تعلیم 'بچہ مرکوز' (Child Centre) کو دوران تدریس مرکزی حیثیت دینے پر زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں جب کہ انسانوں کے علاوہ تمام جانداروں کے ساتھ ساتھ درختوں اور پودوں کو بھی ذی روح تصور کیا جارہا ہے جو موسم کے اثرات اور تبدیلیوں کو قبول کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سیکھنے کے عمل میں بچے کے احساسات اس کی ذہنی صورت حال اور اس کی شرکت کے بغیر موثر ہوجائے۔

اقلیتی اداروں کے اساتذہ درس وتدریس میں کتاب کو مرکزی حیثیت دے کر استخراجی اور بیانیہ طریقہ کو اختیار کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے میں اقلیتی اداروں کی دو مجبوریاں ہیں اول یہ کہ ان کے نصاب میں موضوعات (Contents) کی جگہ کتابیں ہیں۔ اس لیے اساتذہ کا پورا زور کتابوں کی عبارت کو حل کرنے اور ان کی تشریح کرنے پر صرف ہوتا ہے۔ اگر موضوعات طے ہوتے تو اساتذہ کے لیے یہ آسان ہوتا کہ وہ اس موضوع سے متعلق مختلف کتابوں سے استفادہ کرکے لکچر دیتے، جبکہ قرون اولیٰ کے اساتذہ کے یہاں املا کا طریقہ رائج تھا۔ اسی لیے قدیم زمانے کے طلبا کو مباحثہ کرنے اور اساتذہ کے ساتھ سوال وجواب کرنے کا پورا موقع حاصل تھا۔ پھر کتابوں کو مقرر کرنے سے ایک چیز محسوس ہوتی ہے کہ جس عمر اور سطح کے طلباء کو جتنے وقت میں یہ کتابیں پڑھائی جارہی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتابیں زیادہ ہیں۔ اساتذہ پورے سال ان کتابوں کو ختم کرنے میں منہمک رہتے ہیں، اور طلبا کا پورا وقت متن کو سمجھنے اس کی عبارت کو حل کرنے اور تراکیب والفاظ کو سمجھنے میں صرف ہوجاتا ہے۔ اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے ارتقاء نیز موجودہ پیچیدہ مسائل کے حل میں یہ عظیم علوم کس طرح معاون ثابت ہوسکتے ہیں اس کا نمبر ہی نہیں آتا اور نہ ہی اس بات کا احساس ہوپاتا ہے کہ ان علوم سے موجودہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں کس طرح مدد لی جاسکتی ہے۔ دوم یہ کہ یہاں کا نصاب خالص اسلامی علوم پر مشتمل ہے جس میں قرآن اور حدیث کی تعلیم دینا اور دینی مسائل کی پیچیدگی سے روشناس کرانا مقصد ہے، اس لیے اس میں یک طرفہ طریقہ تعلیم رائج ہے، اساتذہ اپنے مطالعے کی بنیاد پر کلاس میں لیکچر دیتے ہیں۔

گویا نصاب تعلیم قدیم فکر کے مطابق کتابوں کی وہ سلسلہ وار فہرست ہے جو طلبا کی تعلیم کے لیے ترتیب دی جاتی تھی۔ نصاب دراصل کسی معاشرے کے فرد یا افراد کو کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے ایک متعین مدت میں کوئی متعین معلومات یا مجموعی علم پہنچانے کا نام ہے۔ درس وتدریس میں نصاب کا مفہوم یہ ہے کہ کسی معاشرے کے ماضی کے علم ودانش، حکمت ودانائی، تہذیب وتمدن اور اقدار حیات کو حال کی روشنی میں اس دور کی نوخیز نسل تک بتدریج، ذہنی اور جسمانی صلاحیت کے لحاظ سے اس طرح منتقل کیا جائے کہ نوجوان نسل کے علم میں اضافہ ہو اور اس کی شخصیت کا ارتقا ہو۔

قدیم مفکرین نے نصاب تعلیم کو صرف درسگاہوں اور مکتبوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں تک محدود کردیا تھا۔ عام طالب علم کے ذریعے کلاس روم سے باہر حاصل شدہ معلومات اور تجربات کو نصاب تعلیم کا جز نہیں مانا جاتا تھا، جبکہ آج کے دور میں نصاب کا دائرہ انتہائی وسیع ہوگیا ہے۔ نصاب تعلیم میں صرف نصابی کتابوں کو نہیں رکھا جاتا ہے، بلکہ طالب علموں کے دیگر تمام اعمال اور تجربات کو بھی نصاب کے اندر شامل کیا گیا ہے۔

اقلیتی ادارے جو ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم وتعلم کے لیے روایتی ادارے ہیں، خواہ وہ ادارے ملحقہ ہوں یا غیر ملحقہ اس کے نصاب تعلیم پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان اداروں میں پہلے اور اب میں صرف اتنا فرق آیا ہے کہ نصاب کے اندر کچھ جدید مضامین شامل کرلیے گئے ہیں لیکن اب بھی ان اداروں میں جدید مضامین محض نام کی چیز ہے۔

جہاں تک اردو کا سوال ہے تقریباً تمام ملحقہ وغیر ملحقہ اقلیتی اداروں کے نصاب میں اردو کی کتابیں شامل ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اردو مضمون کی حیثیت سے ابتدائی درجوں میں عمومی طور پر داخل نصاب ہے۔ کہیں کہیں بڑے درجوں میں بھی اردو بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر

ہے کہ ان اقلیتی اداروں میں اردو ادب کی تعلیم بہت کم ہے، زیادہ تر زبان کی حد تک ہے، ساتھ ہی جہاں اردو ادب ہے وہاں کا اردو ادب اسکول و کالج کے ادب سے کافی مختلف ہے یعنی ان اقلیتی اداروں میں ایسے ادیب و شاعر اور ایسے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جن سے مذہبی رواداری کو کوئی ٹھیس نہ پہنچتی ہو۔ مثال کے طور پر 'رحمت عالم' اور 'اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب' پڑھائی جاتی ہے، اسی طرح حالی کی 'مسدس حالی' اور اقبال کی نظمیں پڑھائی جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقلیتی اداروں کے اردو نصاب میں دین و مذہب کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے، جبکہ بورڈ سے ملحقہ اداروں اور سرکاری امداد سے مستفید ہونے والے اداروں کے اردو نصاب میں عام شاعروں اور ادیبوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

دور حاضر کے تقریباً تمام اقلیتی اداروں کے وسیلہ درس وتدریس کے طور پر اردو زبان کو قبول کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے، بلکہ جب اردو زبان اپنے خدوخال پوری کررہی تھی اس وقت درباریوں کی زبان فارسی تھی اور اردو عوام کی زبان تھی، جو بہت تیزی سے مقبولیت کی طرف گامزن تھی۔ قدیم ادارے اپنی دقیق نظر سے مستقبل کو دیکھ رہے تھے، دارالعلوم دیوبند کے قیام سے قبل ہی اسلامی اداروں نے اردو زبان کو وسیلے کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا تھا، اس سے قبل فارسی اور عربی کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، اس لیے کہ اپنے اپنے دور میں یہ زبانیں حاوی تھیں اور اسلامی علوم سے متعلق کتابیں ان زبانوں میں موجود تھیں جیسے آج کے دور میں اسلامی علوم سے متعلق اردو زبان میں بے شمار کتابیں لکھی جاچکی ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی تاریخ کو اردو زبان کے جاننے والوں نے پوری طرح کتابی صورت میں جمع کردیا ہے۔ اب اگر اردو زبان کو نہ پڑھایا جائے تو آئندہ نسل اردو سے بے بہرہ اور اسلامی تاریخ و علوم سے محروم ہوجائے گی اور ان کی اسلامی شناخت بالکل ختم ہوجائے گی۔ انھیں بنیادی باتوں کو مدنظر رکھ کے اقلیتی اداروں نے اردو زبان کو درس وتدریس کے لیے وسیلے کے طور پر استعمال کیا، تاکہ طلبہ اردو زبان سے روشناس ہوسکیں۔

اقلیتی اداروں نے اردو زبان کو وسیلہ درس وتدریس کے لیے استعمال کیا، اقلیتی اداروں کے فارغین نے کتابیں لکھیں اور رسالے وجرائد جاری کیے۔ انھیں کوششوں کی وجہ سے آج اردو زبان زندہ ہے جو پڑھی اور بولی جارہی ہے۔ اگر یہ اقلیتی ادارے اپنے ابتدائی درجوں میں بچوں کو حروف تہجی سے روشناس نہیں کراتے اور زبان لکھنے و پڑھنے کے لیے نہ سکھاتے تو ایک بڑی آبادی اردو سے محروم ہوجاتی۔ کیونکہ دور حاضر کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم نہیں کے برابر ہے۔ یہاں سے تعلیم حاصل کرنے والے زیادہ تر بچے اردو لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے ہیں۔ اگر ان بچوں کو اردو پڑھانا ہوتا ہے تو اقلیتی اداروں کے فارغین کا سہارا لیا جاتا ہے۔

گویا اقلیتی ادارے اردو زبان کی بقا ہی نہیں بلکہ فروغ میں اہم کردار ادا کررہے ہیں۔ ان اداروں میں غیر اردو داں علاقوں سے آنے والے طلبہ نصابی ضرورتوں کے تحت اردو سے آشنا ہوکر اس میں تحریر وتقریر کی صلاحیت پیدا کرکے واپس اپنے علاقوں میں لوٹتے ہیں اور اردو زبان کے فروغ میں معاون ہوتے ہیں۔ بنگال، آسام، گجرات، اڑیسہ، تامل ناڈو، کیرلہ اور کرناٹک وغیرہ جیسی ریاستوں کے دور دراز علاقوں میں اردو زبان وادب کی آبیاری کرتے ہیں، جس سے عوام اردو زبان سے روشناس ہورہی ہے۔ اسی طرح ان اداروں میں غیر ممالک سے آنے والے طالب علم نصاب اور درس وتدریس میں اردو کے استعمال اور ماحول سے اردو زبان کو سیکھ لیتے ہیں اور اپنے ملک میں اس زبان سے دوسروں کو روشناس کرانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو اقلیتی ادارے اردو زبان کو کئی بیرونی ملکوں تک پھیلا کر اسے بین الاقوامی زبان بنانے میں تعاون پیش کررہے ہیں۔

اردو خطاطی اور خوشنویسی انھی اقلیتی اداروں سے ہی عبارت ہے، یہاں ابتدائی درجات سے ہی خوشنویسی اور املا کی درستگی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ دور حاضر میں کمپیوٹر نے خطاطی اور خوشنویسی کی جگہ لے لی ہے تو اقلیتی اداروں نے اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے کمپیوٹر کی تعلیم کو اپنے یہاں جگہ دی۔ یہاں کے طلبا کمپیوٹر کی تربیت لے کر اردو اخبارات، رسائل اور کتابوں کے لیے کمپوزنگ کرکے اردو زبان کو فروغ دے رہے ہیں۔ اسی طرح انٹرنیٹ کے ذریعے اردو کی خوبصورت تحریر کو دنیا کے مختلف حصوں تک پہنچا رہے ہیں۔ اردو زبان جو اپنی عربی وفارسی اسکرپٹ کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے، اس اسکرپٹ کو بچانے اور اس کو مقبول بنانے میں بیش بہا خدمات پیش کررہے ہیں، آج تک کسی اقلیتی ادارے کے تعلیم یافتہ افراد نے مادری زبان اردو اسکرپٹ کو بدلنے کی بات نہیں کی ہے، جبکہ اردو ادب کو فروغ دینے والے کچھ ادبا اردو کو دیوناگری اسکرپٹ میں لکھنے کی وکالت کرچکے ہیں، آج بھی کہیں کہیں سے اس طرح کی آوازیں اٹھتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔

اردو کے اخبارات، رسائل وجرائد اور کتابوں کو خریدنے اور پڑھنے والوں میں اقلیتی اداروں کے طلباء اساتذہ اور ان کے متعلقین پیش پیش رہتے ہیں۔ ان اخبارات و رسائل کے قلم کاروں میں بھی اقلیتی اداروں کے فیض یافتہ طلبا اچھی تعداد میں ہوتے ہیں۔ انھی اداروں سے ماہنامہ، دوماہی اور سہ ماہی مذہبی جرائد خاصی تعداد میں شائع ہورہے ہیں جس میں قلم کاروں کی تمام تر تعداد اقلیتی اداروں کے اساتذہ اور فضلا کی ہوتی ہے۔ جو اردو زبان وادب کے فروغ میں ایک واضح تعاون ہے۔ اس کے علاوہ آج اردو کتابوں کے ناشرین کی تجارت کا ایک اہم حصہ اسلامی کتب اور قرآن وتفسیر کی اشاعت پر مشتمل ہے۔ اسلامی کتابیں بھی بہت زیادہ تعداد میں شائع اور فروخت ہورہی ہیں جن میں اکثر اقلیتی اداروں کے علما اور اساتذہ کی تصانیف ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں مظفر حنفی ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''اردو کی اشاعت اور اس کے فروغ میں مذہبی صحافت وادب کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ آپ کے علم میں شاید ہے یا نہیں میں آپ کو بتاؤں کہ میں اصل میں 1972 سے نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لیے ہر سال جتنی بھی ہندوستان میں کتابیں نکلتی ہیں ان کا تعارف نامہ تیار کرتا ہوں جس کی ایک جلد (Volume) چار پانچ سو صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس طرح 22 جلدیں میں نے تیار کی ہیں۔ تو کم و بیش ہندوستان میں چھپنے والی تمام کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے واجبی معلومات ہے۔ اس کتابیات کو تیار کرتے ہوئے مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ عام طور پر اردو میں جو ہم لوگ یہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ اردو کتابوں کا ایڈیشن بہت مختصر ہوتا ہے اور اس کی اشاعت بہت محدود ہوتی ہے اور وہ بکتی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ اس میں استثنائی صورت یہ ہے کہ مذہبی کتابیں اردو میں

سب سے زیادہ بکتی ہیں اور تقریباً ایک ایک کتاب کے پانچ پانچ چھ چھ ایڈیشن سال میں نکلتے ہیں تو اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مذہبی ادب نے بہر حال اردو زبان کو مضبوطی اور توانائی بخشنے میں بڑا بنیادی رول ادا کیا ہے۔"

(ماہنامہ 'جام نور'، دہلی، دسمبر 2003، ص 30)

اکثر و بیشتر اقلیتی اداروں میں طلبا کی انجمن کا اہتمام ہوتا ہے جہاں طلبا اساتذہ کی نگرانی میں اردو تقریر، تحریر، خطوط نویسی، خوش نویسی، مضمون نگاری، شعر گوئی وغیرہ میں مہارت حاصل کرتے ہیں، چونکہ اقلیتی اداروں میں مختلف علاقوں سے طلبا آتے ہیں جن کی زبانوں میں علاقائیت کا اثر غالب رہتا ہے، ان اداروں کی یہ انجمنیں طلبا کی زبان اور بیان کو تراش و خراش کر کے معیاری بناتی ہیں۔ اقلیتی اداروں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ ادارے نہ ہوتے تو ہندوستان اور خاص طور پر اتر پردیش اور بہار میں اردو زبان کا عمل دخل گھروں سے نکل جاتا۔ کیونکہ آج لوگ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلانے کو عار سمجھ رہے ہیں، ان کے نزدیک انگریزی میڈیم اسکول اور انگریزی ہی شہرت و عزت کا ضامن ہے۔ اتر پردیش میں اردو کی صورت حال اور مدارس کے کردار پر مظفر حنفی کہتے ہیں:

"اردو کی جسے ہم جنم بھومی یا اردو کا خاص علاقہ کہتے ہیں۔ میری مراد اتر پردیش ہے، غالباً ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ خراب صورت حال اسی کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میری اس بات سے بہت سے عمائدین ادب خفا ہوں لیکن یقین جانیے مجھے صدفی صد اس بات کا احساس ہے کہ اگر مدارس نے اتر پردیش میں اردو کو سہارا نہ دیا ہوتا تو غالباً وہاں سے بالکل ہی اردو کا جنازہ اٹھ گیا ہوتا، اب بھی سسکتی ہوئی صورت حال ہے لیکن بہر حال جو کچھ بھی اردو باقی رہ گئی ہے بالخصوص اتر پردیش میں وہ مدارس کی وجہ سے ہے۔"

(ماہنامہ 'جام نور'، دہلی، مارچ 2004، ص 27)

مجموعی طور پر جائزہ لینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اقلیتی ادارے اپنے قیام کی تاریخ سے آج تک کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود لسانی کشمکش سے بے نیاز ہوکر اردو کی پرورش و پرداخت میں مصروف ہیں، جہاں اردو کے تحفظ کے بلند بانگ دعوے نہیں ہوتے، جہاں اردو کی تاریخ اور اس کے ادبی ارتقاء کے طبقاتی مراحل پر گفتگو نہیں ہوتی اور نہ ہی اردو کو نصاب میں شامل کر کے اس کی اشاعت کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے، لیکن ابتدا سے لے کر انتہا تک نحو، صرف، بلاغت، فلسفہ، منطق، عقائد، کلام، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، قرآن اور احادیث کی افہام و تفہیم کے لیے وہاں اردو کو ہی ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی زبان میں لاکھوں اقلیتی اداروں میں ان کے دفاتر کا نظام چلتا ہے۔ ان ادروں کے تعلیم یافتہ اسی زبان میں مراسلت کرتے ہیں، درخواستیں دیتے ہیں۔ اسی زبان میں مقابلہ جاتی تحریری و تقریری سیمینار منعقد کرتے ہیں۔ برصغیر کے طول و عرض میں روزمرہ اسی زبان میں عظیم الشان کانفرنسیں اور جلسے ہوتے ہیں۔ ان اداروں کے فارغین اسی زبان میں مختلف موضوعات پر مضامین اور مقالے تحریر فرماتے ہیں۔ فتوؤں کے لیے اسی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے، بے شمار مذہبی موضوعات پر اسی زبان میں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ مشیر الحق اقلیتی اداروں کے کردار اور اس کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دینی تعلیم کی ترویج و اشاعت کے علاوہ اردو زبان کو بھی برصغیر کے کونے کونے تک پھیلانے میں عربی مدارس کا بہت بڑا ہاتھ ہے مدرسوں کے اس پہلو پر ابھی تک کسی نے باقاعدہ نظر نہیں ڈالی ہے۔ لیکن یہ موضوع اتنا ہی اہم ہے کہ اس پر پوری تحقیق ہونی چاہیے۔ باوجود کہ نصابی کتابیں تقریباً سب کی سب عربی زبان میں ہوتی ہیں لیکن ہندوستان کے مذہبی مدرسوں میں اعلیٰ تعلیم اردو ہی میں دی جاتی ہے۔ خواہ یہ مدرسے شمال میں ہوں یا جنوب میں، مشرق میں ہوں یا مغرب میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسے کے طالب علموں کی راہ میں ملک کی جغرافیائی، لسانی اور تہذیبی حد بندیاں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ بغیر کسی مبالغہ کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جہاں کہیں بھی کوئی عالم ملے گا۔ وہ اردو ضرور جانتا ہوگا۔

ہندوستان، خصوصاً شمالی ہندوستان کے بعض مدارس عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ ان مدارس میں صرف مختلف ہندوستانی ریاستوں کے طلبہ ہی تعلیم نہیں پاتے، بلکہ غیر ممالک کے طالب علم بھی جو علم دین کے حصول کے لیے یہاں آتے ہیں، برسہا برس تک ہندوستانیوں کے ساتھ اپنا وقت گزارتے ہیں، چونکہ ان غیر ملکی طلبہ کو بھی دیر یا سویر اردو زبان میں ہی اسباق حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی جلد از جلد روزمرہ کی اردو سیکھ لیتے ہیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو برصغیر کے باہر بھی اردو کا تعارف کرانے میں مدارس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔"

(مشیر الحق، مسلمان اور سیکولر ہندوستان، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، 1973، ص 78)

اردو زبان کو فروغ دینے میں اقلیتی اداروں نے جو کردار ادا کیے ہیں اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو زبان کے عوام میں مقبول ہونے کے بعد سے ہی انھوں نے اپنے طریقہ تدریس میں تبدیلی لاکر میڈیم کے طور پر اردو کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اردو بعد کی نسلوں تک اپنے کو باقی رکھ سکی، ورنہ جیسے حالات تھے اردو کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ گویا یہ اقلیتی ادارے ہی وہ جگہ ہیں جہاں کسی دعوے کے بغیر اردو کی پرورش کا کام عملی طور پر چل رہا ہے۔ اگر ان اداروں میں اردو کا چلن ختم ہوجائے تو اس کی باقی ماندہ سانسیں بھی دم توڑ دیں گی۔ اقلیتی اداروں نے درس تدریس کے علاوہ وعظ و نصیحت تقریر و تحریر کے لیے بھی اردو زبان کا استعمال کیا۔ علما ملک کے کسی حصے میں گئے تقریر کے لیے اردو کا استعمال کیا، اقلیتی اداروں نے اپنے یہاں سے دین کی اشاعت کے لیے اردو زبان میں رسالے نکالے۔ اس میں دینی مضامین کے علاوہ اردو زبان کے مسائل پر بھی مضامین لکھے، کیونکہ آزادی کے بعد اردو کو خالص مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا گیا اور اس سے غیر مسلم قوموں نے بیزاری دکھانی شروع کر دی، اور حکومتی سطح پر اس زبان کے فروغ میں زیادہ کوشش نہیں کی گئی، جس کی وجہ سے اس زبان کو فروغ دینے کی ذمے داری مسلمانوں پر آگئی، کیونکہ مسلمانوں کی پوری تہذیب اسی زبان سے وابستہ ہے۔ مسلم تہذیب کو بعد کی نسلوں سے روشناس کرانے کے لیے اردو کو باقی رکھنا بہت ضروری ہے۔ اقلیتی اداروں نے اس ذمے داری کو بحسن و خوبی قبول کیا اور اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے ہر طرح کے طریقے استعمال کیے۔

■

Wasiqul Khair, Flat No 302, Plot No 1/213, Sir Syed Road, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

اختر الواسع

اردو زبان وادب کے فروغ میں طب یونانی کا حصہ

اردو زبان وادب کے فروغ میں طب یونانی کی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے اس موضوع کا انتخاب جتنا خوش کن اور خوش آئند ہے اتنا ہی تعجب خیز بھی ہے وہ اس لیے کہ اس وقیع اور وسیع موضوع پر مجھ سے مضمون لکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ جبکہ مجھے نہ طبِ یونانی کی سمجھ ہے اور نہ اردو زبان وادب پر قدرت رکھتا ہوں۔ ہاں طب یونانی اور اردو دونوں سے میرا ایک رشتہ ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ مریض ہونے کی وجہ علی گڑھ میں حکیم نبراس الدین، حکیم خیری، حکیم افہام اللہ اور دہلی میں حکیم عبدالحمید صاحب، حکیم اقبال صاحب، حکیم کوثر چاند پوری صاحب، حکیم سید احمد صاحب، حکیم عبدالحنان صاحب، حکیم عاصم علی خاں صاحب اور علی گڑھ کے زمانے سے اپنے مشفق ومہربان سینئر حکیم شکیل تمنا صاحب کے زیر علاج رہ چکا ہوں۔ طبقہ حکما میں ان اکابرین سے قربت کی وجہ سے میں اپنی بیماری کا سپاس گزار بھی ہوں۔ یہاں یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ سرکاری دائرے میں حکیم عبدالرزاق صاحب کے بعد طب یونانی کو ہمسر آیوروید بنانے اور آگے بڑھانے والے سی سی آر یو ایم کے سابق ڈائرکٹر جنرل حکیم خالد صدیقی عرصۂ دراز سے میرے مربی اور چارہ گر رہے ہیں اور آج بھی ان کے الطاف وعنایات کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

جہاں تک اردو کی لیاقت کا سوال ہے تو اس ضمن میں بھی اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتا ہوں البتہ اس کا قاری ضرور ہوں، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو کے قاری کس قدر کم ہوتے جا رہے ہیں۔ پھر اردو زبان سے میرا وہی رشتہ ہے جو کسی فرد کا اس کی ماں کے دودھ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کے برملا اعتراف کے بعد بھی میری یہاں موجودگی عزیز گرامی حکیم نازش کی محبتوں کا نتیجہ ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بچپن سے ہی یہ بات خوف کی طرح ذہن میں بٹھادی گئی تھی کہ مولوی اور حکیم دونوں کے حکم کی بجا آوری بلا چوں چرا کرنے میں ہی عافیت ہے۔

صاحبو! زبانوں کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ ذات اور نہ پیشہ بلکہ ان سب کو زبانوں کی ضرورت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو زبان ہر طبقے اور ہر پیشے میں مقبول ومعروف اور مستعمل رہی ہے۔ اور اس زبان کے فروغ میں کسی خاص مذہب یا گروہ کی اجارہ داری نہیں رہی بقول آل احمد سرور ''اردو ادب کا لہلہاتا ہوا باغ تنہا ایک باغبان کی محنت کا ثمرہ نہیں، اس کی آبیاری مختلف جماعتوں، مذاہب اور ممالک نے مل کر کی ہے۔ اس کی تعمیر میں بہتوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ فقیروں اور درویشوں نے اس پر برکت کا ہاتھ رکھا، بادشاہوں نے اسے منھ لگایا ہے، سپاہیوں نے زبان تیغ اور تیغ زبان دونوں کے جوہر دکھائے ہیں پھر بھی یہ جمہور کی زبان اور جمہور کا ادب ہے۔''

چنانچہ طب یونانی کی اردو خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے مختلف حیثیتوں سے اردو زبان وادب کے فروغ میں حصہ لیا ہے۔ اطبا جس طرح ایک بیمار جسم کے لیے اپنے نسخوں اور دواؤں کی بدولت تندرستی، صحت اور شفا کا ذریعہ بنے ہیں۔ اس وقت جب اردو زبان پر پیغمبری کا وقت پڑا تو اطبا کی نسخہ نویسی نے اردو زبان کے لیے نسخہ کیمیا کا کام انجام دیا ہے۔ مدرسوں اور فلموں کے بعد طب یونانی ہی ہے جس نے اس زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا اور نسخہ نویسی کے لیے استعمال کیا۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ طب یونانی محمود غزنوی 1031-997 کے پنجاب پر قبضے کے بعد ہندوستان پہنچا۔ ضیاء الدین عبدالرافع ہروی پہلا طبیب ہے جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ اس کے بعد عہد محمد غوری (1206-1173)، عہد غلامان (1290-1206)، عہد خلجی (1320-1290)، عہد تغلق (1413-1320)، عہد لودی (1526-1451) اور آخر میں عہد مغلیہ (1526-1451) تقریباً تمام مسلم حکمرانوں کے ہزار سالہ دور اقتدار میں طب یونانی کو پورے ہندوستان میں پھلنے پھولنے کا بھرپور موقعہ ملا۔ اس دور میں سیکڑوں کتابیں مختلف طبی موضوعات پر لکھی گئیں، لیکن یہ تمام سرمایہ عربی اور فارسی زبان میں ہے۔ پھر بھی طب یونانی کا رشتہ اردو زبان سے سترہویں اور اٹھارویں صدی میں قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد طب یونانی کا رشتہ اردو زبان سے مزید مستحکم ہوا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر تک اردو زبان میں طب یونانی کا قابل قدر ذخیرہ جمع ہوگیا۔

طب یونانی کی اردو خدمات کا اگر تحقیقی جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ طب یونانی نے اردو زبان کو مختلف اعتبار سے نفع پہنچایا ہے طب یونانی سے وابستہ کئی افراد ماہر حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ ان کی تعداد بھی خاطر خواہ ہے ان سب نے اردو ادب کے نثری اور شعری سرمایے میں اپنی ادبی وعلمی کاوشوں سے گراں قدر اضافے کیے ہیں۔

حکیم قدرت اللہ قاسم ایک ماہر طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اور ان کے تصنیف کردہ تذکرہ 'مجموعہ نغز' کو شعرائے اردو کے تذکروں میں اہم مقام حاصل ہے۔ اسی طرح حکیم عبدالحئی نے جہاں اردو زبان میں مختلف علوم وفنون پر تقریباً 2 درجن کتابیں لکھ کر اردو زبان کی علمی نثر میں اضافہ کیا وہیں ان کی تصنیف 'گل رعنا' کو جس کی تدوین مشہور محقق حافظ محمود شیرانی نے کی ہے شعرائے اردو کے

تذکروں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ حکیم کوثر چاندپوری کا شمار جہاں ماہر طب میں کیا جاتا ہے وہیں وہ ایک بلند پایہ افسانہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی اور علمی نثر کے ذریعے اردو زبان کے سرمائے میں قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ سترہ ناول، دو طویل رپورتاژ، متعدد انشائیے، سیرت و سوانح نگاری سے متعلق چار کتابیں اور تقریباً تیس کتابیں بچوں کے لیے اور ڈیڑھ درجن کے آس پاس افسانوی مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ ساتھ ہی مختلف طبی علوم پر تقریباً دس کتابیں لکھ کر اردو کی علمی اور ادبی نثر میں اضافہ کیا۔ یہاں نہ تفصیل کا موقع ہے اور نہ اس کی گنجائش کہ الگ الگ ان تمام اطبا کا جنھوں نے اردو زبان و ادب کے دامن میں لعل و گہر ٹانکے ہیں، ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے۔ کیونکہ اختصار دامن گیر ہے اس لیے میں صرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھوں گا۔

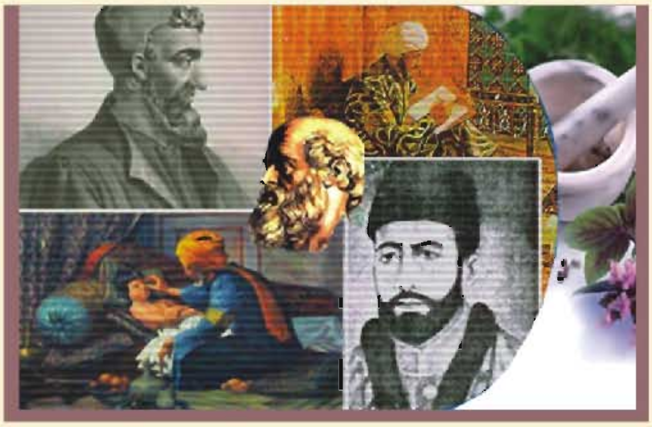

شعرائے اردو میں ایسے شعرا کی تعداد کافی ہے جو صاحب کمال اور استاد شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ باضابطہ حکیم بھی تھے۔ مومن خاں مومن کو کون نہیں جانتا۔ ان کی شعری استعداد اور شاعری کی بلندی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کے اس ایک سہل ممتنع شعر کے بدلے غالب جیسا نابغۂ روز گار شاعر پورا دیوان دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ شعر یہ ہے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن جتنے باکمال شاعر تھے اتنے ماہر حکیم بھی تھے۔ طبابت ان کا آبائی پیشہ تھا اور یہ پوری زندگی اس سے وابستہ رہے۔ مومن نے اپنی شاعری میں نجوم و رمل کی طرح طبی اصطلاحات کا بھی استعمال کر کے اردو شاعری کو نئی نئی تراکیب و اصطلاحات، مطالب و مفاہیم سے آشنا کیا ہے۔ یہ شعر دیکھیے

حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر
کرے معارضہ سر دفتر عقول و نفوس
عشق ان کی بلا جانے، عاشق ہو تو پہچانے
لو مجھ کو اطبا نے سودے کا خلل جانا
ستم اے گرمیِ ضبطِ فغاں و آہ، چھاتی پر
کبھو بس پڑ گیا چھالا، کبھو پھوڑا نکل آیا

مومن کے عہد میں ذوق بھی ہیں ذوق کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اردو قصیدہ نگاری میں سودا کے بعد سب سے اہم مقام ذوق کو حاصل ہے۔ انھوں نے بھی باقاعدہ طب یونانی کی تعلیم حاصل کی تھی اور ابتدا میں کچھ دنوں تک باضابطہ مطب بھی کرتے تھے۔ ذوق کی طب یونانی سے واقفیت، علمی اور فنی شغف کی وجہ سے ان کے اشعار خصوصاً قصائد کی تشبیب میں طبی الفاظ و مصطلحات کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو کو بہت ساری نئی اصطلاحیں اور محاورے ملے ہیں۔ مثال کے طور پر دو تین اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کھجائے سر جو کبھی مفسدان سرکش کا
علاج خارش سر ہو بہ ناخن شمشیر
ترے کوچہ کو وہ بیمار غم دارالشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے
کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا، چھوڑ دے طبیب
یاں جاں ہی جب بدن میں نہیں، نبض کیا چلے

علاج، خارش، دوا، دارالشفا، نبض وغیرہ خالص طبی اصطلاحیں ہیں۔ اس طرح سے سیکڑوں الفاظ ذوق نے اپنے مشہور قصیدوں میں استعمال کیے ہیں۔

اسی عہد کے سب سے بڑے شاعر غالب ہیں۔ غالب نے باضابطہ طب کی تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی لیکن ان کی شاعری میں مستعمل طبی اصطلاحات اور ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو طب یونانی اور اس کی باریکیوں سے کافی واقفیت تھی۔ انھوں نے بھی بہت ساری طبی اصطلاحات کے استعمال کے ذریعے اپنی شاعری کو رنگ و روغن عطا کیا ہے:

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

جب بات چل رہی ہے طب یونانی اور اردو کی تو مسیح الملک حکیم اجمل خان کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ حکیم اجمل خان نے جہاں طب یونانی کے فروغ میں ایک فعال کردار ادا کیا وہیں ان کی ذات سے اردو زبان و ادب کو بھی فائدہ پہنچا۔ وہ ایک ماہر حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین منتظم اور خوش گو شاعر بھی تھے۔ انھوں نے طب یونانی کے فروغ کے لیے اپنے بھائی عبدالمجید خاں کے قائم کردہ مدرسہ طبیہ کا نظم و انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور اردو زبان میں طب یونانی کی درسی کتابوں کی تیاری کے لیے مجلس تحقیقات قائم کی۔ اس مجلس کے تحت متعدد کتابیں لکھی گئیں جن میں 'قانون عصری' نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ حکیم اجمل خاں شاعری میں شیدا تخلص کرتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

دہلی ہی کی طرح دبستان لکھنؤ میں بھی ایسے ماہر علم و فن کی کمی نہ تھی جو بیک وقت طبیب اور شاعر دونوں ہوں۔ حکیم تصدق حسین عرف مرزا شوق لکھنوی سے کون واقف نہیں ہے وہ جہاں ایک حکیم تھے وہیں عاشق مزاج باکمال شاعر تھے ان کی مثنوی 'زہر عشق' اردو ادب کا شاہکار ہے۔ ان کی دوسری مثنویاں 'بہار عشق' اور 'فریب عشق' کو بھی کم رتبہ حاصل نہیں۔

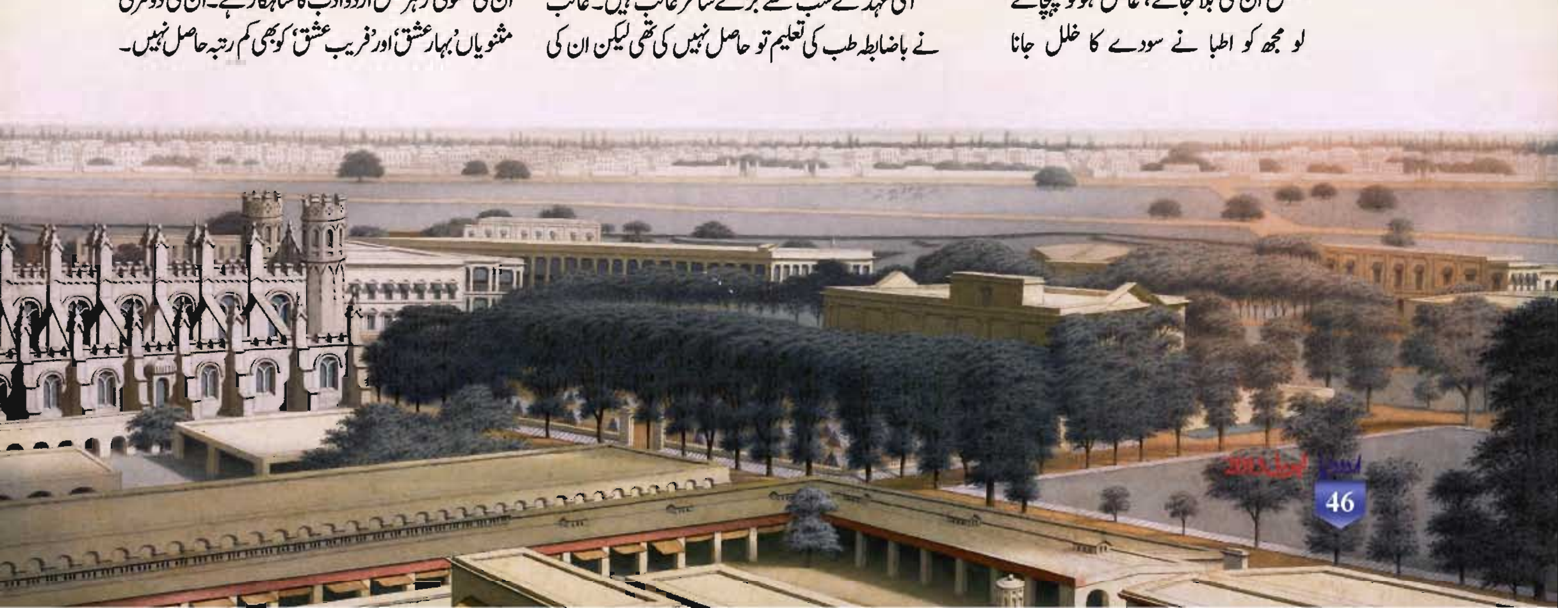

اسی طرح حکیم ضامن علی جلال لکھنوی کو کون نہیں جانتا وہ ناسخ کی تحریک 'اصلاح زبان' کے ایک مضبوط ستون تھے۔ فن شاعری میں استادانہ صلاحیت کے ساتھ ایک محقق اور مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ یاس لکھنوی، رضا دہلوی اور عزیز لکھنوی جیسے درجنوں صاحب دیوان شاعران کے شاگرد تھے۔ جلال جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے اردو قواعد وزبان سے متعلق چند اہم کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں۔

اسرار حسن مجروح سلطانپوری بھی حکیم تھے انھوں نے بھی باضابطہ طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور کچھ دنوں تک اس پیشے سے وابستہ بھی رہے۔ انھوں نے اردو کی جو خدمت کی ہے یہ اردو قاری سے مخفی نہیں ہے۔ مجروح نے اردو غزل کو اس وقت اپنایا تھا جب ہر طرف سے غزل کی مخالفت ہو رہی تھی اور غزل کے مقابلے نظم کو فروغ دیا جارہا تھا۔ مجروح کے نغمے آج بھی لوگوں کے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔

دبستان لکھنؤ سے ہی تعلق رکھنے والے ایک ماہر حکیم اور قدیم طب یونانی کے امین حکیم شکیل احمد شمسی ہیں جو پیدا تو رامپور میں ہوئے لیکن پوری زندگی لکھنؤ کی ادبی فضا میں گزار دی۔ حکیم شکیل شمسی متاخر حکیموں میں جہاں حکیم حاذق تھے وہیں صاحب طرز شاعر بھی تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'قید حیات وبند غم' کی اشاعت ہو چکی ہے۔ حکیم شعرا وادبا کی اتنی طویل فہرست ہے جن کا اجمالی تعارف بھی یہاں ممکن نہیں۔ اس لیے چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

غیر ادبی نثر میں طب یونانی کی تاریخ پر لکھی گئیں کتابوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر تقریباً سو سے زائد کتابیں دستیاب ہیں جنھوں نے اردو قارئین کو طب یونانی کی پوری تاریخ سے آگاہی کا موقع فراہم کیا ہے۔ اس ضمن میں حکیم غلام جیلانی کی تاریخ الاطبا کو اولیت حاصل ہے جو 1913 میں منظر عام پر آئی۔ پھر 1915 میں انھیں کی دوسری کتاب 'رموز الاطبا' شائع ہوئی۔ ان دو کتابوں کی وجہ سے اردو زبان کو طب یونانی کی مبسوط تاریخ حاصل ہوئی اور اب بہت سی کتابیں اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں۔

طب یونانی سے وابستہ بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جو شاعر وادیب تو نہیں تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اردو کی مثالی خدمات انجام دی ہیں، اور مختلف طبی علوم پر بھی اس طرح کی سیکڑوں کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جو عربی و فارسی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ ان تراجم نے جہاں اردو زبان کے نثری سرمایے میں اضافہ کیا وہیں اردو کو سیکڑوں ایسے محاورات، اصطلاحات اور تراکیب عطا کیں جو زبان زد خلائق ہیں۔ مثال کے طور پر 'نسخہ کیمیا'، 'خاک شفا'، 'دست شفا'، 'دار الشفا'، 'بخار چڑھنا'، 'بخار اترنا'، 'دق ہونا'، 'شافی مطلق'، 'صحت گاہ بول وبراز'، 'نبض پر انگلی رکھنا'، 'مزاج شناسی'، 'کافور ہونا' طاق نسیاں ہونا' وغیرہ۔ انھیں ترجموں کی مدد سے مختلف طبی علوم پر طبع زاد درسی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ ان تمام کتابوں نے جہاں اردو کے علمی سرمایے میں اضافہ کیا وہیں اردو کو معاشی وسائل سے جوڑنے کا بھی کام کیا۔ آج بھی ہم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ جس زبان کا تعلق معاشی وسائل سے جتنا مضبوط ہے وہ اسی رفتار سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اسی قدر اس کا

مستقبل محفوظ ہے۔ اردو زبان آج جس کسمپرسی کی حالت میں ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ معاش سے اس کا تعلق کمزور ہے۔ یہ خاص احسان ہے طب یونانی کا اردو زبان پر، کہ اس نے جہاں اردو زبان و ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافے کیے وہیں اسے معاشی وسائل بھی فراہم کیے ہیں۔

طب یونانی نے اردو زبان کے علمی اور ادبی سرمایے میں جہاں اضافہ کیا ہے وہیں اردو صحافت کو بھی فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اردو صحافت کو طب یونانی سے دو اعتبار سے فائدہ ہوا ایک تو یہ کہ طبی جرائد ورسائل کثیر تعداد میں نکالے گئے جن سے اردو صحافت کو فروغ ہوا، دوسرے یہ کہ دیگر اردو رسائل وجرائد کو اطبا کی طرف ہمیشہ کثرت سے اشتہارات ملتے رہے، اور آج بھی مل رہے ہیں۔ جس نے ان کی عمروں میں اضافہ کیا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ طب یونانی نے جہاں خود کثرت سے رسائل نکالے ہیں وہیں دوسرے علمی وادبی اردو رسائل کو اپنے اشتہارات کے ذریعے استحکام عطا کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان طبی رسائل وجرائد میں بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے متنوع مضامین اور خاص انداز بیان کی وجہ سے اردو کو مقبول خاص وعام بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو کی خدمت طب یونانی نے یہیں تک نہیں کی بلکہ اردو کے فروغ میں طبی جامعات اور ادارے نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ملک میں موجود تقریباً دو درجن طبی جامعات ایسی ہیں جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اردو زبان میں درسی کتابیں نصاب میں داخل ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں ان میں داخلے کی شرائط میں اردو لکھنا اور بولنا بھی شامل ہے۔ جس کے لیے دسویں یا بارہویں میں اردو ایک مضمون کے طور پر ہونا لازمی ہے۔ نتیجتاً طلبا داخلے کی غرض سے اردو سیکھتے ہیں۔

جن علوم کے ذریعے اردو زبان و ادب کو اس قدر فروغ حاصل ہوا۔ افسوس ہے اس پر اس مناسبت سے تحقیقی کام نہیں ہوسکا جس کا یہ مستحق ومتقاضی تھا۔ ضرورت ہے کہ اردو داں طبقہ اس طرف متوجہ ہو آج بھی ملک کی لائبریریوں میں ہزاروں کی تعداد میں مختلف طبی علوم وفنون اور علمی و ادبی کارناموں پر مشتمل اطبائے کرام کے مخطوطے اشاعت کے مراحل سے گزرنے کے منتظر ہیں۔ اس پر تحقیقی کام کی حد درجہ ضرورت ہے۔ اس تعلق سے بھی اس موضوع پر سیمینار کا انعقاد ایک خوش آئند قدم ہے۔ اس میں اور اضافہ ہونا چاہیے۔

میری اب تک کی گفتگو صرف اسی ایک پہلو پر تھی کہ طب یونانی نے اردو زبان وادب کی خدمت میں حصہ لیا لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ طب یونانی پر اردو زبان کا احسان بھی کچھ کم نہیں ہے۔ طب یونانی ہندوستان میں جب تک عربی و فارسی کے دوش پر سوار رہی اسے وہ ترقی نصیب نہیں ہوئی جو ترقی اور مقبولیت اردو زبان سے تعلق ہونے کے بعد اس کے حصے میں آئی۔ بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے طب یونانی کے مطب کا کام اردو زبان میں ہونے لگا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے طب یونانی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ حکیم صاحبان گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں نظر آنے لگے۔ لیکن افسوس ہے جس زبان نے بہتوں کو سہارا دیا آج عصبیت کا شکار ہو کر اپنی بقا کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔

ضروری ہے کہ محبان اردو آگے آئیں اور اس کی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ اور اس کا سب سے بہتر طریقہ ہے کہ ہم اردو کو زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل فراہم کریں۔ شکریہ

■

Prof. Akhtarul Wasey, Commissioner for Linguistic Minorities in India Government of India, **Off.** 110, Paryawaran Bhavan, CGO Complex, Lodhi Road, New Delhi - 110003. **Residence:** A-110, Akhan Abdul Ghaffar Khan Enclave (Jamia Enclave), Jamia Nagar, New Delhi -110025

ندیم احمد

آزادی کے بعد اردو شاعری میں جدیدیت کا رجحان

1947 میں ملک کی آزادی کے ساتھ ہندوستانی عوام کومسرت وغم کے ملے جلے احساسات سے دو چار ہونا پڑا۔ ایک طرف ہندوستانی عوام کو انگریز حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی خوشی تھی تو وہیں ملک کے تقسیم ہوجانے کا رنج بھی تھا یہ ایک تلخ تجربہ تھا۔

ہرحال میں عوام کو برداشت کرنا ہی تھا۔اردو شعرا نے اس آزادی کا استقبال بھی کیا اور اس کا ماتم بھی منایا آنند نرائن ملا، مجاز اور جوش جیسے شعرا نے اس آزادی کا استقبال اور اس پر اپنی خوشی کا اظہار والہانہ انداز میں کیا۔ یہ لوگ اب خود کو آزاد سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک اب وہ اپنی ہر پریشانی کو خود ہی دور کرسکتے تھے۔اسی مستی کے عالم میں جوش نے 'ترانہ آزادی'، نامی نظم لکھ کر اپنے جذبات کو پر مسرت انداز میں پیش کیا مگر جلد ہی وہ اس آزادی کی حقیقت کو سمجھ گئے۔

لہٰذا 'ماتم آزادی' نامی نظم لکھ کر اسی آزادی کا ماتم بھی کرنے لگے اس کا اثر اردو کے ایک دوسرے شاعر فیض پر بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور وہ اپنی نظم 'صبح آزادی' میں یہ کہنے کو مجبور ہوگئے کہ یہ وہ سحر نہیں ہے جس کی آرزو ہم نے کی تھی۔

آزادی پر یہ نظریات اشتراکی ذہن رکھنے والے چند ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں نے سب سے پہلے ظاہر کیے تھے اور ان کا یہ عقیدہ ہو چلا تھا کہ یہ حقیقی آزادی نہیں بلکہ ایک مصنوعی آزادی ہے۔ ہندوستان میں کمیونسٹ نظریات کے حامیوں نے اسے جھوٹی اور غیر مکمل آزادی کہہ کر سماجوادی نظام کو قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ مارکسی نظریات کے حامی تو اس سے بھی آگے بڑھ کر اس بات کی تشہیر میں لگ گئے کہ جسے ہم آزادی کہہ کر رقص کرتے ہیں وہ دراصل ایک حسین دھوکا ہے کیونکہ اس آزادی سے تو صرف اتنا ہی ہوسکا کہ نظام بیرونی لوگوں سے چھوٹ کر ایسے مقامی لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے جو نظریات تفرق کے لحاظ سے اُن گوروں کے کس درجہ بھی کم نہیں تھے۔ مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے ساتھ اب بھی لوٹ کھوٹ، ناانصافی، ظلم، جبر اور استحصال کا دور دوراں ہے۔علی سردار جعفری نے اس وقت نظم 'آزادی۔ آزادی' لکھ کر آزادی کا جشن منانے والوں سے بیحد سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا تھا:

کون آزاد ہوا؟
کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی؟
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا؟
مادرِ ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی!

جب مادرِ ہند کے چہرے پہ ہی اداسی ہے تو آپ اتنے خوش وخرم کیوں ہیں۔ دراصل اس دور کے ترقی پسند شعرا کا یہ خیال تھا کہ جب تک ہمیں سماجی اور معاشی جکڑ بندیوں سے فراغت نہیں مل جاتی تب تک آزادی بے معنیٰ ہے۔آزادی کا مطلب ومقصد غریب اور مظلومین کے استحصال کا مکمل خاتمہ ہونا چاہیے اور جب تک یہ استحصال ختم نہیں ہوتا عوام کا ایک بڑا طبقہ غلام ہی بنا رہے گا۔ اختر الایمان نے اس جانب 15 اگست' نامی نظم میں بہت واضح طور پر اپنے مشاہدات واحساسات کی ترجمانی کی ہے ان کے مطابق حالات اب بھی غلامی کے دنوں جیسے ہی ہیں وہی استحصال اور ناانصافی کا دور اب بھی موجود ہے۔خاص بات تو یہ ہے کہ یہ ہماری محنتوں کا ثمرہ ہو ہی نہیں سکتی۔

وہی کسمپرسی وہی بے حسی ہر طرف کیوں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں
ابھی تو وہی رنگِ محفل، وہی ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو، یہ وادی رنگ تھی میری منزل نہیں

اس مصنوعی اور نامکمل آزادی کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں ایک ایسا المیہ بھی پیش آیا جو ہمارے ملک کے لیے غیر فطری تھا کیونکہ یہ آزادی ہمیں فرقہ واریت کے زیر اثر حاصل ہوئی اس کی حصولیابی کے لیے عوام کو اس وحشت ناک فساد کا سامنا کرنا پڑا جو ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی ایک بدنما داغ کہا جاتا ہے لوٹ، قتل وغارت، عصمت دری اور انسانیت سوزی کا ایسا خوفناک منظر دیکھ کر حیوانیت تک کی روح کانپ اٹھی۔ اس سلسلے میں پیش رفت کرتے ہوئے اردو شعرا نے امن وامان قائم رکھنے اور اتحاد و بھائی چارہ کو برقرار رکھنے کی غرض سے کئی معنی خیز اور جذباتی نظمیں لکھیں اختر الایمان نے 'آزادی کے بعد' نامی نظم میں ہندوستان کی ان ماؤں سے جو بہادر بیٹے پیدا کرنے کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں یہ سوال کیا تھا کہ تم نے ان ناگوں کو دودھ کیوں پلایا جنھوں نے ملک کے اتحاد، چین وامن، سکون، گنگا جمنی تہذیب اور بھائی چارگی کا قتل کر دیا:

تمھارے سپوتوں نے اے ماؤ بہنو!
جو کل تک تھے معصوم اور بھولے بھالے
تمھارے ہی محرم پہ کیوں ہاتھ ڈالا
یہی تھے تمھارے فغاں سننے والے؟
اگر جانتی تھیں مآل محبت
تو کیوں اپنے ہی دودھ سے ناگ پالے

اس طرح ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے بھی پنجاب کے فساد اور تقسیم کے سانحہ پر بہت دل سوز نظم لکھی جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تقسیم ہند سے نہ صرف دو ملک بنٹ گئے بلکہ اس نے زندگی کی تمام چیزوں کے علاوہ دلوں کو بھی الگ تھلگ کر دیا ہے:

اور نتیجے میں ہندوستاں بنٹ گیا
یہ زمیں بنٹ گئی، آسماں بنٹ گیا
طرز تحریر طرز بیاں بنٹ گیا
ہم نے دیکھا تھا جو خواب ہی اور تھا
اب جو دیکھا تو پنجاب ہی اور تھا

یہ حالات صرف تقسیم کے وقت ہی نہیں تھے آج بھی ویسے ہی ہیں۔ ملک کا تقسیم ہونا کس قدر غلط تھا اس کا اندازہ آج بھی لوگوں کو ہو رہا ہے۔ پنجاب اور کشمیر آج تک اس تقسیم اور فساد کی آگ سے خود کو الگ نہیں کر پائے اب بھی وہاں رہ رہ کر دہشت گردی کا ماحول بنا ہوا ہے۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد ملک نے مشکل دن دیکھے مگر کچھ عرصے بعد جمہوری نظام نے عوام کو ترقی کی راہ پر لے جانے کا سنہری خواب واحساس کرایا اس بدلتے دور میں شاعروں کا ذہن بھی ملک کے سماجی اور معاشی مسائل کی جانب متوجہ ہوا۔ آزادی کی روشنی میں شاعروں نے جہاں زندگی کے حقائق کی تلاش میں اپنے ذہن ودل کے ساتھ خود کو بھی مصروف کرنا شروع کیا تو وہیں کچھ وقت ملک کو خوشحال بنانے والے ذرائع اور طریق کار کو حاصل کرنے کی جستجو میں بھی صرف کرنا شروع کر دیا ان کی نظر اب اُن مسائل پر بھی تھی جو ملک کی ترقی اور سالمیت میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ 1950 کے بعد اردو نظم کا ایسا جدید دور شروع ہوا جس میں شعرا کی بصیرت اور آگہی اس نئی دنیا یا نئے زمانے کے لوگوں کی زندگی کے اردگرد اپنے موضوعات کا محور ومرکز بنائے ہوئی تھی۔ نیا دور، نئی زندگی اور نو امیدی کے ساتھ آزاد ہندوستان کی ترقی کا سفر شروع ہوا اس بصیرت اور فکر انگیزی نے اردو نظم کو نئی تحریک وتبدیل کے طور پر پیش کیا جسے جدید نظم کی تحریک کہا جاتا ہے۔

اردو کی اس نئی نظم پر ماڈرنزم پوری طرح سے حاوی تھا۔ جدید نظم کے شعرانے زندگی کی مشکلات اس کے مسائل اور دشوار کن حقائق کو بیان کرنے کے لیے نئی زبان اور نئے فن کا آغاز کیا زندگی کے تلخ تجربات ومعاملات کو سمجھنے کے لیے یہ سب ضروری مانا گیا مگر ان نئے شعرانے جدیدیت کے نام پر زندگی کی تھکا دینے والی حالتوں کو بیان کرنے کے لیے اس قدر مشکل وبوجھل نظمیں لکھنی شروع کردیں کہ قاری کی تو بساط کیا ادبی ناقدوں کے بھی سر انھیں پڑھ کر چکرانے لگے۔ غیر مناسب منظر کشی، غیر ضروری علامتوں اور غیر فطری تراکیب کے استعمال کی کثرت کی بدولت 'جدید نظم' کے معیار میں کمی آنے لگی۔

اردو میں نئی یا جدید نظم کی تحریک سے پہلے 'راشد' جیسے شعرا کا جو زور واثر رائج ہو چکا تھا اسے اس تحریک نے بہت کمزور یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ختم کر دیا تھا۔ جدید نظم کے شعرا نے لارینس، جوائس، کامو، ینگ وغیرہ کے علاوہ اینگری ینگ مین بیٹس جنریشن اینٹی پوئٹری وغیرہ جیسی مغربی شعری روایتوں سے بھی ترغیب حاصل کی تھی۔

1950 اور 1960 کے درمیان جدید شاعرانہ بصیرتوں کے ساتھ اردو میں جو نظم گو شعرا جلوہ گر ہوئے ان میں باقر مہدی، عمیق حنفی، مظہر، راہی معصوم رضا، خلیل الرحمن اور بلراج کومل کافی اہم ہیں۔ خلیل الرحمن اعظمی نے کاغذی پیراہن، آئینہ خانے میں، نیا عہد نامہ، عمیق حنفی نے سنگ پیراہن، راہی معصوم رضا نے 'رقص مے'، 'اجنبی راستے'، 'اجنبی شہر' اور بلراج کومل نے 'میری نظمیں'، 'دل کا رشتہ' وغیرہ شعری مجموعات لکھ کر جدید نظم کو بلندی ومقبولیت عطا کی۔

ندا فاضلی کی نظم 'ایک تصویر' اس ضمن کی ایک نہایت عمدہ نظم کہی جا سکتی ہے جس میں انھوں نے اپنے محبوب کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس میں زندگی کے تمام رنگ روشن نظر آتے ہیں۔

صبح کی دھوپ / دھلی شام کا روپ / فاختاؤں کی طرح سوچ میں ڈوبے تالاب / اجنبی شہر کے آکاش / اندھیروں کی کتاب / پاٹھ شالا میں چہکتے ہوئے معصوم گلاب / گھر آنگن کی مہک / بہتے پانی کی کھنک / تم کو دیکھا تو نہیں ہے لیکن / میری تنہائی میں رنگ برنگے منظر / جو بھی تصویر بناتے ہیں وہ تمھارے جیسی ہے۔

اسی عوامل کی دوسری نظموں میں، ہم اختر الایمان کی ایک لڑکا اور بلراج کومل کی نظم 'درد کا لمحہ' کو بھی شامل کر سکتے ہیں جن میں جدید نظم کی جدید تخلیقیت اور تخیل کی فراوانی کے عنصر کی بہتات ہے، فکر کی بالیدگی ہے اور کچھ نیا تلاش کرنے کی حسرت بھی پوشیدہ ہے۔

جدید نظم کے شعرا نے جدید زبان، نئی علامتوں اور جدید تراکیب پر کافی زور دیا اور شاعری میں نظریات کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے بھی نئے نئے تجربات پیش کیے۔ اسی وجہ سے شمس الرحمن فاروقی جیسے ناقد کو بھی یہ کہنا پڑا کہ ''نئی شاعری دل سے زیادہ ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ ایسا اس وجہ سے نہیں ہے کہ دل کو متاثر کرنا مشکل ہے بلکہ اس وجہ سے کہ جدید شاعری جذبات کے الجھاؤ کو ٹھوس زبانوں میں ظاہر کرنا چاہتی ہے۔''

اردو کی اس نئی نظم پر ماڈرنزم پوری طرح سے حاوی تھا۔ جدید نظم کے شعرا نے زندگی کی مشکلات اس کے مسائل اور دشوار کن حقائق کو بیان کرنے کے لیے نئی زبان اور نئے فن کا آغاز کیا زندگی کے تلخ تجربات ومعاملات کو سمجھنے کے لیے یہ سب ضروری مانا گیا مگر ان نئے شعرا نے جدیدیت کے نام پر زندگی کی تھکا دینے والی حالتوں کو بیان کرنے کے لیے اس قدر مشکل وبوجھل نظمیں لکھنی شروع کر دیں کہ قاری کی تو بساط کیا ادبی ناقدوں کے بھی سر انھیں پڑھ کر چکرانے لگے۔ غیر مناسب منظر کشی، غیر ضروری علامتوں اور غیر فطری تراکیب کے استعمال کی کثرت کی بدولت 'جدید نظم' کے معیار میں کمی آنے لگی۔ 1960 کے بعد جدید نظم میں گذشتہ روایتوں کو اور زیادہ تقویت دی جانے لگی ان روایتوں کی تشہیر کا

ذمہ پاکستان سے شائع ہونے والے رسائل 'سات رنگ'، 'نصرت' اور 'سویرا' کے سر جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس تشہیر کے علمبردار 'شب خون' اور 'سوغات' جیسے ادبی جرائد رہے۔ 1960 کے بعد جدید نظریات اور نئے شعر وفن کی فکر لیے جن اردو شعرا نے ادبی شمع کو روشن کرتے ہوئے اس کی پاسداری کی ان میں شہریار، افتخار جالب، زاہدہ زیدی، ول کرن اشک اور حسن کمال اور کے نام سرِفہرست ہیں۔

1960 کے بعد اردو نظم میں جدید نظریات کی ترقی کے ساتھ ساتھ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول سے عوام کو بیدار کرانے اور اسے حسب ضرورت تجاویزی طور پر پیش کرنے کی فکر بھی پیدا ہوئی۔ اردو نظم جو کبھی تنہائی ویکتائی کا متبادل سمجھی جاتی تھی وہ آزادی کے بعد ملک کی ترقی کے مختلف ادوار سے خود کا ناطہ جوڑ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگی تھی اردو کی جدید نظم کے عروج میں اشتراکی مزاج رکھنے والے شاعر بھی کچھ حد تک اپنے نظریات اس میں شامل کراتے رہے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب اردو نظم سماجی ضروریات کی بھی عکاسی پیش کرنے لگی۔ 1970 کے بعد ہندوستان میں جب جمہوری شعور تیزی سے بڑھنے لگا تو اردو نظم میں بھی ان عوامی مسائل وضروریات کی تصویر کشی کی جانے لگی ساتھ ہی لوگوں کی ضروریات کی نشاندہی کرنا بھی نظم کے شعرا نے اپنا فرض سمجھا۔ درحقیقت آزادی کے بعد اردو نظم وقت اور سماج کی ضرورت کے طور پر کچھ اس طرح گھل مل گئی کہ اس نے حالات کے مدنظر خود کو بھی تبدیل کرلیا اور سماجی تناظر میں بھی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی اور اسی میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہی۔

اس طرح آزادی کے بعد اردو نظم کا دائرۂ کار بہت وسیع رہا ہے اس میں فرد کی زندگی کی دشواریوں کے ساتھ قوم اور ملک کے مسائل کا ذکر تو ہے ہی بین الاقوامی مسائل کی جانب بھی اس کی پوری توجہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو شعرا نے چین، کوریا، مصر، ایشیا، ایران، روس اور فلسطین وغیرہ ممالک کے مسائل سے متعلق بھی کئی فکری اور جذباتی نظمیں لکھیں خاص طور پر فیض نے 'انقلابِ روس'، 'ایرانی طلبا کے نام' اور 'فلسطینی بچوں کی لوری' نامی جو نظمیں لکھیں وہ ان کے ادراک وشعور، انسان دوستی اور محبت کے علاوہ امن وسکون کی جستجو کے لیے ان کے حساس نظریات کو عیاں کرتی ہیں۔

آزادی کے بعد اردو نظم سے متعلق ایک حقیقت یہ بھی رہی کہ ان نظم گو شعرا نے سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کو پیش کرنے اور زندگی کی جدوجہد کو گوشۂ تحریر بنانے کے لیے جن نئے موضوعات پر آزادروی کے ساتھ شاعری کی اور نظم کی ہیئت میں بھی نئے نئے تجربے کیے اور ایسا کرتے ہوئے وہ فکری اور شعوری طور پر آزاد رہنے اور آزاد خیالی کے ساتھ چیزوں کو سمجھنے کے اس قدر عادی ہو گئے کہ انھوں نے نظم کو بھی 'آزاد نظم' بناڈالا جو کافی حد تک مقبول بھی ہوئی مگر عطر شاعری یعنی غزل کو نہ تو یہ جدید نظم اور نہ ہی آزاد نظم نقصان پہنچا سکی۔

غزل کی اہمیت حسب دستور آزادی کے بعد بھی اپنی جگہ اُسی آب وتاب اور اُسی آن، بان، شان کے ساتھ مسلّم رہی فیض، جوش، جگر اور فراق جیسے پرانی نسل کے شعرا نے تو اس عظیم صنف کو گلے سے لگا ہی رکھا تھا مگر نئی نسل کے شعرا نے بھی اِسے اتنے ہی خلوص کے ساتھ اپنایا اور اس میں نئے نئے موضوعات پیدا کرنے کی سعی کی۔ 1950 سے 1960 کے درمیان ابن انشا، منیر نیازی، ظفر اقبال اور 1960 کے بعد عادل منصوری، بشیر بدر، ندا فاضلی ول کرشن اشک اور شین کاف نظام نے غزل کے دامن کو اور بھی وسعت دی ساتھ ہی اس میں موضوعات کے نئے سرچشمے کھول کر اسے لازوال ہی نہیں بلکہ اور بھی مالا مال بنادیا۔ آزادی کے بعد اردو غزل میں شعرا نے ذاتی تجربات ومشاہدات کی بنا پر عصری مسائل کے ساتھ رومانی معاملات کو بھی پیش کیا۔

آزادی کے بعد اردو نظم سے متعلق ایک حقیقت یہ بھی رہی کہ ان نظم گو شعرانے سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کو پیش کرنے اور زندگی کی جدوجہد کو گوشہ تحریر بنانے کے لیے جن نئے موضوعات پرآزاد روی کے ساتھ شاعری کی اور نظم کی ہیئت میں بھی نئے نئے تجربے کیے اور ایسا کرتے ہوئے وہ فکری اور شعوری طور پر آزاد رہنے اور آزاد خیالی کے ساتھ چیزوں کو سمجھنے کے اس قدر عادی ہوگئے کہ انھوں نے نظم کو بھی 'آزادنظم' بناڈالا جو کافی حد تک مقبول بھی ہوئی مگر عطر شاعری یعنی غزل کو نہ تو یہ جدید نظم اور نہ ھی آزاد نظم نقصان پہنچاسکی۔

شعرا نے ذاتی خوشی اور غم، امید وناامیدی اور محبت وبے وفائی جیسے موضوعات پر غزلیں لکھیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اس دور میں رائج سماجی سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کو بھی غزل کے سانچے میں ڈھال کر انھوں نے غزل کے روایتی انداز میں جدیدیت کی چاشنی گھول کر ایک انقلابی تبدیلی پیش کی جس کے لیے فراق کی غزل کی وہ تراکیب سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہیں یعنی کچھ غم دوراں، کچھ غم جاناں، میں تبدیل ہونے لگا جسے اب ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا تھا آگے چل کر یہ دونوں غم جذبی، مخدوم اور مجروح کی غزلوں میں ایک دوسرے کے اور بھی قریب آجاتے ہیں۔

جس غزل کو اب تک محض عورتوں سے یا پھر عورتوں کی باتیں کرنا تک ہی محدود سمجھا جاتا تھا وہ اب لامحدود ہوگئی تھی۔ اس جدید غزل میں رومانیت کم اور زندگی سے جڑی دشواریوں، الجھنوں اور ضرورتوں سے سامنا کرنے کی تجاویز تلاش کی جانے لگی تھی۔ غزل میں بھی اب وہ سب کچھ کہا جانے لگا جو کبھی صرف نظم کے لیے ہی مخصوص سمجھا جاتا تھا ان نئے شعرا نے اردو غزل کو نئی زمین، نئی زبان اور نیا آہنگ وشعور عطا کیا جس میں فکر بھی تھی، سنجیدگی بھی اور متانت بھی۔ یہ موضوعاتی خشکی اور پھیکے پن سے اب مبرا ہو چکی تھی۔ شین کاف نظام کی غزلوں کے یہ اشعار روایتی غزل کے بدلے ہوئے مزاج کی ومنظر نامے کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے فن میں ہونے والی تبدیلی کو بھی عیاں کرتے ہیں:

غم کی ندی میں عمر کا پانی ٹھہرا اٹھہرا لگتا ہے
یہ فقرہ جھوٹا ہے لیکن کتنا سچا لگتا ہے
اس بستی کی بات نہ پوچھو اس بستی کا قاتل بھی
سیدھا سادا، بھولا بھالا، پیارا پیارا لگتا ہے

پہلے زمین بانٹی تھی پھر گھر بھی بنٹ گیا
انسان اپنے آپ میں کتنا سمٹ گیا
ہم منتظر تھے شام سے سورج کے دوستو!
لیکن وہ آیا سر پہ تو قد اپنا گھٹ گیا

آزادی کے بعد سے لے کر 1980 تک کی اردو شاعری کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی زمینی شناخت کو قائم رکھنے کے ساتھ ہندوستان ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی ماحول اور اس ماحول میں پیش آنے والے واقعات وحادثات سے خود کو جاذب کرلیا اور یہ ادب کے لیے اور بھی خوش آئند قدم تصور کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس دور کی اردو غزل بھی نظم کے پیش پیش ادبی تقاضے کے عین مطابق یعنی سماج کے ذریعے اور سماج کے لیے اور سماج کی ضروریات کو سامنے رکھ کر کی جارہی اور یہ وسعت آج بھی جاری ہے۔

■

Dr. Nadeem Ahmed, C-36/5, Lane No-2, R.K.Marg, Chauhan Banger, Delhi-110053

خواجہ فراز بادامی

اردو عروض کی 50 سالم بحریں
ایک تجزیاتی مطالعہ

ادب کی دنیا میں معدودے چند حضرات ہی ایسے ہوتے ہیں جنھیں عروض جیسے خشک و دقیق فن سے خاصی دلچسپی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں بھی بیشتر اس فن کی باریکیوں سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔ شعرا حضرات تو بس رواں بحروں میں طبع آزمائی کو کافی سمجھتے ہیں اور ان کے عمر بھر کے شعری اثاثے کا جائزہ لیا جائے تو صرف چند گنے چنے اوزان میں ان کا کلام پایا جاتا ہے۔ بزعم خویش عروضیوں کی بات ہی کچھ اور ہے انھیں اس بات کا مطلق علم نہیں ہوتا کہ آخر اردو میں عروض کی کتنی سالم بحریں مروج ہیں اس میں مفرد کتنی، مرکب کتنی، مثمن کتنی اور مسدس کتنی ہیں۔ مربع یا مضاعف سے کیا مراد ہے کوئی کہتا ہے کہ سالم بحور سیکڑوں کی تعداد سے تجاوز کر جاتی ہیں، اور کوئی کہتا ہے کہ 75 یا 80 سے زائد ہو سکتی ہیں کسی کو تو اندازہ ہی نہیں۔ تھوڑا بہت عروض جاننے والا 19 سالم بحروں کی بات کر کے دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے۔ اور موزوںِ طبع حضرات تو مولانا رومی کے اس شعر کے آڑ میں:

شعر می گویم بہہ از آبِ حیات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

اپنے دامن کو بچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ 19 سالم بحور کی بات صرف بحورِ مثمنہ کی حد تک درست ہوگی۔ جس میں سات (7) مفرد، باقی بارہ (12) مرکب ہوئیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عروض جاننا ایک الگ بات ہے عروض کی باریکیوں اور اس کی پیچیدہ آہنکوں کو سمجھنا بالکل الگ چیز۔

اس فن کا موجد ابوعبدالرحمان خلیل بن احمد بصری فرہودی ملی ہے۔ آج کی تحقیق کے مطابق وہ ایرانی بھی کہلاتا ہے جس کی پیدائش تابعین کے دور میں ہوئی ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے اس فن کو 'صوتِ کوبہ گاذر' سے استخراج فرمایا اور اس کی بنیاد (افاعیل تفاعیل) کے لیے 'ف ع ل' پر رکھی۔ تشکیل ارکان کے لیے 'اصول سہ گانہ' سبب، وتد، فاصلہ قائم کیا۔ موصولِ بحورِ حقیقی کے لیے دائروں کو وضع کیے مسلمہ قوانین ترتیب دیے۔ اصولِ زحافات تراشے۔ حکم معاقبہ بنایا۔ اصطلاح میں اس علم کا نام جس سے کلام کا موزوں یا ناموزوں ہونے کو پرکھا جانا ہے عروض رکھا۔ جس کے ایک معنی کعبہ شریف کے ہیں۔ تا حال اس کے مطابق کل پچاس (50) سالم بحریں ہوتی ہیں۔

بحروں کی تفصیل یوں ہے کہ خلیل بن احمد بصری نے کل پندرہ (15) بحریں ایجاد کی ہیں:

(1) متقارب، (2) ہزج، (3) رجز، ((4 رمل، (5) وافر، (6) کامل (مفرد بحریں کل 6) (7) طویل، (8) بسیط، (9) مدید، (10) مضارع، (11) مجتث، (12) مقتضب (13) سریع، (14) منسرخ، (15) خفیف، (مرکب بحریں کل 9) مجموعی تعداد مفرد و مرکب بحورِ خلیل۔

بعدہٗ مزید چار بحریں ایجاد ہوئیں جو اس طرح ہیں۔

(1) بحرِ متدارک، ابوالحسن اخفش

(2) بحر جدید، بزرچمہر

(3) بحر قریب، مولانا یوسف نیشاپوری

(4) بحر مشاکل۔ کسی نامعلوم کی ایجاد

ایک وضاحت یہ ہے کہ بحر متدارک ابوالحسن اخفش کی ایجاد بتائی جاتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دائرے سے ایک بحر وضع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے قاعدۂ مقلوب کے تحت بحریں وضع پاتی ہیں اور یہ بھی اصول ہے کہ ہر دائرہ وتدِ مجموع سے شروع ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بحر متقارب، **فعولن فعولن فعولن فعولن** بھی دائرے سے ایک ہی وضع نہیں کی گئی ہوگی۔ قرین قیاس ہے کہ اس کی معکوس صورت فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن (بحر متدارک) جو اسی دائرے سے وضع ہوتی ہے۔ اسے خلیل نے مذاقِ عربی شاعری کے مطابق ضروری نہ سمجھا ہو۔ بعد میں چل کر اخفش نے اس کی باریکی و اہمیت کو سمجھ کر وضع کی ہو اور کسی دائرے سے جو بحر با قاعدہ حاصل ہوتی ہے اس سے گریز درست نہیں سمجھا۔ یہ اخفش کی ایجاد نہیں دریافت مانی جا سکتی ہے۔

کچھ ایسا ہی سوال بحر جدید، بحر قریب، بحر مشاکل کے بارے میں بھی اٹھایا جا سکتا ہے جب کوئی بھی بحر کسی دائرے سے ایک ہی وضع نہیں کی جا سکتی ہے تو یہاں ان بحور کو دوسروں کی ایجاد ماننے کی کیا وجہ ہے۔ حقیقتاً یہ سالم بحور بھی دائرہ خلیل کے (دائرہ متوافقہ یا متشبہ مسدسہ اور مثمنہ) کے چکر سے ہی استخراج پاتی ہیں۔ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

دائرہ متوافقہ یا مشتبہ مسدسہ سے کل نو (9) بحریں استخراج پاتی ہیں۔ خلیل نے اس کی دو بحریں بحر قریب اور بحر جدید جو اسی دائرے سے نکلتی ہیں سالم بحور میں شمار نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اس دائرے کو جس اصول کے تحت ترتیب دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا پہلا رکن اور دوسرا رکن وہی ہے جو دائرہ مثمنہ کے بحور میں ہے تیسرا رکن بدل کر آیا ہے۔ یعنی رکن اول مجموعی والا رکن ہو تو اور رکن دوم مفروقی والا ہے اور تیسرا رکن وتدِ مجموعی والا ہی ہونا چاہیے۔ یہی التزام اس دائرے کے بحور میں رکھا گیا ہے جبکہ یہ بات متذکرہ بحور میں نظر نہیں آتی اس لیے چھوڑ دیا ہو۔ لیکن اب بھی ایک بات غور طلب ہے کہ بحر سریع مسدس میں بھی اس طرح کا التزام نہیں ہے اور یہ خلیل کی ایجاد میں شمار ہے۔ جبکہ بحر قریب اور بحر جدید اسی دائرے سے استخراج پاتے ہوئے بھی دوسروں کے نام سے منسوب ہیں۔

بحر مشاکل جو دائرہ خلیل متوافقہ یا مشتبہ مثمنہ سے ماخذ ہوتی ہے خلیل کی ایجادات میں شمار نہیں ہوتی بات تحقیق طلب ہے میں نے تو عروضی تجزیے کی روشنی میں پیش کی ہے۔

اس سے پہلے کہ تمام دائروں کا تجزیاتی مطالعہ کر لیں پہلے اس بات کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ دائرہ کیا ہے۔ استخراج بحور کے لیے اس کے کچھ اصول و شرائط بھی مقرر ہیں۔ یہ ایک سائنٹفک ترتیب سے تشکیل دیا جانے والا اصول ہے، جس میں ارکان آگے پیچھے ہو کر ترتیب پاتے ہیں۔ ارکان جن کو افاعیل، تفاعیل یا اصول کہتے ہیں کل دس ہیں جن کو ارکان

عشرہ بھی کہتے ہیں اور وہ یہ ہیں؛

فَعولُن، فَاعلُن، مفاعیلن، مس تف علن، فاعلاتن، مفاعلتن، متفاعلن، مفعولات، فاع لاتن، مس تفع لن۔

یہ دس سے زائد نہیں آسکتے اور اس سے کم بھی نہیں ہوسکتے۔

جناب شمس الرحمن فاروقی صاحب صرف آٹھ ارکان کا تذکرہ کرتے ہیں اور دو ارکانِ مفروقی ''فاع لاتن۔ مس تفع لن'' کو اس میں شامل نہیں سمجھتے یہ ان سے تسامح ہوا ہے۔

انھی آٹھ افاعیل کے الٹ پھیر سے مختلف نمونے بنائے گئے ہیں جنھیں 'بحر' کہتے ہیں (ص 19 درس بلاغت) بعض حالات میں مستفعلن اور فاعلاتن کو توڑ کر لکھتے ہیں''(ص 19 درس بلاغت)

مس تف علن اور فاعلاتن کو توڑ کر لکھا نہیں جاتا بلکہ وہ خود دائرے کے چکر میں ٹوٹ کر آتے ہیں اور انھیں ایسا ہی لکھنا چاہیے ورنہ بڑی بے راہ روی پیدا ہوگی، جیسے کہ درس بلاغت کے صفحہ نمبر 91 پر درج بحر جدید، بحر خفیف، بحر قریب، بحر متشاکل کے املائے ارکان غلط تحریر کیے گئے ہیں۔ مضحکہ خیز ایک بات ہے یہ بھی دیکھیے کہ انھوں نے بحر مجتث کے ارکان مفروقی کو مجموعی لکھا ہے اور مجموعی کو مفروقی یعنی مس تفع لن۔ فاعلاتن کو مس تف علن فاع لاتن کے غلط املے سے لکھا ہے۔

مفروقی اور مجموعی ارکان میں ایک خفیف سا امتیاز ہے جسے روا رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہاں یہ بتانا غیر ضروری نہیں کہ بحروں کے املائے ارکان غلط لکھے جانے سے اس پر زحافات کا عمل بھی غلط طریقے سے وارد ہوگا۔ مفروقی والے رکن پر مجموعی رکن سمجھ کر زحافات کا عمل کریں گے تو غیر حقیقی اوزان ہی برآمد ہوں گے۔

دائروں میں اجزائے اولیہ کو اصول وشرائط کی پابندی کے ساتھ مخصوص طریقے سے رکھا جاتا ہے پھر ان کے چکر کچھ اس طرح لگائے جاتے ہیں کہ ان میں ارکان عشرہ کی الٹ پھیر ہوتی ہے اور یہ ایک سے دوسرے حاصل ہوتے ہیں مثلاً بحر متقارب مثمن فعولن فعولن فعولن فعولن سے لن فعولن فعولن فعولن فعو یعنی بحر متدارک مثمن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن۔

اس بحر کو ہی حقیقی قرار دیا گیا جو کسی دائرے سے ماخذ ہوتی ہے نیز دائرے سے صرف ایک بحر وضع نہیں کی جاسکتی اور یہ بھی قاعدۂ کلیہ ہے کہ جتنے ارکان ہوتے ہیں اس سے اتنی ہی بحریں وضع ہونی چاہیے اور یہ بھی ذہن نشین ہونا چاہیے کہ ایسا وہیں ہوتا ہے جس کے تمام بحور میں وہ ترتیب باقی رہے جس کے ملحوظ یہ دائرہ ترتیب ہوا ہے اور یہ زائد نکلتی ہیں تو صرف وہاں جہاں ایسی صورت پائی جائے کہ وہ کسی بحر کی جڑواں ہو یعنی ایک ہی جگہ سے دائرے میں وضع ہوتی ہیں جیسے بحر وسیع اور بحر مدید۔

بحر وسیع: فاعلن۔ مس تف علن۔ فاعلن۔ مس تف علن (علامہ سحر عشق آبادی کی دریافت)

بحر مدید: فاعلاتن۔ فاعلن۔ فاعلاتن۔ فاعلن

مندرجہ بالا یہ دونوں بحریں دائرۂ مختلفہ مثمنہ سے استخراج پاتی ہیں۔ بحر وسیع کا عروض کی بیشتر کتابوں میں ذکر نہیں ملتا اور بعض لوگ اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے اسے بحر نہیں مانتے۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں بہ اعتبار وزن یکساں ہیں پہلی بار اس کی طرف علامہ سحر عشق آبادی نے نظر اعتنا برتی اور اسے بھی الگ بحر قرار دیا ان کا ایسا کرنے کے لیے کچھ وجوہات پیش رہے ہیں کسی بھی دائرے سے وضع ہونے والی بحر جو اصول وشرائط کی تکمیل کرتی ہو تو ایسی بحر سے چشم بے اعتنائی درست نہیں ہے اور بحر مدید کے مزاحف اور بحر وسیع کے مزاحف بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

مس تف علن اور فاعلاتن کوتوڑ کر لکھا نہیں جاتا بلکہ وہ خود دائرے کے چکر میں ٹوٹ کر آتے ہیں اور انہیں ایسا ہی لکھنا چاہیے ورنہ بڑی بے راہ روی پیدا ہو گی، جیسے کہ درس بلاغت کے صفحہ نمبر 91 پر درج بحر جدید، بحر خفیف، بحر قریب ، بحر متشاکل کے املائے ارکان غلط تحریر کیے گئے ہیں۔ مضحکہ خیز ایک بات ہے یہ بھی دیکھیے کہ انہوں نے بحر مجتث کے ارکان مفروقی کو مجموعی لکھا ہے اور مجموعی کو مفروقی یعنی مس تفع لن۔ فاعلاتن کو مس تف علن فاع لاتن کے غلط املے سے لکھا ہے۔

ایک اور وضاحت یوں بھی ہے کہ ان ہی دونوں بحروں کے مطابق والا ایک وزن یا بحر وسیع کا ہم مشابہ وزن بحر رجز سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ **فاعلن مس تف علن فاعلن مس تف علن** (بحر رجز مثمن، مرفوع، سالم، مرفوع، سالم) بحر وسیع کو سالم نہ ماننے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے یا بحر رجز کے اس کے وزن کے پیش نظر بحر وسیع کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ لیکن اس کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے اور ہر ایک کی حیثیت جداگانہ بھی۔

دائرے دو طرح کے ہیں

(1) دائرۂ بحور مفرد۔

(2) دائرۂ بحور مرکب

1 دائرۂ بحور مفرد:

رکن واحد کی تکرار سے جن دائروں کو ترتیب دیا گیا ہے ان سے حاصل شدہ بحور مفرد بحور کہلاتے ہیں۔ ایسی بحروں کی تعداد اس رکن واحد کے اجزائے اولیہ کے مطابق ہی رکھی گئی۔

2 دائرۂ بحور مرکب:

مرکب بحور حاصل کرنے کے لیے جن دائروں کو ترتیب دیا گیا ہے۔ وہ دو طرح کے ہیں

الف: خماسی اور سباعی ارکان کے اشتراک سے

ب: سباعی ارکان کے اشتراک سے

ان سے محصول بحور مرکب بحور کہلاتے ہیں۔

دائرۂ مثمنہ کی پانچ قسمیں ہیں:

(1) دائرۂ مجتلبہ (سباعی ارکان)

(2) دائرۂ موتلفہ (سباعی ارکان)

(3) دائرۂ متفقہ (خماسی ارکان)

(4) دائرۂ مختلفہ (خماسی وسباعی ارکان)

(5) دائرۂ متوافقہ (سباعی ارکان)

جو پانچ دائروں کی بات کرتے ہیں وہ صرف مثمنہ دائروں کی حد تک ہو گئی

''بحروں کے افاعیل ایسے بنائے گئے ہیں کہ ایک سے دوسرا حاصل ہو سکتا ہے اس طرح کے دائرے پانچ ہیں۔''(درس بلاغت)

دائرۂ مسدسہ کا بھی ذکر الگ کیا جانا چاہیے جو کہ تین ہیں۔

(1) دائرۂ مختلفہ مسدسہ (خماسی وسباعی)

(2) دائرۂ متوافقہ مسدسہ (سباعی)

(3) دائرۂ متعکسہ مسدسہ (سباعی) عبداللہ قریشی کی ایجاد ہے اور یہ مثمن نہیں آتی)

معلوم ہو کہ مفرد بحور مثمنہ کے ایک رکن کو کم کر کے مسدس بحریں یعنی دائرۂ مثمنہ سے ہی ایک رکن کم کر کے بحور مسدسہ خروج کیے جاسکتے ہیں۔ جز یعنی جزو کیے گئے ہوتے ہیں دائروں کی تفصیل یوں ہے۔

1 دائرۂ مجتلبہ

یہ دائرہ ارکان سباعی پر مشتمل ہے تشکیل دائرہ میں ایک وتد مجموع اور دو سبب خفیف لائے گئے ہیں اور اس سے کل تین بحریں استخراج پاتی ہیں۔ دائرہ کی ابتدا بحر ہزج سے ہوتی ہے۔ مفاعیلن رکن اصلیہ ہے۔ اس کے تین جزو ہیں۔ وتد مجموع+سبب خفیف+سبب خفیف؛ دائرے کے چکر میں ان کی الٹ پھیر سے تین بحور نکلتی ہیں۔

(1) بحر ہزج: **مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن۔**

(2) بحر رجز: مس تف علن۔مس تف علن۔مس تف علن۔مس تف علن۔

(3) بحر رمل: فاعلاتن فاعلاتن، فاعلاتن۔فاعلاتن۔

2 دائرۂ موتلفہ مثمنہ:

یہ دائرہ ارکان سباعی پر مشتمل ہے تشکیل دائرے میں ایک وتد مجموع اور ایک فاصلہ صغریٰ لایا گیا ہے اس سے کل دو بحریں خروج پاتی ہیں۔ دائرہ کی ابتدا بحر وافر سے ہوتی ہے۔ مفاعلتن رکن اصلیہ ہے۔ اس کے دو جزو ہیں؛۔ وتد مجموع+فاصلہ صغریٰ

(1) بحر وافر: مفاعلتن۔ مفاعلتن۔ مفاعلتن۔ مفاعلتن۔

(2) بحر کامل: متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن۔

3 دائرۂ متفقہ مثمنہ

یہ دائرہ ارکان خماسی پر مشتمل ہے تشکیل دائرہ میں ایک وتد مجموع اور سبب خفیف کو لایا گیا ہے۔اس سے کل دو بحریں اخراج پاتی ہیں۔دائرہ کی ابتدا بحر متقارب سے ہوتی ہے فعولن رکن اصلیہ ہے۔

(1) بحر متقارب: فعولن۔فعولن۔فعولن۔فعولن

بحر متدارک: فاعلن۔فاعلن۔فاعلن۔فاعلن۔

4 دائرۂ مختلفہ مثمنہ

یہ دائرہ خماسی اور سباعی ارکان پر مشتمل ہے تشکیل دائرے میں خماسی اور سباعی ارکان بالترتیب لائے گئے ہیں اور اس سے کل چھے بحریں استخراج پاتی ہیں۔ دائرہ کی ابتدا بحر طویل سے کی گئی ہے۔رکن اصلیہ فعولن۔مفاعیلن ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ اجزائے اولیہ جتنے ہوتے ہیں اس دائرےسے اتنے ہی بحریں استخراج ہوتی ہیں اس کے لیے بھی یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ایسا صرف وہیں ہوسکتا ہے جس کے تمام بحور میں وہ ترتیب باقی رہے جس کے پیشِ نظر یہ دائرہ ترتیب دیا گیا ہے۔اجزائے اولیہ کی تعداد کے مطابق پانچ بحریں وضع ہونا چاہیے لیکن اس میں ایک جگہ سے دو بحریں وضع ہوتی ہیں اور وہ دائرے کے تمام شرائط کو پورا کرتی ہیں ہمارے نزدیک صرف وہی بحر درست ہے جو نہ صرف دائرے سے وضع ہو بلکہ دائرے کے وہ شرائط بھی پوری کرے جس کے ملحوظ یہ دائرہ مرتب کیا گیا ہے۔بعض حضرات نے دائرے سے وضع ہونے والی ہر اس بحر کو سالم بحر تسلیم کیا ہے جو دائرے کے ان شرائط کو پورا نہیں کرتی جس کا دائرہ مقتضی ہے۔اس دائرے سے حاصل ہونے والی بحریں:

(1) بحر طویل: فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن

(2) بحر وسیع: فاعلن مس تف علن فاعِلن مس تف علن

(3) بحر مدید: فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن

(4) بحر عریض: مفاعیلن فعولن مفاعیلن فعولن

(5) بحر بسیط: مس تف عِلن، فاعِلن، مس تف علن فاعِلن

(6) بحر عمیق: فاعلن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن

دائرۂ مختلفہ مثمنہ کے چکر میں بحر طویل کے بعد بحر وسیع آتی ہے پھر اس کے بعد بحر مدید لیکن عروضیوں کی کتابوں میں بحر مدید کا ذکر تو ملتا ہے وسیع کا نہیں۔ جسے بعد میں علام سحر عشق آبادی نے دریافت کی۔ اس دائرے سے کل چھے بحریں وضع ہوتی ہیں۔

اجزائے اولیہ کی تعداد کے مطابق پانچ بحریں وضع ہوناچاہیے لیکن اس میں ایک جگہ سے دوبحریں وضع ہوتی ہیں اوروہ دائرے کے تمام شرائط کوپوراکرتی ہیں ہمارے نزدیک صرف وہی بحر درست ہے جونہ صرف دائرے سے وضع ہو بلکہ دائرے کے وہ شرائط بھی پوری کرے جس کے ملحوظ یہ دائرہ مرتب کیا گیاہے۔بعض حضرات نے دائرے سے وضع ہونے والی ہراس بحر کوسالم بحر تسلیم کیاہے جو دائرے کے ان شرائط کوپورا نہیں کرتی جس کا دائرہ مقتضی ہے۔

کندن سنگھ اراولی نے اس میں دو اور بحروں کا اضافہ کیا ہے جو اس طرح سے ہیں۔

(1) بحر خلیل: فعولن فاعلاتن فعولن فاعلاتن (وتد سبب +سبب وتد سبب)

(2) بحر قریشی: فاعلاتن فعولن فاعلاتن فعولن (سبب وتد سبب+وتد سبب)

یوں تو یہ مندرجہ بالا دونوں بحریں یعنی بحر خلیل بحر مدید کے ہم وزن ہے اور بحر قریشی بحر عمیق کی۔ لیکن کندن سنگھ اراولی کی ترتیب اس دائرے کی شرائط پر نہیں اترتی۔ لہٰذا خارج از سالم بحور ہیں۔

5 دائرۂ متوافقہ یا مشتبہ مثمنہ

یہ دائرہ وتد مجموع اور وتد مفروق والے سباعی ارکان پر مشتمل ہے تشکیل دائرہ میں یہ التزام ہے کہ رکن اول کا جزو اول وتد ہے تو رکن دوم کا جزو اول بھی وتد ہو اسی طرح سوم اور چہارم کے بھی ارکان ہوں۔تشکیل و ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ پہلے وتد مجموع بعدہٗ وتد مفروق ارکان لائے جائیں۔اجزائے اولیہ کی تعداد کے مطابق چھے بحریں احداث پاتی ہیں۔اس دائرے کی ابتدا بحر مضارع سے کی گئی ہے رکن اصلیہ مفاعیلن فاعِ لاتن ہیں۔ ہر رکن کے تین جزو ہیں۔

وتد مجموع، سبب خفیف، سببِ خفیف+وتد مفروق، سبب خفیف، سببِ خفیف

ان ہی کے تکرار سے جو سالم بحور خروج پاتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(1) بحر مضارع: مفاعیلن فاع لاتن مفاعیلن فاع لاتن

(2) بحر مقتضب: مفعولات مس تف علن مفعولات مس تف علن

(3) بحر مجتث: مس تفع لن فاعلاتن مس تفع لن فاعلاتن

(4) بحر مشاکل: فاع لاتن مفاعیلن فاع لاتن مفاعیلن

(5) بحر منسرح: مس تف علن مفعولات مس تف علن مفعولات

(6) بحر خفیف: فاعلاتن مس تفع لن فاعلاتن مس تفع لن

مسدس بحریں

1 دائرۂ مختلفہ مسدسہ

یہ دائرہ ایک خماسی اور دو سباعی ارکان پر مشتمل ہے اس دائرے کے ابتدائی ارکان یہ بنتے ہیں۔فعولن مفاعیلن مفاعیلن (بحر طویل مسدسہ کے ارکان) اس میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ رکن آخر کو رکن دوم کے مطابق رکھا جائے۔ اجزائے اولیہ کی تعداد کے مطابق اس سے آٹھ بحریں اخراج پانا چاہیے لیکن اس سے پانچ بحریں ہی حاصل کی گئی ہیں بحر طویل، مدید، عریض، بسیط اور عمیق۔ بقیہ تین بحروں سالم بحور میں شامل نہیں کیا گیا جبکہ وہ بھی اسی دائرے سے وضع ہوتی ہیں اس لیے بھی کہ اس دائرے کی ترتیب میں اصول ہے کہ اگر رکن اول خماسی آیا تو رکن دوم سباعی ہو اور اگر رکن اول سباعی ہو تو رکن دوم ہر صورت میں خماسی ہو۔اور اس کا ہر آخری رکن سباعی ہی آنا چاہیے یہ شرائط مندرجہ ذیل بحروں میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

1. فاعلاتن فاعلاتن فاعلن (سباعی سباعی خماسی)
2. مفاعیلن مفاعیلن فعولن (سباعی سباعی خماسی)
3. مس تف علن مس تف علن فاعلن (سباعی

سباعی خماسی)

کندن سنگھ اراولی نے اپنی کتاب احتساب العروض میں مندرجہ بالا بحروں کے نام بھی بالترتیب دیے ہیں۔ بحر قتیل، بحر شکیل اور بحر جمیل۔ مزید تین اور بحریں بھی اس سے وضع فرماتے ہیں۔

(1) بحر خلیل: فعولن فاعلاتن فاعلاتن

(2) بحر کفیل: فاعلاتن فاعلاتن فعولن

(3) بحر قریشی: فاعلاتن فعولن فاعلاتن

موصوف نے اس دائرے سے کل بارہ بحریں نکالی ہیں۔ اوران چھے بحروں کو اپنی ایجاد بتاتے ہیں، بحروں میں وہ صورت نہیں رہی جو دائرۂ مختلفہ مسدسہ کی دوسری بحروں میں نظر آتی ہے۔

یہ مانا ہوا اصول ہے کہ اجزائے اولیہ جتنی ہوتی ہیں اسی کے مطابق بحریں وضع ہونی چاہیے اوراس سے زائد صرف ایسی صورت میں جس کے ارکان کچھ اس طرح ہوں یعنی جڑواں ہوں ایسی بحریں دائرے کے چکر میں ایک جگہ سے نکلتی ہیں یادرہے ترتیب برقرار رہے۔

کندن سنگھ اراولی کے بحر قتیل بحر شکیل اور بحر جمیل کی شروع کے دونوں ارکان سباعی آئے ہیں اورآخری رکن خماسی جواس دائرے کی ترتیب نہیں ہے اسی طرح بحر خلیل کا پہلا رکن خماسی ہے لیکن یہاں بھی یہ سقم ہے کہ یہ وتد سے شروع ہوتا ہے اوراس کا دوسرا رکن سباعی وتد ہی سے شروع ہونا چاہیے یہاں ایسا نہیں ہوا ہے۔ بحر کفیل میں بھی کچھ ایسا ہی عذر ہے کہ اس کے دونوں شروع کے ارکان سباعی ہیں جوسبب سے شروع ہوتے ہیں اس کا آخری رکن خماسی ہے اوروتد سے شروع ہوتا ہے بے ترتیبی ہے۔ اور بحر قریشی میں بھی دائرے کے اصول وترتیب کا دخل نہیں ہے لہٰذا یہ بھی ایک غیر حقیقی بحر شمار ہوگی۔ البتہ یہاں ایک بات جونظر انداز ہوگئی ہے وہ یہ کہ بحر مدید مثمن کی جڑواں بحر بحر وسیع مثمن جودائرے کی ایک ہی جگہ سے محصول ہوتی ہے دائرۂ مختلفہ مسدسہ سے بھی ہے بحر وسیع حاصل ہوتی ہے۔ کیوں بحر میں شامل نہیں کیا گیا جبکہ اس کا پہلا رکن خماسی ہے تو دوسرا رکن سباعی آتا ہے اوراصول کے مطابق تیسرا رکن سباعی ہی آتا ہے اس طرح اس دائرے سے کل چھے بحریں وضع پاتی ہیں۔ جو بالکل درست ہیں۔

اس دائرے سے صرف پانچ بحور سالم حاصل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک ہی جیسے ارکان کے اجزائے اولیہ کو الگ الگ شمار کرنا درست نہیں سمجھا گیا لیکن ایسی جگہ جہاں سے بحر وسیع وضع ہوتی ہے اس پہ اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ دو بحریں ایک ہی جگہ سے حاصل ہوتی ہیں تو کیوں ایک کو شمار کریں اور ایک کو چھوڑ دیں،

بحروں کے نام یہ ہیں:

(1) بحر طویل مسدس: فعولن مفاعیلن مفاعیلن

(2) بحر وسیع مسدس: فاعلن مس تف علن مس تف علن

(3) بحر مدید مسدس: فاعِلاتن فاعِلن، فاعِلاتن

(4) بحر عریض مسدس: مفاعیلن فعولن مفاعیلن

(5) بحر بسیط مسدس: مس تف علن فاعلن مس تف علن

(6) بحر عمیق مسدس: فاعلن فاعلاتن فاعلاتن

> **کندن سنگھ اراولی کے بحرقتیل بحرشکیل اوربحرجمیل کی شروع کے دونوں ارکان سباعی آئے ہیں اورآخری رکن خماسی جواس دائرے کی ترتیب نہیں ہے اسی طرح بحرخلیل کاپہلارکن خماسی ہے لیکن یہاں بھی یہ سقم ہے کہ یہ وتد سے شروع ہوتاہے اوراس کادوسرا رکن سباعی وتدھی سے شروع ہونا چاہیے یہاں ایسا نہیں ہوا ہے۔ بحرکفیل میں بھی کچھ ایساھی عذر ہے کہ اس کے دونوں شروع کے ارکان سباعی ہیں جوسبب سے شروع ہوتے ہیں اس کا آخری رکن خماسی ہے اوروتدسے شروع ہوتاہے بے ترتیبی ہے۔**

2 دائرۂ متوافقہ مسدسہ

یہ دائرہ سباعی ارکان پر مشتمل ہے تشکیل دائرہ میں وتد مجموع اوروتد مفروق والے ارکان لائے گئے ہیں غور سے دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ ان ارکان میں دووتد مجموع اورایک وتد مفروق والا رکن لایا گیا ہے۔ دائرہ کی ترتیب میں شروع کے دوارکان وہی رکھے گئے ہیں جواس کی مثمن بحور میں آئے ہیں۔ اس کی ابتدا بحر مضارع مسدس مفاعیلن۔ فاع لاتن۔ مفاعیلن سے ہوتی ہے جیسے کہ قاعدہ ہے اجزائے اولیہ کی جتنی تعداد ہوتی ہے اتنی ہی بحریں استخراج کرلی گئی ہیں۔ ایک جیسے دوارکان کے اجزائے اولیہ شمار نہیں ہوتے ہیں اور اس دائرے سے کل چھے بحریں وضع ہونی چاہیے لیکن اس سے نو بحریں استخراج کرلی گئی ہیں۔

(1) بحر مضارع مسدس: مفاعیلن فاع لاتن مفاعیلن

(2) بحر مقتضب مسدس : مفعولات مس تف علن مس تف علن

(3) بحر مجتث مسدس: مس تفع لن فاعلاتن فاعلاتن

(4) بحر مشاکل مسدس: فاع لاتن مفاعیلن مفاعیلن

(5) بحر سریع مسدس : مس تف علن مس تف علن مفعولات

(6) بحر جدید مسدس: فاعلاتن فاعلاتن مس تفع لن

(7) بحر قریب مسدس: مفاعیلن مفاعیلن فاع لاتن

(8) بحر منسرح مسدس: مس تف علن مفعولات مس تف علن

(9) بحر خفیف مسدس: فاعلاتن مس تفع لن فاعلاتن

ان مندرجہ بالا بحور میں ایک غورطلب بات یہ ہے کہ بحر سریع، بحر جدید بحر قریب جواس دائرے کے پانچویں چھٹے اورساتویں چکر سے محصول ہوتی ہیں لیکن اس دائرے کی اس شرط کو پورا نہیں کرتے جس طرح اس کی دوسری بحور میں پایا جاتا ہے معلوم اس دائرے کی ترتیب میں شروع کے دوارکان وہی ہیں جواس کے مثمن دائرے سے حاصل ہوئی بحور میں ہیں یعنی پہلا رکن وتد مجموع والا ہے تواس کے بعد کا رکن وتد مفروق والا ہونا چاہیے اوراگر پہلا رکن وتد مفروق والا ہے تواس کے بعد کا رکن وتد مجموع والا آئے نیز تیسرا رکن ہرحال میں وتد مجموع والا ہی ہونا چاہیے۔ جبکہ ان متذکرہ تینوں بحروں میں پہلا اوردوسرا رکن ایک جیسا لایا گیا اور تیسرا رکن جو ہرحال میں وتد مجموع والا ہونا چاہیے۔ لیکن وتد مفروق آیا ہے۔ ایک ہی دائرے سے دومختلف قسم کے بحور کیسے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

3 دائرۂ منعکسہ مسدسہ

(یہ بحریں صرف مسدس آتی ہیں ابوعبداللہ قریشی کی ایجاد ہیں)

یہ دائرہ سباعی ارکان پر مشتمل ہے تشکیل دائرہ میں وتد مجموع اوروتد مفروق والے ارکان لائے گئے ہیں اوراس دائرے سے کل نو بحریں احداث پاتی ہیں اور یہ بحریں صرف مسدسہ ہی لائی جائیں گی۔ اس کی بحور میں غور فرمانے سے معلوم ہوگا کہ ان کے ارکان میں ایک وتد مجموع اوروتد مفروق والے ارکان لائے گئے ہیں ذرا اورغور فرمائیں گے تو یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ دائرۂ متوافقہ مسدسہ میں جس طرح ارکان کی ترتیب لائی گئی ہے کچھ اسی طرح اس میں بھی کارفرما ہے اس کا تیسرا رکن وہی ہے جواس میں دوسرا رکن لایا گیا ہے۔ اس کی ابتدا بحر صریم مفاعیلن فاع لاتن فاع لاتن(وتد مجموع سبب سبب+وتد مفروق سبب سبب+وتد مفروق سبب سبب)

اس سے جوکل نو بحریں استخراج ہوتی ہیں وہ یہ ہیں

(1) بحر صریم: مفاعیلن۔ فاع لاتن۔ فاع لاتن۔

(2) بحر کبیر: مفعولات۔ مفعولات۔ مس تف علن

(3) بحر بدیل:۔ مس تفع لن۔ مس تفع

لن۔فاعلاتن

(4) بحرقلیب:فاع لاتن۔فاع لاتن۔مفاعیلن

(5) بحرحمید:مفعو لات۔مس تف علن۔مفعو لات

(6) بحرصغیر:مس تفع لن۔فاعلاتن۔مس تفع لن

(7) بحراصیم:فاع لاتن۔مفاعیلن۔فاع لاتن

(8) بحرسلیم:مس تف علن۔مفعو لات۔مفعو لات

(0) بحرجمیم:فاعلاتن۔مس تفع لن۔مس تفع لن

ان مندرجہ بالا بحور میں اگر پہلا رکن مجموعی ہے تو دوسرا رکن مفروقی آیا ہے اور پہلا رکن مفروقی آیا ہے تو دوسرا رکن مجموعی آیا ہے لیکن اس کی تین بحریں بحر کبیر، بحر بدیل اور بحر قلیب کی ترتیب میں یہ بات نظر نہیں آتی جو اس دائرے کی دوسری بحور میں دکھائی دیتی ہیں۔ بحر صریم سے دائرہ کی ابتدا ہوتی ہے جس کے اجزائے اولیہ نو ہیں لیکن یہاں ایک بات غور طلب ہے کہ ایک جیسے ارکان کے اجزائے اولیہ کو شمار کرنا بھی درست سمجھا نہیں جائے گا تو اس دائرے سے بھی صرف چھے بحور ہی حاصل ہونا چاہیے۔

یہاں ایک اور وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں ڈاکٹر اوم پرکاش اگروال زار علامی نے جو جانشین سحر عشق آبادی ہیں۔ بحر مضارع مسدس کی ترتیب کی طرح فعولن مفاعیلن فعولن کی ترتیب سے ایک نیا دائرہ وضع کیا اور چھے بحریں حاصل کر لیے۔ دائرہ کا نام مختلفہ مسدسہ جدید رکھا اور اس کی ہر بحر کے نام کے ساتھ جدید بھی لگا دیا تاکہ کسی طرح کا التباس نہ ہو یوں دیکھا جائے تو یہ سالم بحریں دوسری بحروں کی مزاحف صورتیں ہیں۔ ازروئے عروض دائرے سے حاصل ہوتے ہیں اس لیے سالم بحور میں شمار بھی کیے جائیں گے وہ چھے بحریں یہ ہیں:

(1) بحرطویل جدید:فعولن۔مفاعیلن۔فعولن۔

(2) بحروسیع جدید:فاعلن۔مس تف علن۔فاعلن

(3) بحرمدید جدید:فاعلاتن۔فاعلن۔فاعلن

(4) بحرعریض جدید:مفاعیلن۔فعولن۔فعولن

(5) بحربسیط جدید:مس تف علن۔فاعلن۔فاعلن

(6) بحرعمیق جدید:فاعلن۔فاعلاتن۔فاعلن

کندن سنگھ اراولی نے بحر طویل کے ان ہی ارکان کی ترتیب سے بارہ بحور استخراج فرماتے ہیں جبکہ اس دائرے کی ترتیب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ پہلا رکن خماسی لایا گیا ہے تو اس کا دوسرا رکن سباعی آیا ہے اور اگر پہلا رکن سباعی آیا ہے تو اس کا دوسرا رکن خماسی آیا ہے اور تیسرا رکن ہر حال میں خماسی ہی آیا ہے اس دائرے کی ابتدا بحر طویل جدید فعولن مفاعیلن فعولن سے ہوئی ہے یعنی فک بحور میں وتد سبب+وتد سبب سبب+وتد سبب ہے۔ یہ مانا ہوا اصول ہے کہ اجزائے اولیہ جتنی ہوتی ہیں اسی کے مطابق بحریں وضع ہونی چاہیے اور اس سے زائد صرف ایسی صورت میں جس کے ارکان کچھ اس طرح ہوں یعنی ایک ہی جگہ سے نکالی جائیں یا دوسرے لفظوں میں جڑواں کہہ سکتے ہیں مثلاً فاعلاتن فاعلن فاعلن بحر مدید جدید۔ فاعلن مس تف علن فاعلن بحر وسیع جدید کچھ یہی صورت دائرہ مختلفہ مثمن میں بحر مدید مثمن، بحر وسیع مثمن میں دیکھی جا سکتی ہے، اس سے پہلے کہ اس دائرے کی بحروں کا فنی و عروضی تجزیہ کیا جائے ایک وضاحت بہت ضروری ہے، مسلمات فن، از زار علامی صفحہ نمبر 59 پر ان چھے بحور کو اپنی ایجاد بتاتے ہیں جبکہ، احتساب العروض، کے صفحہ نمبر 39 میں کندن سنگھ اراولی یوں رقم طراز ہیں کہ ''حیرت زدہ ہوں زار علامی نے ان بحور کو اپنی ایجاد کیوں بتایا جبکہ ستمبر 1983 میں ان بحور کا دائرہ مجھ سے بنواتے وقت اعتراف کیا تھا کہ یہ بحور علام سحر عشق آبادی کی ایجاد ہیں۔''

کندن سنگھ اراولی نے اس دائرے مختلفہ جدید مسدسہ سے بھی کل بارہ بحریں نکالی ہیں جس میں سے چھے علام سحر عشق آبادی کی ایجاد بتاتے ہیں اور باقی چھے کو اپنی ایجاد بتاتے ہیں۔ وہ اس طرح سے ہیں:

(1) بحرقتیل مسدس:فاعلن فاعلن فاعلاتن

(2) بحرشکیل مسدس:فعولن فعولن مفاعیلن

(3) بحرجمیل مسدس:فاعلن فاعلن مس تف علن

(4) بحرکفیل مسدس:فعولن فعولن فاعلاتن

(5) بحرخلیل مسدس:فعولن فاعلاتن فعولن

(6) بحرقریشی مسدس:فاعلاتن فعولن فعولن

مندرجہ بالا تمام چھے بحریں کسی طرح بھی سالم بحور میں بھی شمار نہیں کیے جا سکتے ان بحروں میں وہ صورت نہیں رہی جو علام سحر عشق آبادی یا زار علامی (سے منسوب) بحروں میں نظر آتی ہے۔ یہ دائرہ دو خماسی اور ایک سباعی رکن پر مشتمل ہے ایسا ان چھے بحروں میں بھی نظر آتا ہے لیکن ارکان کی وہ ترتیب نہیں رہی جو کہ یہ دائرہ مقتضی ہے ایک ہی دائرے سے مختلف قسم کی ترتیب رکھنے والے بحور عین غیر مطابق ہیں اور خارج از سالم بحور ہیں۔ ذیل میں ان بحور کا اجمالی نقشہ پیش ہے

(1)دائرہ مجتلبہ

مثمن بحریں۔3:ہزج، رجز، رمل

مسدس بحریں۔3:ہزج، رجز، رمل

(2)دائرہ موتلفہ

مثمن بحریں۔2:وافر، کامل

مسدس بحریں۔2:وافر، کامل

(3)دائرہ متفقہ

مثمن بحریں۔2:متقارب، متدارک

مسدس بحریں۔2:متقارب، متدارک

(4)دائرہ مختلفہ

مثمن بحریں۔6:طویل، وسیع، مدید، عریض، بسیط، عمیق

مسدس بحریں۔6:طویل، وسیع، مدید، عریض، بسیط، عمیق

مسدس بحریں جدید۔6:طویل، وسیع، مدید، عریض، بسیط، عمیق

(5)دائرہ متوافقہ

مثمن بحریں۔ 6: مضارع، مقتضب، مجتث، مشاکل، منسرح، خفیف

مسدس بحریں۔ 6: مضارع، مقتضب، مجتث، مشاکل، منسرح، خفیف

دائرہ منعکسہ (یہ مثمن نہیں آتی)

مسدس بحریں۔6:صریم، حمید، صغیر، اصیم، سلیم، جمیم

ان بحور کو سالم شمار نہیں کیا گیا جو دائروں سے تو وضع ہوتی ہیں لیکن ان کی شرائط کو پورا نہیں کرتے۔ وہ یہ ہیں۔

دائرہ مختلفہ مسدسہ کے تین بحور: قتیل، شکیل، جمیل

دائرہ مختلفہ مسدسہ جدید کے تین بحور۔ قتیل، شکیل، جمیل (جدید)

دائرہ متوافقہ مسدسہ کے تین بحور۔ سریع، جدید، قریب

دائرہ منعکسہ مسدسہ کے تین بحور۔ کبیر، بدیل، قلیب

اس طرح یہ کل بارہ (12) بحریں ہیں جو سالم میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔

اس تفصیلی جائزے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ دائروں سے حاصل شدہ سالم بحور مثمنہ انیس (19) ہوتی ہیں اور سالم بحور مسدسہ اکتیس (31) ہوتی ہیں۔ یعنی عروض میں ان بحروں کی مجموعی تعداد بہ شمول مسدس و مثمن پچاس ہوتی ہیں۔

ان کا مختصر خاکہ یوں ہوتا ہے۔

مفرد بحور مثمنہ۔ سات (7)

مفرد بحور مسدسہ۔ سات (7)

مرکب بحور مثمنہ۔ بارہ (12)

مرکب بحور مسدسہ۔ چوبیس (24)

یاد رہے کہ مندرجہ بالا پچاس سالم بحور میں مفاعلاتن۔ مفتعلاتن، فاع لن۔ مفعول، افاعیل اصول میں شمار نہیں لہٰذا ان کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا گیا۔

■ **Prof Khwaja Faraz Badami**, HOD Urdu, JSS Degree College, GOKAK, Distt: Belgaum, Karnataka

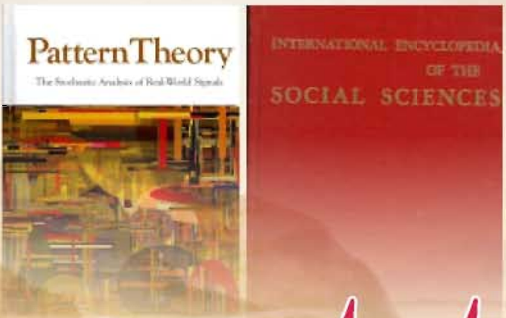

رحمان اختر

کلچر، ہجرت اور ادب

کسی ایک خطے اور مخصوص علاقے میں برسہا برس سے مل جل کر عوام جو زندگی گذارتے ہیں اور اپنے طرزِ حیات کی اہمیت کو انفرادیت دینے کے لیے جو کوشش کرتے ہیں وہی کوشش اس عوام کا کلچر بن جاتی ہے۔ ممتاز ماہر سماجیات ڈیوڈ ایل سلس کی مرتبہ انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف دی سوشل سائینسز میں کلچر کا مفہوم ٹائیلر نے یہ دیا ہے:

”کلچر یا تمدّن اپنے مفہوم کے اعتبار سے بنی نوع انسان سے متعلق معلومات کا وہ سرچشمہ ہے جس میں عقائد، آرٹ، اقدار، قوانین، رسومات کے طرز اور مزاج شامل ہوتے ہیں۔ ان عناصر سے انسان کی تشکیل ہوتی ہے اور اس تشکیل میں ڈھل کر ہی انسان سماج کا حصّہ بنتا ہے۔“

اس مفہوم کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ انسان کے طریقۂ حیات، خیالات، اقدار مذہب اور معاشرتی طریقۂ کار اور بتدریج زندگی کا ترقیاتی سفر کلچر کے دائرے میں شامل ہوتا ہے۔ ان تمام عناصر کے ساتھ انسانی سوچ کے منظر وپس منظر اور فلسفۂ حیات بھی کلچر ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ مثلاً مغربی محقق ایچ پی فیئر چائلڈ (H.P.Fairchild) کے مطابق:

”کلچر انسانی احساسات وخیالات کا دوسرا نام ہے یہ انسانی مزاج کو اشارتی اور علامتی انداز سے سماج میں ایک شناخت دلاتا ہے اور اسی شناخت کے ساتھ نئی نسل تک منتقل ہوجاتا ہے۔“

بابائے اردو عبدالحق نے اپنی انگریزی اردو لغت میں کلچر کے معنی تہذیب، تربیت، ذہنی ترقی، فلاحت، زراعت، پرورش، کھیتی اور فصل لگانا دیے ہیں۔“ اس معنویت کے پیشِ نظر کلچر انسانی تمدّن کے عروج کا سبب بنتا ہے اور بشریاتی زاویے اور سماجی ڈھانچے کے نظریے سے پرکھا جاتا ہے۔ مغربی محقق کروبر (Kroeber) نے تہذیب وتمدّن کے عروج وزوال کو اسلوب، بیان کی تربیت کی عمل پذیری کے مختلف ادوار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ کروبر (Kroeber) نے 1957 اور 1963 میں کلچر سے متعلق جو نظریہ دیا ہے اس کے نمونے کو پیٹرن تھیوری (Pattern

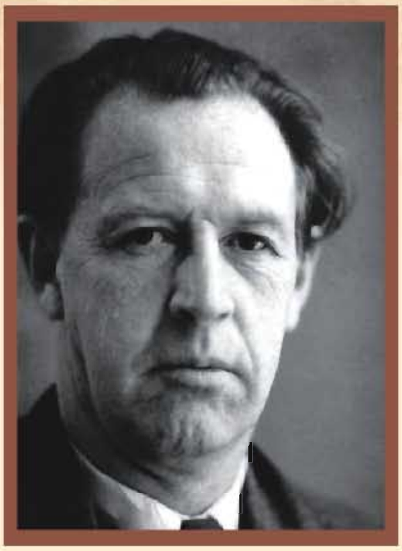

Theory) کہا گیا ہے۔ کروبر کے مطابق:

”کلچر شخصی اور اجتماعی طور پر پیدا ہوتا ہے جو متعلقہ لوگوں اور ماحول کو متاثر بھی کرتا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوتا ہے۔“

اس خیال کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ کلچر باہمی تاثر، انسانی حیاتیات، نفسیات اور جغرافیے کے بیچ واقع ہوتا ہے اور اس طرح تمدّن کے عروج کا سبب بنتا ہے۔ یہی کلچر کا تاریخی عمل بھی ہے۔ ٹونی جیفرسن کے مطابق:

”کلچر وہ طریقۂ عمل ہے جس کے ذریعے کسی طبقہ کے سماجی رشتے تعمیر ہوتے ہیں اور انھیں ایک شکل دی جاتی ہے لیکن یہ ایک ایسا ڈھنگ بھی ہے جن کے ذریعے ان رشتوں کو زیر تجربہ لایا جاتا ہے۔“

کسی بھی خاص دور میں عمل لوگوں کے ایک گروہ میں ایک پیٹرن (نمونے) کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اور اس گروہ کی بیتی ہوئی زندگی کا ترجمان بنا رہتا ہے۔ گروہ میں شامل لوگوں کی شعوری اور لاشعوری دلچسپیوں، ان کی معلومات اور ان کی ماحولیاتی صورت، حال سے بھی اس کی وابستگی رہتی ہے۔ کروبر (Kroeber) اور کلک اون (Kluck-hohn) نے 1952 میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق کلچر انسانی ساخت اور ماحول کے بیچ ایک غیر مستقل عنصر ہوتا ہے۔ یعنی یہ انسانی گروہوں کی زبان، ان کے عمل اور ان کے طریقہ کار میں یکجہتی پیدا کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی روشنی میں، ہم نیشنل کلچر اور علاقائی کلچر میں تمیز کرسکتے ہیں۔

کلچر کے بشریاتی نظریہ کے علاوہ ایک دوسرا نظریہ، سماجی ڈھانچے کا نظریہ ہے، جس کے مطابق سماجی ڈھانچہ اور سماج کا جماعتی نظام کلچر کے جز نہیں ہوتے بلکہ لوگوں کے کسی گروہ کا مکمل کلچر ہوتے ہیں۔ اس نظریے کو ریڈ کلف براؤن (Red-cliffe-Brown) نے 1930 اور 1940 میں پیش کیا۔ اس نظریے کی کافی حد تک مقبولیت رہی۔ ریڈ کلف براؤن کے مطابق:

”سماجی ڈھانچہ سماجی رشتوں، مختلف سماجی طبقوں اور سماج میں ان سب کے رول کو کلچر کہتے ہیں۔“

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام ساختیاتی نظام اپنی ساخت کے طور پر ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں لیکن عملی طور پر ان کی حیثیت اِکائی کی ہوتی ہے۔ مثلاً پنجاب کے علاقہ ماجھا، مالوہ اور دوآبہ ساختیاتی نظام کی رو سے مختلف ضرور ہیں۔ لیکن مجموعی اور عملی طور پر پنجابی معاشرے کی ایک اکائی ہیں۔ ساختیائی نظام کے تمام عناصر ہم آہنگ ہوکر عمل پیرا رہتے ہیں۔ ریڈ کلف براؤن کا یہ نظریہ موثر بھی ہے اور آفاقی بھی ہے۔ یہ نظریہ ہر قسم کے سماجی گروہوں پر لاگو ہوتا ہے۔ شروع میں یہ نظریہ ناخواندہ اور سادہ سماجی گروہوں تک ہی محدود تھا لیکن سماجی بشریت کی وسعت کے ساتھ اس کی حدود بھی وسیع ہوگئیں اور اس طرح سماجی بشریت کو سماجی ڈھانچے کی آفاقیت کے قریب لایا گیا۔

ماہر سماجیات ریمنڈ ولیمز (Raymond Williams) نے کلچر کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے:

(1) مثالی اور آفاقی اقدار کا کلچر ((2 علوم وفنون سے متعلق نشوونما کا کلچر ((3 سماجی، انفرادی اور حوالہ جاتی کلچر

ریمنڈ ولیمز (Raymond Williams) کے خیال میں مثالی کلچر اقدار کا ہوتا ہے۔ آفاقی اقدار کے تحت سماج کے

افراد اپنی تشکیل اپنے ترقیاتی عمل سے کرتے ہیں۔ اس تعریف کے زمرے میں آفاقی قدریں آتی ہیں جو انسانی سماج میں قدرے مشترک ہوتی ہیں۔ جیسے ایمانداری، سچائی، محبت، چاہت، خلوص، یگانگت وغیرہ۔ دوسرے الفاظ میں وہ اعلیٰ اقدار جو ایک مثالی انسان کی تشکیل کرتی ہیں، ان کی وضاحت وقت اور حدود سے بالاتر ہوتی ہے اور یہی وہ اقدار ہیں جو نسل در نسل حوالہ جاتی طور پر ایک آفاقی کلچر کا نمونہ بنتی ہیں۔ اس آفاقی کلچر سے متعلقہ افراد اپنے مشاہدات اور تجربات سے اجتماعی زندگی کو عملی شکل دیتے ہیں۔ جس سے عوام کا دل و دماغ ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور اس طرح دوسرے لوگ بھی فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔

آفاقی کلچر کی اس تعریف کی روشنی میں یہ مثال دی جاسکتی ہے کہ ہزاروں اور سیکڑوں برس پر پھیلی ہوئی پنجاب کی وہ اعلیٰ اقدار آج بھی ہمارے سامنے مثال ہیں جو ہمیں یہاں کے بزرگانِ قوم سے ملی ہیں۔ سچائی، ایمانداری، اخوت، محبت اور یگانت کے پیغام ہوں یا خدا کی وحدانیت کا عقیدہ ان اعلیٰ اقدار نے ہی سماج کے افراد کو آفاقی کلچر میں ڈھالا ہے۔

کلچر کی دوسری تعریف اس کی دستاویزی، عملی اور فنی حیثیت ہے۔ ریمنڈ ولیمز کے مطابق اس میں وہ علوم وفنون آتے ہیں جن کے پیش نظر عوام کے مزاج کی عکاسی ہوتی ہے کسی بھی کلچر اور علاقے کے لوگوں کا ذہن اور ان کے خیالات جاننے کے لیے وہاں کا علاقائی ادب اور وہاں کا فن اس کی بہترین مثال ہوتے ہیں۔ کلیفرڈ گیرز نے اپنی کتاب لوکل نالج (Local Knowledge) میں کلچر کی فنی تعریف سے متعلق جو وضاحت کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے۔

''فن کی تھیوری بیک وقت کلچر کی تھیوری ہے یہ کوئی خود مختارانہ معرکہ نہیں ہے۔ اگر یہ فن کے علم تجسس کی تھیوری ہے تو اسے سماج میں زندگی کی علامتوں کو تلاش کرنا چاہیے۔ یہ دریافت دوہری باتوں، تبدیلیوں اور مماثلتوں کی خود ساختہ دنیا کی نہیں ہونی چاہیے۔''

علم وفن کی سطح پر کلچر کی تعریف کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ آرٹ اور اجتماعی زندگی کے بیچ مرکزی رابطہ کسی بھی کام چلاؤ سطح پر ممکن نہیں ہوتا بلکہ تلاش کی سطح پر ہی ممکن ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کلچر ہمیشہ سماج میں ہوتا ہے۔ کلچر اس عمل کو کہتے ہیں جس میں انسان بہتر سے بہتر بننے کی کوشش کرتا ہے۔ علوم وفنون سے متعلق نشوونما کے کلچر میں عوام کے تصور اور خیالات، علم وفن میں محفوظ ہوجاتے ہیں جنھیں اس سماج کے ادب اور فن کے نمونوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ الگ الگ علاقوں کے الگ الگ فنونِ لطیفہ ہوتے ہیں۔ جیسے بالی میں لوگ سکّوں کے بت بناتے ہیں۔ آسٹریلیا میں خام چیزوں سے تصویریں بنائی جاتی ہیں اس طرح اسے علاقائی کلچر کہا جائے گا جو آفاقی کلچر نہ ہو کر علوم وفنون کے کلچر میں آئے گا۔ اس نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر تمام جگہوں پر تمام فنونِ لطیفہ میں یکسانیت اور عمومیت ہو تو یہ خاص تناظر کے تحت تو قابل قبول بات ہوگی لیکن ضروری نہیں کہ عالمی طور پر جمالیاتی نقطۂ نظر سے اپیل کرے۔ میٹس (Matisse) کے مطابق:

''کسی فن کے ذرائع اور زندگی کو محسوس کرنے کی شدت جس سے فن پیدا ہوتا ہے قابل علیحدگی نہیں ہوتی۔''

سماجی، انفرادی اور حوالہ جاتی کلچر لوگوں کے اس گروہ کا ہوتا ہے جس میں عادتوں اور خصلتوں میں یگانگت ہوتی ہے۔ ریمنڈ ولیمز (Raymond Williams) کے خیال میں

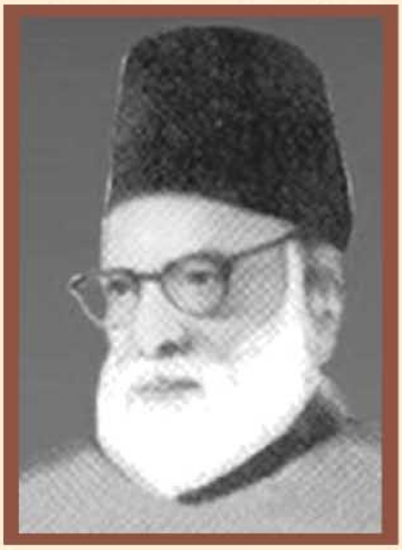

کلچر کوئی شے نہیں ہوتی۔ ہر فرد میں نہ اعلیٰ اقدار ہونا ہی ممکن ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ علم وفن کی سطح پر بھی یکسانیت ہو۔ پھر بھی ذاتی عادتیں اور خصلتیں اپنے میں شناخت رکھتی ہیں اور اسی شناخت کی بنیاد پر افراد کا طرز زندگی مقرر ہوتا ہے۔ ریمنڈ ولیمز کے اس نظریے سے ممتاز اردو محقق جمیل جالبی نے یہ مثال دیتے ہوئے اتفاق کیا ہے:

''مثال کے طور پر ایک فرد اپنے گھر سے نکلتا ہے تو اچھے شگن کے لیے اپنا داہنا قدم پہلے باہر نکالتا ہے جو اس کی اپنی عادت ہے۔ لیکن اگر سوسائٹی کے دوسرے افراد بھی گھر سے نکلتے وقت اسی طرح اپنے اپنے داہنے قدم باہر نکالتے ہوں تو یہ عمل ان کی عادت نہ ہو کر کلچر کے زمرے میں آئے گا۔''

ریمنڈ ولیمز (Raymond Williams) نے کلچر کو متذکرہ جن تین تعریفوں میں منقسم کیا ہے ان سب میں آفاقی اقدار کی خصوصیت نمایاں اور پیش پیش ہے دوسرے الفاظ میں آفاقی اقدار نہ صرف علم وفن سے متعلق تعریفوں مرکز بنتی ہیں بلکہ یہی اقدار، اعمال و کردار کی مختلف شکلوں اور سماجی اداروں میں بھی صاف نظر آتی ہیں۔ قدیم سماجوں کا علم اور ماضی کے حالات، علم وفن اور تصویر کے شاہکار اور اپنی بات کو دوسرے تک پہنچانے کے اہم ذریعے مندرجہ بالا تمام تعریفوں کے جز ہیں۔ ''کنبہ اور قبیلے کی بناوٹ یا اس سے بڑے اداروں کے آئین، سماجی رشتوں کو واضح کرتے ہیں۔ جن سے ایسے مثالی رشتوں کا پہلو سامنے آتا ہے۔'' کلچر کی متذکرہ وضاحتوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ:

''کلچر میں ہمارے رہنے سہنے کا ڈھنگ، حکایتیں اور روایتیں، اخلاق، ادب اور فن، مذہب، رسومات و توہمات، زبان و بیان۔ غرض یہ کہ ہماری زندگی سے وابستہ ہر اس شے کا عنصر شامل ہے جو ہمارے معاشرے کو زندہ ہماری تخلیقی قوتوں کو پائندہ اور روح کو تابندہ رکھتی ہیں۔''

اس روشنی میں جب ہم پنجاب کو دیکھتے ہیں تو ایک مخصوص اور منفرد تمدن کی تصویر ہمارے تصور میں اُبھرتی ہے۔ ایک طرف جہاں پنجاب بڑے دریاؤں کا سرچشمہ رہا ہے وہاں دوسری طرف یہ علاقہ مختلف تہذیبوں کا مرکز بھی ہے۔ ایک سرحدی صوبہ ہونے کے سبب ہندوستان میں شمال سے آنے والے حملہ آوروں کے آنے اور یہاں آکر بس جانے کا سلسلہ ایک دو بار نہیں بلکہ صدیوں رہا ہے۔ بیرونی لوگ اپنے ساتھ اپنی اپنی تہذیبیں لے کر آئے ان فاتحین کے ساتھ جو صوفی بزرگ پنجاب میں آئے انھوں نے پنجابی کلچر کو کافی حد تک متاثر کیا۔ یہ صوفیائے کرام پنجاب میں اتنے ہر دلعزیز ہوئے کہ آج بھی ان کے پیغامات اخوت پنجاب کی شناخت بنے ہوئے ہیں۔ اس طرح پنجابی کلچر آپسی رواداری کے ساتھ پروان چڑھا۔ اس کلچر کے عناصر میں قومی جذبہ وطن کے لیے ایثار و قربانی، صبر و تحمل، ایک دوسرے کا احترام پنجاب اور پنجابیت کی شناخت بن گئے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ تمام بیرونی تہذیبیں پنجابی تہذیب میں آکر ضم ہوگئیں۔ آج بھی پنجاب اپنی انفرادی تہذیب اور اپنے مخصوص کلچر کے سبب ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔

کلچر کی پرکھ کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس مخصوص سماج/معاشرے کو مطالعے کا موضوع بنایا جائے اس سے وابستہ عوام کے طریقۂ حیات کا مشاہدہ کیا جائے۔ کسی بھی ثقافتی خطے کی علاقائی حالت اپنے آپ میں ایک اہم جز ہے۔ جغرافیائی خطے سے ہی کلچر کی شناخت ہوتی ہے۔

کلچر کی اس وضاحت اور مطالعے کے ساتھ ادبی اور تخلیقی سطح پر یہ ضروری ہے کہ ہم یہ بھی پرکھیں کہ اس کی نمائندگی کی تنقیدی سفر میں کس طور پر ہونی چاہیے۔ یہاں پر سب سے پہلے ہمیں 'نمائندگی' لفظ کی معنویت اور وسعت کو دیکھنا ہوگا۔ پنجابی اور اردو ادب میں نمائندگی کو پیش کش یا شمولیت کے معنوں میں لیا

گیا ہے۔ جبکہ نمائندگی معاشرے اور تاریک کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ معاشرے میں تبدیلیوں سے جو حالات اور سوچ کے متوازن عمل سے جو ردّعمل وجود میں آتے ہیں وہ نئی علامتوں اور نئے اظہار میں ڈھل کر تاریخ کا جُز بنتے ہیں۔ اس طرح جس شے کی نمائندگی کی جاتی ہے اس سے براہِ راست نئے اظہار اور نئی علامتوں کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں قوم و کلچر کی نمائندگی کو واضح طور پر پیش کرنے کے لیے مغربی محقق ہائیڈی گر، کریگ اوونس وغیرہ کے نظریات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کریگ اوونس (Craig Owens) کا خیال ہے کہ نمائندگی ایک علامتی عمل ہے جسے ڈرامائی انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ ڈرامے میں اداکار کی ہو بہو نقل اتارتا ہے گویا اس کی غیر موجودگی میں اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اپنی اداکاری کے ذریعے دوسروں کے سامنے لاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ غیر موجود شخصیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اداکار بذاتِ خود غیر موجود شخصیت نہیں ہے جس کی وہ علامتی طور پر نمائندگی کرتا ہے بلکہ اس کا نقال ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ غیر موجود کا موجود ہے۔ نمائندگی کے اس تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ غیر موجود لمحات کی مجموعی شکل کو حال میں پیش کیے جانے کو نمائندگی کہتے ہیں۔ یعنی وہ تجربات جو پہلے موجود تھے اور اب بعد کو غیر موجود ہوگئے ان کی حال میں پیش کش کو نمائندگی کا نام دیا جاتا ہے۔

نمائندگی کی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں اس میں نقائص بھی ہیں۔ نمائندگی کرتے وقت انسانی فطرت کے تحت نمائندگی کیے جانے والے موضوع یا شخصیت کی موجودگی کو مجموعی طور پر محسوس (Perceive) کیا جاتا ہے جسے (Gestalt View) کہا جاتا ہے جس سے قارئین و ناظرین کے سامنے جو تصویر آتی ہے اس کے خلا (Gaps) عموماً بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور نقائص سامنے نہیں آتے صرف خصوصیات ہی نظر کے سامنے رہ جاتی ہیں۔

نمائندگی چونکہ ایک مجموعی عمل ہے اس لیے غیر موجود شخصیت یا موضوع یا جس کی نمائندگی کی جارہی ہے اپنے حقیقی روپ میں سامنے نہیں آتا بلکہ سنورے ہوئے روپ میں ہی نظر آتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر نمائندگی کی یہ بھی ایک کمزوری ہے کہ مجموعی مطالعے میں جزیات نظر انداز ہوجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر بلونت سنگھ کے ناول 'چک پیراں کا جسّا' کے بارے میں دیواندر اِسّر لکھتے ہیں:

"عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ گاؤں کی زندگی میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے تین اہم وجوہ ہوتی ہیں۔ زن، زر، اور زمین جو تمام برائیوں عذاب اور فنا کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن اس ناول میں بلونت سنگھ نے اس تثلیث کی بجائے عورت کو ہی مرکز بنایا ہے۔ اتنے بڑے کینوس میں زمین کا ذکر نہ ہو اور وہ بھی گاؤں کی زندگی کے پس منظر میں تو اس سے یہی سمجھا جائے گا کہ ناول نگار کا کینوس تو بہت پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس میں ریکھائیں اور رنگ ایک ہی طرح کے ہیں۔"

اس پہلو کی روشنی میں اردو کے جن ناولوں میں تقسیم ملک کے زیرِ اثر ہجرت کو موضوع بنایا گیا ہے ان میں قرۃ العین حیدر کے ناول میرے بھی صنم خانے اور آگ کا دریا، قاضی عبدالستار کا شکست کی آواز، خدیجہ مستور کا آنگن اور زمین، عبداللہ حسین کا اداس نسلیں، کرشن چندر کا غدّار، رامانند ساگر کا اور انسان مر گیا وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ڈرامے میں اداکار کی ہو بہو نقل اتارتا ہے گویا اس کی غیر موجودگی میں اس کی شخصیت کے تمام پہلوئوں کو اپنی اداکاری کے ذریعے دوسروں کے سامنے لاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ غیر موجود شخصیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ ادا کار بذاتِ خود غیر موجود شخصیت نہیں ہے جس کی وہ علامتی طور پر نمائندگی کرتا ہے بلکہ اس کا نقال ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ غیر موجود کا موجود ہے۔

ان سبھی ناول نگاروں نے ہجرت اور منتقلی کے مناظر اپنے اپنے طور پر قلم بند کیے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول آگ کا دریا میں منتقلی کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"امرتسر کے پلیٹ فارم پر شکستہ حال برقعہ پوش عورتیں اور بوڑھے سلاخوں کے ادھر ویزا پر دستخط ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ایک موٹا سکھ افسر ایک غریب مسلمان عورت سے پوچھ رہا تھا کہ تمہارا نام کیا ہے۔"

ہجرت ہی کو موضوع بنا کر قاضی عبدالستار نے اپنے ناول شکست کی آواز کو جذباتی محبت کے زاویے سے پرکھا ہے۔ ایک لڑکی اپنے محبوب کو ہجرت کے وقت آخری خط میں لکھتی ہے:

"......کل صبح لال پور سے چلی جاؤں گی۔ ایک اجنبی دیس کو......تمہاری محبت کی قسم میں تم سے بدگمان نہیں ہوں......تم حضرت گنج کی سنسان سڑکوں پر سگریٹ پھونک رہے ہو، میرے ہاتھوں میں پاسپورٹ کانپ رہا ہے۔"

منتقلی کا ایک تیسرا پہلو پاکستانی ناول نگار خدیجہ مستور نے ان الفاظ میں ابھارا ہے:

"تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے؟ بڑی چچی نے پوچھا واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی، جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔ مگر ہندو ہمیں رہنے کیوں دیں گے، وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاؤ، ان کے جو ہندو ہمارے پاکستان میں ہوں گے۔ ہم ان سے کب کہیں گے کہ جاؤ۔"

ان مثالوں کے پیشِ نظر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی موضوع یعنی تقسیمِ ملک اور ہجرت کا ہے۔ لیکن تینوں ناول نگاروں نے اس کی وضاحت اور نمائندگی اپنے اپنے طور پر الگ الگ ڈھنگ سے کی ہے۔ الگ الگ زاویوں سے نمائندگی میں اختلاف نظر بھی پیدا ہوا۔ جس کا اندازہ ان ناولوں کے مطالعے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نمائندگی کی کمزوری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک ہی موضوع کی نمائندگی جب ایک سے زیادہ آدمی کرتے ہیں تو نمائندگی کرنے والے شخص کے ذاتی تصور و قیاس (Subjectivity of Perception) کی وجہ سے دوسری نمائندگیوں میں اختلاف نظر پیدا ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں اصل موضوع کا حقیقی روپ سامنے نہیں آپاتا۔

ایسے ناولوں کی روشنی میں تقسیم ملک کی نمائندگی مختلف ناول نگاروں نے مختلف زاویوں سے الگ الگ ضرور کی ہے، لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو موضوع کی اہمیت اپنی جگہ اہم ہے یعنی ہر قلم کار کا موضوع تقسیم ملک ہے جو ہائیڈی گر کے مطابق موجود کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ وہ موجود یعنی 'اب' ہے جو ہر تغیر و تبدل کے بعد میں تقسیم ملک ہی رہتا ہے۔ ہائیڈی گر کے مطابق:

"اب وہ ہے جس پر وقت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جبکہ لمحہ حال سے ماضی بن جاتا ہے اور 'اب'، 'اب' ہی بنا رہتا ہے۔ کسی شے کے موجود رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ وقت سے آزاد ہو۔ موجود کی موجودگی کو ہونا (Being) کہا جاتا ہے۔ کسی بھی شے کا جسمانی طور پر غیر موجود ہونا ممکن ہے لیکن وہ تصوراتی اور نفسیاتی طور پر موجود ہی رہتی ہے۔"

کلچر اور نمائندگی کے تناظر میں جب ہم ادبیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ موضوعِ تقسیم کی اہمیت و انفرادیت حال، ماضی، مستقبل میں یکساں رہی ہے۔ ہائیڈی گر کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاروتھیا اولکوسکی (Dorothea Ol-Kowski) نے اپنے مضمون میں یہ کہا ہے کہ نمائندگی حال، ماضی اور مستقبل کے علاوہ وقت کی چوتھی جہت (Dimension) ہے۔

■

Dr. Rehman Akhter, Assistant Professor, Dept of Persian, Urdu and Arabic Punjabi University, Patila - 147002 (PB)

ایس ایس رضا

پھل اور سبزیاں
اچھی صحت کے ضامن

انگریزوں کی ایک کہاوت ہے کہ ”آپ وہ ہیں جو آپ کھاتے ہیں۔“ جس کا مفہوم ہے کہ غذا آپ کی شخصیت اور صحت کو برقرار رکھنے اور نکھارنے میں ایک اہم رول (کردار) ادا کرتا ہے۔ غذا کی اہمیت نہ صرف آپ کے جسمانی صحت کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ آپ کے ذہنی اور نفسیاتی صحت کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے —! کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایک ”صحت مند دماغ ایک صحت مند جسم میں ہی قیام پزیر ہوتا ہے۔“

قوت بخش اور متوازن غذا آپ کی صحت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ نہ صرف آپ کے جلد کے قدرتی رنگ کو نکھارتا ہے بلکہ آپ کے مدت حیات کو بھی دراز کرتا ہے۔ غذا کو متوازن اور قوت بخش بنانے میں سب سے اہم یہ ہے کہ آپ اپنی غذا میں پھل اور سبزیوں کو پوری مقدار میں شامل کردیں۔ ماہرین کے مطابق روزانہ سات یا اس سے زائد پورشن پھل اور سبزیوں کے استعمال سے آپ کئی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ماہرین نے ایک جائزے میں اس بات کی تجویز پیش کی ہے کہ روزانہ پانچ یا سات پورشن پھلوں اور سبزیوں کا استعمال عمر میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ تقریباً65ہزار مرد و خواتین پر عمل میں لائے گئے اس جائزے میں اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ ایسے افراد جو باقاعدہ طور پر پھلوں اور سبزیوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں ان میں مخصوص عمر میں فوت ہونے کے امکانات کافی حد تک کم ہوجاتے ہیں۔ پھلوں اور سبزیوں کے استعمال سے کینسر اور امراض قلب کے لاحق ہونے کا خطرہ بھی کم ہوجاتا ہے۔

تازہ سبزیاں اور پھلوں کے سلاد میں، ان کے جوس/عرق کے بنسبت زیادہ فائدہ بخش اثرات پائے جاتے ہیں۔

پھل اور سبزیوں دونوں میں ہی فائبر یعنی ریشہ خاصی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ جو کہ صحت کو بہتر رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ پھلوں اور سبزیوں کا ایک پورشن تقریباً80 گرام یا302ہوتا ہے۔

کنگز کالج آف لندن کے اسکول آف میڈیسین سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ٹام سینڈرس کا کہنا ہے کہ ایسے افراد جو پھل اور سبزیوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی بہتر اور اچھی صحت کے تعلق سے بھی آگاہ اور واقف رہتے ہیں اور یہ بات اور بھی دلچسپ ہے کہ ایسے افراد تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر بھی بہتر ہوتے ہیں۔ متعدد سائنسی جائزوں سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ جو لوگ زیادہ پھل اور سبزیاں استعمال کرتے ہیں ان میں امراض قلب اور بعض اقسام کے کینسر کا خطرہ بہت کم ہوجاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ صحت سے متعلق ماہرین سفارش کرتے ہیں کہ دن میں پھلوں اور سبزیوں کے کم از کم پانچ پورشن استعمال کیے جائیں۔

سبزیوں میں سب سے بہتر ہری پتے دار سبزیاں ہوتی ہیں، کیونکہ ان میں فائبر یا ریشے کی بھرپور مقدار ہوتی ہے۔ سبزیوں میں گاجر بھی غیر معمولی طور پر مفید تسلیم کی گئی ہے۔ ان میں وٹامن-A، بیٹا کروٹین کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ جو ایک قدرتی انٹی ایکسیڈنٹ ہے اور یہ عمر میں اضافے کی تحریک کا سبب بنتا ہے۔ پھل

اور سبزیاں ایک قوت بخش اور متوازن غذا اس لیے ہے کیونکہ ان میں وافر مقدار میں ان تمام چیزوں کی موجودگی ہوتی ہے جو ہمارے صحت کے نظام کو بہتر بناتی ہے۔ مثلاً ایک متوازن غذا کے لیے اس میں صحیح مقدار میں وٹامنز، منرلز (معدنیات) اور فائبر ہوتے ہیں۔ جو اچھی صحت کا مطلوبہ شرط ہے۔

اگر آپ مختلف اقسام کے پھل اور سبزیاں کھا رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کے جسم کو جن وٹامنز اور معدنیات کی ضرورت ہے وہ انھیں مل رہی ہیں۔ وٹامنز وہ نامیاتی اشیا ہے جو جانوروں اور پودوں میں پائی جاتی ہیں۔ بہت سے وٹامنز کو ہمارا جسم نہیں بنا سکتا ہے۔ اس لیے انھیں غذا کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ غذائی ماہرین نے وٹامن کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک چکنائی میں حل پزیر اور دوسری پانی میں حل پزیر ہونے والی۔ چکنائی میں حل ہونے والی وٹامنز میں وٹامن اے، ڈی اور کے شامل ہیں۔ پانی میں حل پزیر وٹامن ڈی اور وٹامن سی ہیں۔ یہ ہمارے جسم میں پانی کے ذریعے پہنچتے اور جذب ہوتے ہیں۔ ان دونوں اقسام کے وٹامنز کی ہمارے جسم کو روزانہ ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے جسم میں طویل عرصے کے لیے محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔

وٹامن 'اے': یہ وٹامن ہماری آنکھوں، ناک کی اندرونی سطح، حلق، پھیپھڑوں اور جلدی خلیات کی نشو و نما کرتا ہے اور گاجر، شکرقند، کدو، سرخ مرچ، ٹماٹر وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ پھلوں میں یہ خوبانی، آم میں موجود ہوتا ہے۔ غذائی ماہرین خواتین کو روزانہ 600 مائکروگرام جبکہ مردوں کی روزانہ 700 مائکروگرام وٹامن اے لینے کی سفارش کرتے ہیں۔

وٹامن 'ڈی': یہ وٹامن کیلشیم کے انجذاب میں ہماری مدد کرتا ہے۔ کیلشیم ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لیے ناگزیر ضرورت ہے۔ وٹامن ڈی کے حصول کا اہم ترین ذریعہ سورج کی کرنیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بہت محدود مقدار میں ڈیری مصنوعات، مچھلی کے تیل میں بھی پایا جاتا ہے۔ وٹامن ڈی کی روزانہ مقدار کی سفارش ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے حصول کا اہم ذریعہ سورج کی کرنیں ہیں۔

وٹامن 'ای': یہ وٹامن ہمارے جسم کے خلیات کو نقصان پہچانے والے غیر متوازن سالموں کا مقابلہ کرتا ہے۔ جنھیں فری ریڈیکل کہتے ہیں۔ وٹامن ای ہمیں سبزیوں، پولٹری، مچھلی، دلیہ، نباتاتی تیل، خشک گری سے حاصل ہوتا ہے۔ مردوں کو روزانہ چار ملی گرام اور خواتین کو روزانہ تین ملی گرام استعمال کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

وٹامن 'کے': یہ وٹامن ہمارے جسم کو مختلف پروٹینز پیدا کرنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ جن میں سے ایک پروٹین وہ بھی ہے جس سے خون کے جمنے میں مدد ملتی ہے۔ وٹامن 'کے' حاصل کرنے کے لیے ہمیں گہرے سبز رنگ کی سبزیاں مثلاً پالک بند گوبھی، برکولی، ایسپراگس وغیرہ استعمال کرنی چاہیے۔ سویابین کے تیل اور مارجربن میں بھی یہ موجود ہوتا ہے۔ مردوں اور خواتین دونوں کو اپنے جسم کے وزن کے ہر ایک کلوگرام کے بدلے ایک مائکروگرام وٹامن 'کے' کا روزانہ استعمال کرنا چاہیے۔

وٹامن بی کمپلیکس: وٹامن بی کے خاندان کے آٹھ ارکان ہیں: وٹامن بی کمپلیکس غذا کو ہمارے جسم کا حصہ بننے میں مدد دیتا ہے۔ اپنی وٹامنز سے ہمارے جسم میں خون کے خلیات تشکیل پاتے ہیں اور رگوں میں خون رواں دواں رہتا ہے۔

وٹامن 'سی': یہ وٹامن جسم میں کولیمن بنانے میں مدد کرتا ہے۔ پٹھوں میں پایا جانے والا یہ پروٹین جلد اور ہڈیوں کے لیے تو اہم ہی۔ اس کے علاوہ جسم میں فولاد کو جذب کرنے میں بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے! مختلف اقسام کی سبزیاں اور پھل وٹامن سی کے حصول کا اہم ذریعہ ہیں۔ سنترہ، لیموں، پالک، برکولی وغیرہ میں وٹامن سی پایا جاتا ہے، بالغ مردوں اور خواتین دونوں کے لیے یومیہ 40 ملی گرام وٹامن سی کی ضرورت ہوتی ہے۔

معدنیات: پھلوں اور سبزیوں سے صرف وٹامن ہی نہیں حاصل کیے جاتے ہیں بلکہ ان میں موجود معدنیات بھی ہماری صحت کو بہتر رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جب زمین سے سبزیاں اگتی ہیں تو یہ اپنے اندر معدنیات کی خوبیاں بھی جذب کر لیتی ہیں۔

وٹامن کی طرح معدنیات کو بھی دو گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا گروپ وہ ہے جس کی قلیل مقدار میں ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے گروپ میں وہ معدنیات ہیں جن کی بڑی مقدار صحت کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ بڑی مقدار والی ضروری معدنیات میں کیلشیم، میگنیشیم، سوڈیم، پوٹاشیم اور فاسفورس شامل ہیں۔

آئرن: آئرن خون کے سرخ خلیات کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔ ان کی کمی سے خواتین میں 'انیمیا' کی شکایت ہوتی ہے۔ گوشت، دلیہ، روٹی اور کچھ پھلوں اور سبزیوں میں آئرن مناسب مقدار میں موجود ہوتا ہے۔

جستہ: یہ عضلات کی مرمت کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ پھل، دودھ، پنیر اور انڈوں میں جستہ کی مقدار نمایاں ہوتی ہے۔

■

S. S. Raza C/o Zafar Imam, Road No A/8, Ali Nagar Colony, Anisabad, Patna - 2

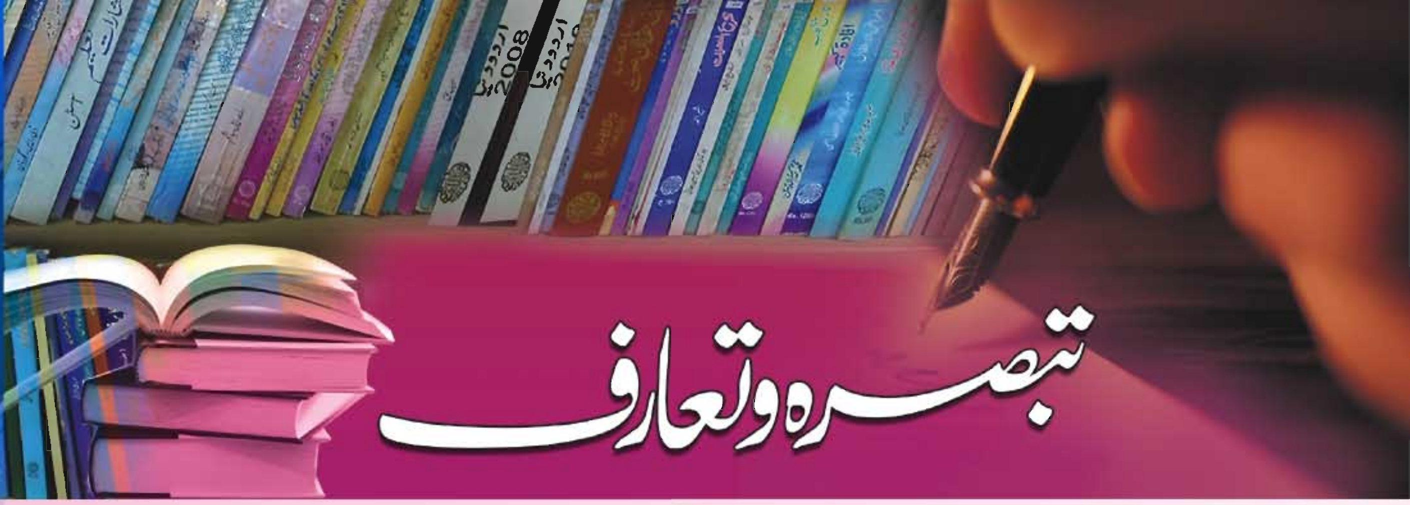

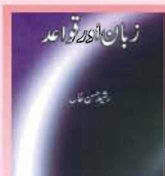

زبان اور قواعد

مصنف: رشید حسن خان
صفحات: 496، قیمت: 166 روپے، پانچویں طباعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: امتیاز احمد علیمی، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'زبان اور قواعد' رشید حسن خان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے تھے۔ اس میں بیشتر مضامین وہ ہیں جو زبان وبیان اور قواعد واملا سے متعلق ہیں۔ اس مجموعے میں شامل مضامین میں صحت الفاظ، مشترک الفاظ، لغت اور استعمال عام، ملائی۔بالائی، ترکیب مہنّد، سقوط حروف علت، اعلان نون، مختارات امیر مینائی اور بحرالبیان وغیرہ لسانی نقطہ نظر سے بے حد اہم ہیں۔ مذکورہ تمام موضوعات پر رشید حسن خان نے محققانہ رویہ اختیار کیا ہے اور ان موضوعات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ زبان اور قواعد سے متعلق ان کی دیگر تصانیف میں اردو املا، عبارت کیسے لکھیں، اردو کیسے لکھیں، انشا اور تلفظ وغیرہ کو پڑھتے ہوئے لسانیات پر ان کی کامل عبوریت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے زبان و بیان، تلفظ اور املا سے متعلق جو جو خامیاں اس وقت در آئی تھیں ان سب کی حتی الامکان اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی یہ کوشش کامیاب بھی رہی ہے۔

ہمارے یہاں صحت الفاظ اور تلفظ کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا تھا جسے ماہرین لسانیات نے سلجھانے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی ایسا اٹل اصول متعین نہیں ہوسکا جس پر سبھی اہل زبان کا اتفاق ہو۔ پھر بھی ستّر فیصد سے زیادہ تلفظ اور املے کے مسائل حل ہوچکے ہیں پچیس تیس فیصد حصہ آج بھی متنازع فیہ ہے۔ وہ اس لیے کہ اگر ہم عربی اور فارسی کے الفاظ کے تلفظ کو تبدیل کرکے اردو کا بنا کر کسی عربی یا فارسی کے عالم کے سامنے بولتے ہیں تو وہ اس پر معترض ہوتے ہیں اور باضابطہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ تو عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں جن کا تلفظ یہ ہے۔ بہرحال صحت الفاظ کے موضوع پر بہت ساری کتابیں لکھی گئیں جس میں مؤلفین اور مرتبین نے عموماً یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عربی وفارسی کے الفاظ، جہاں تک ہوسکے اسی طرح استعمال کرنا چاہیے جس طرح وہ ان زبانوں کے لغات میں محفوظ ہیں۔ فارسی اور عربی کے جن الفاظ میں حرکات کی تبدیلی ہوئی ہے یا ان کی صورت بدل گئی ہے یا قیاس کے واسطے سے کچھ نئی صورتیں معرض وجود میں آئی ہیں تو یہ ساری تبدیلیاں، اردو کے مزاج اور ہندوستانی لہجے کے اقتضا سے خود بخود عمل میں آئی ہیں۔ عربی اور فارسی کے جن الفاظ میں حرکات کی تبدیلی ہوئی ہے وہ یہاں کے لہجوں کے تقاضوں کی آئینہ داری کرتی ہیں مثال کے طور پر سیّد، جیّد، میّت، طیّب وغیرہ الفاظ عربی میں یا کے کسرے کے ساتھ مشدد ہیں لیکن اردو میں ان کو یا کے فتحے کے ساتھ مشدد پڑھا اور بولا جاتا ہے، یا جیسے فرشتہ، فریب، بہشت، وغیرہ الفاظ فارسی میں پہلے حرف کے کسرے کے ساتھ مستعمل ہے مگر اردو میں پہلے حرف کے فتحے کے ساتھ پڑھا اور بولا جاتا ہے، اس لیے اردو والوں کے لہجے کے اعتبار سے یہ تلفظ بالکل صحیح ہے۔ مذکورہ بالا باتیں رشید حسن خان نے تحقیق تدوین کے اصول وضوابط کی روشنی میں کہی ہیں اور ان کے اصل ماخذ سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عربی اور فارسی کے وہ الفاظ جو اپنی اصلی ہیئت کے بجائے تغیر وتبدل کے ساتھ اردو میں مستعمل ہیں تو اسے اردو کے ہی الفاظ تصور کرنا چاہیے نہ کہ عربی اور فارسی کے۔ اسی بات پر بیشتر ماہرین لسانیات نے اتفاق بھی کیا ہے۔

اس مجموعے میں شامل دوسرا مضمون 'مشترک الفاظ' کے عنوان سے ہے۔ مشترک الفاظ سے وہ لفظ مراد ہیں جن کی تذکیر وتانیث میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف کئی سطحوں پر ہے۔ کچھ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے تحت آتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کو ایک ہی دبستان کے بعض لوگ مذکر کہتے ہیں اور بعض مونث۔ کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو ایک زمانے تک مذکر مستعمل تھے بعد میں مونث ہوگئے اور اس کے برعکس بھی ہوا۔ یا یہ کہ کسی شاعر وادیب نے کسی لفظ کو رواج عام کے خلاف مذکر یا مونث کے طور پر استعمال کردیا تو لغت نویسوں نے اسے سند کے طور پر پیش کرنا شروع کردیا۔ ایسے بہت سے مشترک الفاظ کے اختلافی مسائل کو رشید حسن خان نے اس مضمون میں پیش کیا ہے اور حوالوں کے ساتھ اس کی اصلیت کو واضح کیا ہے۔ اسی طرح تیسرے مضمون 'لغت اور استعمال عام' میں ان الفاظ کی نشاندہی کی ہے جو استعمال عام میں کچھ اور ہیں اور لغت میں کچھ اور درج ہیں۔ اس سلسلے مین رشید حسن خان کا کہنا ہے کہ چونکہ زبان پہلے بنتی ہے اور قواعد ولغت کی کتابیں بعد میں مرتب کی جاتی ہیں اس لیے اصولی طور پر تو ہونا یہ چاہیے کہ جو لفظ عام طور پر جس طرح بولا جاتا ہے اس کو اسی طرح درج لغت بھی کیا جائے یا کوئی اور صورت ہو تو اس اختلاف کی نشاندہی کی جائے۔ اس حوالے سے یہ مضمون اہل لسان کے لیے بہت ہی اہم ہے۔ اسی طرح ایک اور مضمون 'ملائی۔بالائی' میں ملائی اور بالائی کے اصل موجد کون تھے، پہلی بار کس نے کہاں استعمال کیا، اس کی اصل کیا ہے، علمائے لغت نے کسے اصل قرار دیا ہے اس پر تحقیقی نقطہ نظر ڈالی ہے اور تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ 'یہ مان لینا چاہیے کہ یہ دونون لفظ پہلے بھی فصیح تھے اور اب بھی فصیح ہیں جو صاحب چاہیں 'بالائی' کہیں اور جس کا جی چاہے 'ملائی' کہے۔ گفتگو اور تحریر میں بعض مقامات ایسے بھی آسکتے ہیں جہاں صرف حسن بیان کے لحاظ سے فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کہاں پر ان میں سے کون سا لفظ کھپایا جائے'۔ مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ 'ترکیب مہنّد' کے تحت لفظ مہنّد اور ترکیب مہنّد کے معانی ومفہوم پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حروف علت کے سقوط اور عدم سقوط پر جامع گفتگو کرتے ہوئے 'اعلان نون' کی بحث کو بھی اٹھایا ہے اور اس پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس طرح سے اس مجموعے میں شامل تمام مضامین مصنف کی تحقیقی بصیرت کے غماز اور لسانیات پر عبوریت کے عکاس ہیں۔ ایسی کتابیں ادب کے ہر طالب علم کے پاس ہونی چاہیے اور اس کا مطالعہ بھی کیا جانا چاہیے تاکہ ہم سب کے اندر بھی تحقیقی بصیرت کا مادہ پیدا ہوسکے۔

ناول اور عوام

مصنف: رالف فاکس، مترجم: ڈاکٹر سید محمد کاظمی
صفحات: 186، قیمت: 84 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو بھون، نئی دہلی
مبصر: ام اسما، 9 - C، ایچ پارک۔ مہانگرا یکسٹینشن

زیرِ نظر کتاب ’ناول اور عوام‘ رال فاکس کی انگریزی تصنیف کا اردو قالب ہے، جسے ڈاکٹر سید محمد کاظمی نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ کتاب اور ترجمے دونوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

رال فاکس کی تصنیف The Novel and the people (ناول اور عوام) 1937 میں منظرِ عام پر آئی۔ انھوں نے ناول جیسے اہم موضوع کو سماج اور فطرت کے خلاف فرد کی جدو جہد کا رزمیہ قرار دیا۔ اس نے حیات انسانی اور ادب کو لازم و ملزوم قرار دیا۔ فاکس کے مطابق احساسات کی داخلی دنیا اور مسائل کی خارجی دنیا سے کوئی تصادم نہیں ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے دونوں کو بہت ہی فلسفیانہ انداز میں سماج کی حقیقت نگاری کے لیے پیش کیا۔ اس کے بارے میں اس کا یہ بھی خیال ہے کہ ”کوئی بھی ناول نگار اس وقت تک انفرادی اور شخصی صورت حال کا خاکہ نہیں کھینچ سکتا جب تک کہ وہ اجتماعی صورت حال کے بارے میں معلومات نہ رکھتا ہو۔“ فاکس یہ بھی لکھتا ہے کہ ”ناول نگار کو زندگی کی گونا گوں صورت حال کا شعور ہونا ضروری ہے۔“ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جب تک مصنف کو عوام کے مسائل کے بارے میں معلومات نہیں ہوگی تب تک وہ ایک ناول کی صورت میں ان مسائل کو پیش نہیں کرسکتا ہے۔ اس کے لیے ناول نگار کے لیے ان ساری کیفیات کے بارے میں معلومات ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی ہیں۔

رال فاکس کے تنقیدی افکار کو اس کے عہد میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس کے بعض ہم عصروں کا خیال ہے کہ وہ تنقید نگار ہونے کے ساتھ ساتھ نظریہ ساز بھی تھا۔ برطانیہ کے قصبہ ہیلی فیکس میں مارچ 1900 میں پیدا ہونے والے رال فاکس کی علم و ادب سے دلچسپی کا اندازہ بچپن سے ہی تھا۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ ایک نمونے کے طور پر پیش کیے جانے لگے۔ اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ رال فاکس نے مغرب میں ناول نگاری کے ارتقا سے بحث کرتے ہوئے اس پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ اس تصنیف کا تعلق خاص طور سے ناول اور اس کی تنقید سے ہے۔

محمود کاظمی نے کتاب کے مقدمے میں جن عالمانہ خیالات کو پیش کیا ہے ان میں ناول کے آغاز و ارتقا پر نہایت کارآمد بحث مقدمے کی شکل میں سامنے آگئی ہے۔ انھوں نے اپنے مقدمے میں ترجمے کے مسائل اور فوائد پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے مقدمے کا روشن پہلو یہ ہے کہ مترجم زبان و بیان کے ساتھ ساتھ نفسِ موضوع پر غیر معمولی گرفت رکھتا ہے۔ اور وہ نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں فکشن کی روایت سے پوری طرح واقف ہے۔ اس سے رال فاکس کی تصنیف کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں کل گیارہ مضامین شامل ہیں۔ عرض مترجم کے تحت شامل مضمون سے اس کتاب کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ آر پومیرن تسوا کے مقدمے کو اردو زبان میں ترجمے کے ذریعے منتقل کیا گیا ہے جو کہ علمی، ادبی، سماجی، تاریخی و تنقیدی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ’فاکس کا نظریہ زندگی اور تصنیف ان تاریخی واقعات نے متعین کی ہے جو بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی تاریخ میں وقوع پذیر ہوئے‘۔ مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ ناول کے عروج پر تبصرہ کرتے ہوئے فاکس فن کے عہد کی تقسیم کے لیے معاشرے کی تاریخ کو ہی بنیاد بناتا ہے جبکہ برطانیہ کے دیگر مارکسی ادیبوں کے لیے فن کے ماضی کا موضوع دلچسپی کا باعث نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فاکس نے اپنے لیے سخت معیار متعین کیے تھے۔

کتاب میں شامل مضامین کے عناوین اس طرح ہیں: مارکسیت اور ادب، سماج اور حقیقت، ناول اور حقیقت، ناول بحیثیت رزمیہ، وکٹوریائی مراجعت، پرومیتھنس، ہیرو کی موت، اشتراکی حقیقت پسندی، جیتا جاگتا انسان، نثر کا گمشدہ فن، ثقافتی ورثہ ہیں۔

فاکس نے اپنی اس کتاب میں ادب اور سماج کے باہمی روابط پر بہت اہم گفتگو کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ادب کی عظیم روایات کو نہ صرف بحال کیا جائے بلکہ تنگ نظری کے بندھن کو بھی توڑا جائے۔ ’ناول اور حقیقت‘ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرے کے تضادات نے بے شمار مسائل کو جنم دیا ہے اسی میں نسلی و قومی منافرت، جنس کی بنیاد پر تعصب وغیرہ شامل ہیں جو کہ عالمی ادب کے فروغ میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ فن کو حقیقت کا عظیم پہلو عطا کرنے کے لیے ان رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر جدید معاشرے کی سچائیوں کا ادراک نہیں کیا جاسکے گا۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دلائل کے ساتھ افکار و نظریات کو واضح کیا گیا ہے۔ مارکس کی تھیوری اور اس کے نظریے پر عمیق نظر رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ مصنف کا خیال ہے محنت کش طبقے میں ایسے لوگ بھی جو اشتراکی حقیقت پسندی یا انقلابیت کو ناول میں سنجیدگی کے ساتھ قبول نہیں کرتے ہیں وہ اس کو ایک سیاسی پہلو سے بھی دیکھنے اور جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں جہاں ہر ایک چیز کے حصول میں آسانی پیدا ہوتی جارہی ہے لوگوں کے پاس وقت کی قلت پیدا ہوگئی ہے اور اب مطالعے کی طرف زیادہ سے زیادہ وقت نکالنا اور مطالعہ کرنا ایک اہم مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ یہ زمانہ انفارمیشن ٹکنالوجی کا زمانہ ہے ہر ایک معلومات جلد از جلد قاری تک پہنچ جاتی ہے۔ رالف فاکس کی تصنیف ناول اور عوام جس کو اردو زبان میں منتقل کر کے ڈاکٹر سید محمود کاظمی نے بلاشبہ اردو کے ادبی و علمی سرمایے میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس سے اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور اصناف ادب کو اپنی بحث و تحقیق کا موضوع بنانے والے دونوں کو خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ مترجم اور ناشر دونوں بلاشبہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ایک دانشور-ایک مفکر دیویندر اسر

مرتب: نند کشور وکرم
صفحات: 240، قیمت: 250 روپے
ناشر: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی
مبصر: شاہ نواز فیاض، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو زبان کی ترقی و اشاعت میں روز اول ہی سے بلا تفریق ہر مذہب کے لوگوں نے اسے اپنایا اور یہ سلسلہ کبھی منقطع ہونے والا نہیں۔ زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے، اور نہ ہی کوئی علاقہ۔ یہ اس رواں دواں سمندر کے مانند ہے، جو اپنا راستہ خود نکال لیتا ہے۔ زبان و ادب کو نہ تو کبھی کسی مذہب سے جوڑا جاسکتا ہے، اور نہ ہی کسی خاص علاقے تک محدود کیا جاسکتا ہے۔ زبان و ادب کا تعلق براہ راست ہماری تہذیب و ثقافت سے ہے۔ کرشن چندر، دیاشنکر نسیم، چکبست، پریم چند، راجندر سنگھ بیدی سے لے کر دیویندر اسر اور نند کشور وکرم تک ایک لمبی فہرست ہے۔ جس نے اپنی زبان کے طور پر اردو کو قبول کیا اور ذریعۂ اظہار بھی بنایا۔

زیرِ نظر کتاب ’ایک دانشور-ایک مفکر دیویندر اسر‘ کو نند کشور وکرم نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں کل 26 مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نند کشور وکرم نے ’ایک دانشور کی موت‘ کے عنوان سے دس صفحے کا ابتدائیہ بڑے دردمندانہ انداز میں لکھا ہے اور کتاب کے آخری دو حصے، جس کے پہلے حصے میں کرشنا سوبتی نے دیویندر اسر کو منظوم خراج تحسین پیش

کیا ہے اور آخری حصے میں دیویندر اسر کی ایک تصویر شائع کی گئی ہے۔ جس کے نیچے 'دیویندر اسر کی آخری یادگار تصویر' لکھا ہے۔ اس کتاب کو کل آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ ابتدائیہ کے بعد 'سوانح اشاریئے' کے نام سے ہے۔ اس حصے میں صرف ایک مضمون 'دیویندر اسر: اک نظر میں' خود مرتب کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ 'شخصیت' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں کل 9 مضامین شامل ہیں اور اس کتاب کا سب سے اہم اور معلوماتی حصہ بھی یہی ہے۔ اس حصے میں معروف افسانہ نگار سریندر پرکاش، اور 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' کے مصنف پروفیسر شمیم حنفی کے علاوہ حیدر قریشی، کملا کامت وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ اس حصے میں کچھ نئے مضامین ہیں اور کچھ کو 'عالمی اردو نمبر 1995' سے لیا گیا ہے۔ لیکن مرتب نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مضامین کی فراہمی کی پوری تفصیل بھی درج فرمائی جائے۔ یہ حصہ کل پچھتر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اگلا حصہ 'بالمشافہ ملاقاتیں' کے عنوان سے ہے۔ اس کے عنوان سے ہی لگتا ہے کہ اس میں انٹرویو یا تاثراتی مضامین شامل ہوں گے۔ اس حصے میں کل دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا آر۔ کیپالیوال کا انٹرویو ہے، جو انھوں نے دیویندر اسر سے لیا تھا اور اس کو اردو میں حیدر جعفری سید نے منتقل کیا اور دوسرا گور چرن سنگھ کا انٹرویو ہے۔ اس کا بھی ترجمہ حیدر جعفری سید نے 'پتھروں کے شہر میں ایک شیشہ گر' کے عنوان سے کیا ہے۔ 'ایک منفرد نقاد' اس کتاب کا چوتھا حصہ ہے۔ اس حصے میں دیویندر اسر نے بحیثیت نقاد جو خدمات انجام دی ہیں، اور اس ضمن میں ان کے جو کارنامے ہیں، اس کا جائزہ جہاں ڈاکٹر تارک ناتھ بالی نے 'ایک منفرد مفکر۔ نقاد' کے عنوان سے لیا ہے، وہیں اردو کے معروف شاعر و نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے 'متبادل تنقید اور دیویندر اسر' کے عنوان سے بڑا معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس حصے میں منموہن چڈھا اور راجی سیٹھ کے بھی مضامین شامل ہیں۔ اس حصے کے پہلے مضمون کو اردو میں حیدر جعفری سید ہی نے ترجمہ کیا ہے اور پروفیسر عتیق اللہ کا مضمون 'عالمی اردو نمبر، 1995' سے لیا گیا ہے۔ اس کے بعد اگلا حصہ دیویندر اسر کا مشہور ناولٹ 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' کے ہی عنوان سے ہے۔ اس حصے میں کل چار مضامین شامل ہیں۔ جہاں دیویندر اسر کو بحیثیت ناول نگار جائزہ لیا گیا ہے اور کل پانچ مضامین شامل کتاب ہیں۔ اس حصے کے آخری دو مضامین ترجمہ ہیں۔ جسے حیدر جعفری سید نے ہی ترجمہ کیا ہے اور شمویل احمد کا مضمون 'گہری ہوئی گپھاؤں کی کہانی'، 'عالمی اردو نمبر، 1995' سے لیا گیا ہے۔ ایک مضمون جو ساجدہ زیدی کا 'گریز اس کیفیات کے لمحے وہ نیا مضمون ہے۔ کیونکہ اس کے آخر میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ 'ایک کتاب اور' کے عنوان سے اس کتاب کا آخری سے پہلے کا حصہ ہے۔ اس میں صرف ایک مضمون للت شکلا 'پل ہوتے الفاظ: شبد ستارے' کے عنوان سے ہے۔ دراصل 'شبد ستارے' دیویندر اسر کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے مختلف اشخاص پر تحریر کیے تھے اور للت شکلا نے اس کتاب پر تبصرہ کیا تھا اور وہی تبصرہ اس کتاب میں ذکر بالا عنوان کے تحت شائع کیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'ایک دانشور۔ ایک مفکر دیویندر اسر' کے مرتب نند کشور وکرم اردو کے معروف و مشہور نقاد کے علاوہ ایک اچھے مترجم اور کہانی کار کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ موصوف کو بیک وقت کئی زبان پر کامل دسترس حاصل ہے۔ جہاں وہ اردو اور ہندی سے اچھی طرح واقف ہیں، وہیں پنجابی اور انگریزی میں بھی مہارت حاصل ہے۔ یہ کتاب یقیناً ان کے اعلیٰ ظرف کی علامت ہے۔ جہاں انھوں نے اپنی دوستی کو ایک دستاویز کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ دیویندر اسر جیسی شخصیت پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی، جس سے ان کے تئیں لوگوں کی رائے سامنے آسکے اور نند کشور وکرم نے اس کام کو بخوبی انجام دیا ہے۔ یقیناً ان کی شخصیت اس کے لیے قابل مبارکباد ہے۔ 240 صفحات پر مشتمل یہ کتاب قیمتاً بھی بہت مناسب ہے۔ جسے آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کی یہ کتاب ہے، اس سے دیویندر اسر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے۔ سرورق بھی کافی دیدہ زیب ہے اور کتاب کے دونوں طرف دیویندر اسر کی تصویر بھی ہے اور دونوں تصویریں ان کی شخصیت کی بھرپور ترجمانی کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ البتہ اس کتاب میں کہیں کہیں پروف ریڈنگ کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن وہ بھی بہت کم ہیں۔ اس سے اس کتاب کی اہمیت پر ذرہ برابر فرق نہیں پڑے گا۔ یقین ہے کہ قاری حضرات اس کتاب کو پسند کریں گے، اور قبولیت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

وہاب نامہ

مرتب وناشر: وقار مانوی
صفحات: 336، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2014
مبصر: عابد انور، ڈی 64، فلیٹ نمبر 10،
ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'وہاب نامہ' مشہور شاعر وقار مانوی نے مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں مقتدر ہستیوں اور اہل علم کے عبدالوہاب خاں سلیم پر لکھے گئے 49 مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ گوشہ خطوط، تہنیتی منظومات اور تصاویر ہیں۔ اس کتاب میں تمام لوگوں نے ان کی کتاب دوستی اور فیاضی اور خاص طور پر کتابوں کے لیے فیاضی کا دل کھول کر ذکر کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق کے بقول ''عبدالوہاب خاں سلیم کو نہ دیکھا نہ برتا، مگر چرچے کئی زبانوں پر ہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں ذی علم اور خوش فکر احباب سے سنتا ہوں تو یقین کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ ان کی علمی دل نوازی اور کتابوں کی پذیرائی کے واقعات سن کر جی خوش ہوتا ہے کہ معاش و مفاد کے دور ناہنجار میں قرطاس و قلم کی آبرو کا احترام اور حفاظت مرد نیکو کار ہی کر سکتا ہے۔'' اس میں کوئی دو رائے نہیں ایک ایسے شخص نے جس نے شاید کوئی کتاب نہ لکھی ہو لیکن سیکڑوں کتابیں لکھوانے میں مدد کی ہے ان کی حیثیت مصنف سے کمتر نہیں گردانی جاسکتی۔ ان کی علم دوستی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی لائبریری میں پندرہ ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ جو بیشتر حج وعمرہ کے سفرناموں، سیرت رسول، تاریخ اور اسلامیات اور ادبیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی لائبریری کے بارے میں ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری نے اپنے سوانح عمری بعنوان ''کیا بیت گئی؟ قطرہ پہ گہر ہونے تک'' میں وہاب صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہاب صاحب نے ایک بار بتایا کہ ان کے پاس اردو فارسی، عربی اور انگریزی کی تقریباً دس ہزار کتابیں جمع ہوگئی ہیں۔ ان کی کثیر تعداد حج و عمرے کے سفرناموں کی ہے۔'' ان کے ان کارناموں پر ہندوستان، پاکستان اور دیگر ادباو شعرا انھیں اپنے خطوط، مضامین اور کتابوں میں خراج تحسین پیش کر چکے ہیں ان میں خاص نام ڈاکٹر عطا خورشید، مہر الٰہی ندیم، پروفیسر مختار الدین علی گڑھ، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، جامعہ کراچی، رشید خاں حسن خاں، انتظار حسین، ڈاکٹر سفیان اصلاحی قابل ذکر ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں ہندوستان، پاکستان، امریکہ اور دیگر ممالک کے 49 اہل علم حضرات نے عبدالوہاب خاں سلیم پر مضامین لکھے ہیں۔ ان میں پروفیسر عبدالحق، پروفیسر غنی الاکرم سبزواری، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، وقار مانوی، ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر نگار سجاد ظہیر، تصور حسین جنجوعہ، عظیم اختر، ڈاکٹر محمد شہاب الدین، ڈاکٹر معصوم شرقی، محمد عارف اقبال، سہیل انجم ڈاکٹر فیروز دہلوی وغیرہ کے اسما شامل ہیں۔ ان مقتدر اصحاب قلم کی عبدالوہاب خاں سلیم پر خامہ فرسائی ان کی شان اور شخصیت کو تابندہ بناتی ہے اور کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ شخصیت میں دم تو ہے ورنہ اتنے سارے قلم کار اور اہل علم نہ لکھتے۔ دیار مغرب میں اللہ تعالیٰ کسی کو مال وزر سے نوازتا ہے تو ان میں سے بیشتر لوگ اپنا پیسہ عیش پرستی اور نام ونمود میں صرف کرتے ہیں لیکن

عبدالوہاب خاں نے اپنی رقم کو علم دوستی کے لیے صرف کیا۔ انھوں نے مصنفوں، مؤلفوں اور مرتبوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کے ساتھ مالی تعاون کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسودے کتابی شکل لے سکے۔ اس کے علاوہ سید جمیل احمد رضوی (سابق چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لاہور) نے عبدالوہاب خاں سلیم کی ادبی، ثقافتی، علمی سرگرمیوں پر مشتمل ایک کتاب ''عبدالوہاب خاں سلیم: پیکر جود وعطا'' کے نام سے مرتب کی ہے جو ادارہ فروغ مطالعہ لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ جو ان کی گونا گوں شخصیت کی کہانی بیاں کرتی ہے۔ جناب سید جمیل احمد رضوی کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں عبدالوہاب خاں کے علمی ذوق وشوق، علم دوستی، اخلاق، کتابوں کے مصنفوں کے ساتھ روابط، ادیبوں وشاعروں کی خبر گیری اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ وغیرہ کی باتیں کہی گئی ہیں اور اردو سے بے پناہ تعلق اور عشق کا اظہار ملتا ہے۔ ڈاکٹر معصوم شرقی نے اپنے مضمون ''پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ لوگ'' میں لکھتے ہیں کہ اردو کے سچے خادم عبدالوہاب خاں سلیم صاحب کا اسم گرامی اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی راقم الحروف کے ذہن میں محفوظ تھا۔ ان کی فیاضی کے چرچے اور مضامین کے مطالعے سے موصوف کی علمیت سے کما حقہ واقفیت ہوگئی تھی۔'' آگے لکھتے ہیں 'علم پرور خاں صاحب عاشق اردو ہی نہیں دیوانہ اردو ہیں۔ اردو کے عشق نے انھیں کئی بیماریوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔''

مجموعی طور پر وقار مانوی نے یہ کتاب ترتیب دے کر اردو کے ایک شیدائی کو بہترین خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے کچھ اردو دوست، علم دوست، اردو کے مزید خادم پیدا ہو جائیں اور اردو کی صورت حال کو بہتر کرنے میں مدد ملے۔ کتاب کی طباعت، کتابت اور کاغذ بہت عمدہ ہے۔ اردو کے قارئین کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے تا کہ اردو اور کتابوں کے تئیں ان کے دل میں تھوڑا سا جذبہ پیدا ہو سکے۔ صورتِ حال تو یہ ہے آج کل وہ مسلمان جن کے آبا و اجداد نے اردو کی زلف کو سنوارا ہے وہ کہتے ہیں ''اردو پڑھتا کون ہے۔'' ہم دوسروں سے کیا گلہ کریں اردو کی روٹی کھانے والے ہی اردو کے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔ بہر حال یہ کتاب امید کی ایک کرن ہے اور وقار مانوی لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب ترتیب دے کر دیگر اصحاب مال وزر کے لیے ترغیب حاصل کرنے کا ذریعہ پیدا کیا ہے۔

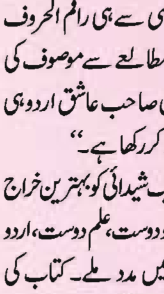

تفہیم شبلی

مرتب وناشر: ڈاکٹر ارشاد نیازی

صفحات: 498، قیمت: 225 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: سلمان عبدالصمد N106 فرسٹ فلور، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

'تفہیم شبلی' علامہ شبلی نعمانی کی زندگی کے نشیب وفراز، متضاد اوصاف، تحقیقی وتنقیدی کاوش اور فنِ مرثیہ گوئی پر کی گئی ان کی لازوال پیش رفت کے افہام وتفہیم کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ مرتب ڈاکٹر ارشاد نیازی نے ترتیب وتدوین کے لیے ترجیحی بنیاد پر جن مضامین ومقالات کا انتخاب کیا ہے، وہ نہ صرف محبانِ شبلی خصوصاً طلبا کی شبلی شناسی میں ممد ومعاون ہیں، بلکہ دیگر ادبا وشعرا کے فکر وفن کو پرکھنے کے سلیقے سے طلبا کو روشناس کرانے میں بھی یہی مضامین اہم کردار ادا کریں گے۔

یوں تو اس مجموعے میں شبلی کی شخصیت وشاعری، تنقید وتحقیق، سوانح ومکتوب نگاری اور سفرنامے سے متعلق کل 25 مضامین شامل ہیں۔ تاہم ڈاکٹر ارشاد نیازی کے چار مبسوط مضامین میں ہی تفہیمِ شبلی کے لیے اتنا مواد موجود ہے، جو ہر قاری کے ذہن کو شبلی آشنا بنا دے گا۔ شبلی نے تصنیف وتالیف کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے، وہ ان کی دور اندیشی اور حالات کی نبض شناسی کی واضح دلیل ہے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ شبلی انتخابِ موضوعات کے بعد نہ صرف معلومات افزا مضامین کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، بلکہ ان موضوعات سے ایک طرف علم ولطافت اور تحقیق وجستجو کا دریا پھوٹتا ہے تو دوسری طرف ہمت وجوانمردی اور عزم واستقلال کا سورج بھی طلوع ہوتا ہے۔ شبلی نے ابتداً سوانحی تحریروں کے لیے جن شخصیات کا انتخاب کیا، ان کے اندر 1857 کے خونچکاں حالات سے دلبرداشتہ مسلمانوں کی دل بستگی کا سامان بھی ہے اور فنِ سوانح نگاری کا نقطۂ عروج بھی۔ شاید انھی اسباب وعلل پر ڈاکٹر نیازی نے حالی سے بہتر سوانح نگار شبلی کو قرار دیا ہے۔

ایک طرف ڈاکٹر نیازی نے اردو شاعری میں تاریخی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی موضوعات کو نظم کی لڑی میں پرونے کی روایت شبلی کے فکر وقلم سے جوڑ دی ہے، وہیں شبلی کے اہم تنقیدی سرمایہ موازنہ پر لگنے والے الزامات کے باوجود مرثیہ کے فنی لوازمات کی حد بندی اور موزوں تنقیدی اصول وقواعد کے اختراع کا سہرا بھی ان کے ہی سر باندھا ہے۔ کیونکہ اول دن سے ہی ان کے وضع کردہ اصول فنِ مرثیہ گوئی پر حاوی ومحیط ہے، یہاں تک کہ ان میں تبدیلی کی گنجائش بھی پیدا نہیں ہوئی۔ شبلی نے فقط مرثیہ کو مذہبی گھیرابندی سے باہر نکالا بلکہ انیس کے ساتھ ساتھ دبیر کے فکر وفن کو پرکھنے کی کاوش کے لیے بھی نقادوں کو تنقیدی شاہ راہوں پر گامزن کر دیا۔ مرتب نے یہ بھی سچ ہی کہا ہے کہ دبیر کی عظمت آج جن اصولوں اور بنیادوں سے مربوط ہے، اس میں بھی شبلی کی ہی کرشمہ سازی ہے، مگر اس کے باوجود دبیری حضرات نے شبلی کی اس کاوش کو پوری طرح بنظر استحسان نہیں دیکھا ہے۔ ان جملوں کی صداقت پر شمس الرحمان فاروقی نے بھی مثبت مہر ثبت کی ہے۔

498 صفحات پر مشتمل 'تفہیم شبلی' کے تمام مضامین پر بالاستیعاب نظر ڈالنے کا موقع نہیں ہے۔ خورشید احمد کا مقالہ 'شبلی، شعر العجم اور پیرویِ مغربی' سے پتہ چلتا ہے کہ شبلی نے انگریز نقاد جان اسٹورٹ مِل اور ولیم ہنزلٹ سے بھی اکتسابِ فیض کیا ہے۔ ان کے افکار وخیالات اور نظریات والفاظ مستعار لیے ہیں، مگر شبلی کے تنقیدی مسلک پر بات کرتے وقت شبلی کے تخیل کو فقط کولرج کے تصورات سے انضمام کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح سید احتشام حسین کے مضمون 'موازنہ انیس ودبیر' سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر شبلی نے موازنہ کیوں لکھی اور دبیر کی بجائے انیس کی طرف ان کا جھکاؤ کیوں رہا۔ وہ تین باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اول، شبلی نے حماسہ کے اشعار پڑھے تھے، جو بلند حوصلگی، فنی کمال اور جود وسخا کا بہترین نمونہ ہے، شبلی کو اردو میں اسی پایے کے اشعار کی تلاش تھی، شاید انھیں ایسے اشعار انیس کے یہاں ملے۔ دوم، اردو شاعری کو زوال پذیری کا لبادہ اوڑھا کر اسے فقط لب ورخسار اور زلف وخال یا جھوٹی خوشامد کا پلندہ قرار دیا جانے لگا تھا، شاید شبلی نے انیس کے کلام سے جواہرات چن چن کر یہ دکھانے کی کوشش کی کہ لب ورخسار کے باوجود بھی اردو شاعری، بہترین شاعری کا نمونہ ہے۔ سوم، شبلی کی جمال پرست طبیعت اور مذاق سخن کی تسکین کا سامان انیس کے یہاں ہی ہو، اس لیے شبلی نے شاید انیس کی شاعری کو ہی اپنا مطمح نظر بنایا۔ شبلی کی اردو شاعری پر آل احمد سرور کے مقالے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کی شاعری سلاست وروانی، نادر تشبیہات واستعارات اور حسین زبان وبیان کی مرقع ہے۔ قوم کی ذہنی پستی، اخلاقی انحطاط اور سیاسی زوال کی داستان ہونے کے باوجود اعلی ظرفی اور بلند اخلاقی کا درس دیتی ہے۔ اسی طرح شبلی کی مکتوب نگاری پر اخلاق احمد کا مقالہ شامل ہے، جس سے شبلی کے عادات واطوار اور ان کی زندگی میں پائی جانے والی بے چینی پر روشنی پڑتی ہے، مگر اس مقالے کی طوالت میں شبلی کی مکتوب نگاری کی فنی خوبی وخامی چھپ کر رہ گئی ہے، البتہ شبلی کے اہل خانہ اور ان کا خاندانی پس منظر واضح طور پر سامنے آتا ہے، اس مقالے میں جس کی شاید گنجائش نہیں ہے، ساتھ ہی اس مقالے میں ان کی مکتوب نگاری عطیہ فیضی کی تنگنائیوں میں پھنستی نظر آتی ہے، اس کے علاوہ ارشاد نیازی کے اس جملے ''مرثیہ ایسی صنف ہے جو اردو کی اپنی ایجاد ہے'' سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ بہر کیف! صاحب کتاب نے ذیل کے ان جملوں میں شبلی کے فکر وفن کو سمونے کی کوشش کی ہے:

''شبلی کا اسلوب پرشکوہ ہے، جسے بجاطور پر مبنی بررومان کہا جاسکتا ہے۔ ان کی فارسی واردوشاعری پرکشش اور انقلابی ہے جس میں ایک جہان آباد ہے۔ سیرت میں خلوص ہے۔ سوانح وقت کی آواز۔ سفرنامہ کی ترتیب عوامی تقاضے۔ تنقید برحق ہے۔ یہ خطوط ہی ہیں جو سادگی کا سرمایہ ہیں۔''

'تفہیم شبلی' کی ترتیب میں مرتب کا جو خیال ہے، یعنی خاص طور سے طلبا کی ضرورتوں کے پیش نظر یہ کاوش کی گئی ہے، اس میں انھیں کامیابی ملے گی ہی۔ ساتھ ہی ساتھ ادب کے شائقین، تنقیدی پھولوں سے دل بہلانے والے اور محبانِ شبلی کے لیے بھی یہ ترتیب کا گلدستہ بہترین تحفہ ثابت ہوگا۔

غریب خانہ سجا رہا ہوں

مصنف/ ناشر: محمد رفیع انصاری

صفحات: 128 قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: جولائی 2014

مبصر: اسما، فلیٹ نمبر R206، تیسری منزل، سرسید روڈ، گلی نمبر 5، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

اردو ادب کی بیشتر اصناف کی طرح انشائیہ بھی انگریزی ادب کے زیرسایہ اردو میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں ہوا۔ انشائیہ نثر کی ایک ایسی صنف ہے جس میں زندگی کے کئی نیم تاریک گوشے یا کسی عام چیز کے انوکھے اور تازہ پہلو کو غیررسمی طور پر طنز و مزاح کا سہارا لیتے ہوئے اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے متذکرہ پہلوؤں کو قاری کے غور وفکر پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

زیرتبصرہ کتاب محمد رفیع انصاری کے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے جو حال ہی میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے جس کا انتساب ادبِ لطیف کے قدردانوں کے نام کیا گیا ہے۔ اس میں 30 انشائیے شامل ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں مصنف نے حروفِ تشکر کے عنوان سے اپنے ادبی شوق کے ارتقائی منازل کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے اپنے انشائیہ نگاری کے فن کی شروعات جنوری 2011 بتائی ہے۔

کتاب میں شامل بیشتر انشائیوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ محمد رفیع انصاری کے فن میں پختگی اور توازن برقرار ہے۔ ان کے زیادہ تر انشائیے افسانوی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں ڈرامائی انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور حسبِ ضرورت اشعار کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً انشائیہ 'غریب خانہ سجا رہا ہوں' کے آخر میں یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تمہارے جلوؤں کی روشنی سے غریب خانہ سجا رہا ہوں
وہ ڈھل چکا دن وہ شام آئی، چراغ گھر میں جلا رہا ہوں

'غریب خانہ سجا رہا ہوں' میں جدید دور کی شہری زندگی کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ آج جس طرح فلیٹ نما گھر بنانے کا رواج عام ہو رہا ہے اس میں انسانی زندگی کس طرح گھٹ رہی ہے۔ محمد رفیع انصاری نے اس میں فلیٹ بنانے میں پیش آنے والی مشکلات کو ظاہر کرکے دراصل پیشہ وروں کی مفاد پرستی کو عیاں کیا ہے۔ خواہ وہ راج گر ہو، کارپینٹر ہو، وائرمین ہو یا پلمبر سب کے سب مفاد پرستی اور جعل سازی کے جال بچھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس میں ایک متوسط طبقے کے آدمی کے لیے فلیٹ بنانے کا مسئلہ آج کے ایک اہم مسئلے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

انشائیہ 'اردو کا اگلا قاری' کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں اردو کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس کی موجودہ صورتِ حال کو عیاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو کے فروغ کی ذمے داری اردو داں طبقہ شاعر، مصنف، ادیب اور قاری کے کاندھوں پر عائد کی ہے اور اردو کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ کون کون سے عوامل ہیں جو اردو کی ترقی اور اس کے فروغ میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن کے کاندھوں پر اردو کی عمارت کھڑی ہے وہ ہی خود اپنے بچوں کو اردو پڑھانے سے قاصر ہیں ایسے میں اردو کے مستقبل کا تاریک ہونا لازمی ہے۔ مذکورہ وجوہات ہی دراصل اردو کے زوال کے ضامن ہیں۔ اگر اردو داں اپنی ذمے داریوں کو سمجھتے ہوئے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دیں اور اس سے محبت کرنا سکھائیں تو صرف یہی ایک قدم اردو کو زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوسکے گا۔

اگلا انشائیہ 'چائے' ایک دلچسپ اور معلوماتی انشائیہ ہے۔ اس میں چائے کے ذریعے الگ الگ ملکوں کی تہذیب وتمدن اور کھان پان کے مختلف طریقوں پر بات کی گئی ہے۔ چائے ایک ایسا مشروب ہے جس کے بنانے اور پینے کے طریقے ہر جگہ مختلف ہیں۔ چین اور امریکہ میں چائے جہاں صرف شوق اور ذہنی تسکین کا ذریعہ ہے وہیں ہندوستان جیسے غریب پرور ملک میں چائے پانی کے بعد ایک ضروری غذا بن چکی ہے۔ اس انشائیے میں چائے کی مختلف اقسام اور فوائد کا ذکر تو ملتا ہے مگر اس کے نقصانات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

'معمول کی بات' بھی ایک بے حد اہم انشائیہ ہے جس میں سماج میں پنپنے والی ان برائیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو آج محض ایک معمول کی بات بن چکی ہے۔ ان میں جھوٹ، فریب، دھوکا، دھڑی اور تیزی سے بڑھتے ہوئے جرائم، جس میں موبائل فون، ٹیلی ویژن اور ان پر دکھائے جانے والے ریلٹی شوز کا بھی کہیں نہ کہیں دخل ہے۔ آج کا انسان اتنا مفاد پرست اور بے غیرت ہوگیا ہے کہ اس کی نظر میں نہ تو رشتوں کی کوئی معنویت باقی رہی ہے اور نہ صحیح غلط کی تمیز اس کے لیے مذکورہ برائیاں ایک عام سی بات بن چکی ہیں۔

مذکورہ انشائیوں سے قطع نظر اس کتاب میں شامل سبھی انشائیے جن میں امرود کا درخت، باغ دنیا کے پھول ہیں بچے، موبائل فون کی گمشدگی، تیسرا محلّہ آیا، ہاتھی اور ریٹائرمنٹ وغیرہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور انسان کے دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ یہ انشائیے دراصل مصنف کے تجربات و مشاہدات کا حسنِ مرقع ہے جس کے ذریعے انھوں نے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں سے پردہ وا کیا ہے۔ اس کے لیے ادب ایک موثر ترین وسیلہ ہے۔ یہ کتاب مواد اور معیار کے اعتبار سے ادب کے سرمائے میں اقابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں زبان کی پختگی بھی ہے اور الفاظ کی جادوگری بھی۔ تمام انشائیے مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نئے پہلو سے قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اور حقیقت کی بالکل نئی اور تازہ تصویر پیش کرتے ہیں۔ بہرحال امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

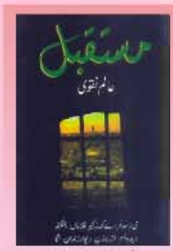

مستقبل

مصنف: عالم نقوی

صفحات: 317، قیمت: 320 روپے

ناشر: اردو میڈیا گلڈ لکھنؤ

مبصر: زاہد ندیم، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو صحافت میں عالم نقوی کا نام بہت زیادہ محتاج تعارف نہیں ہے، کیونکہ وہ روزنامہ اودھ لکھنؤ کے گروپ ایڈیٹر اور روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی کے سابق ایکزیکیٹو ایڈیٹر رہ چکے ہیں، حالیہ دنوں ان کے صحافتی مضامین کا مجموعہ 'مستقبل' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے صحافتی حلقوں میں جس کی پذیرائی ہورہی ہے۔ 'مستقبل' ان کے مضامین کا پانچواں مجموعہ ہے۔ اس میں 130 مضامین شامل ہیں جو روزنامہ اردو ٹائمس ممبئی اور اودھ نامہ لکھنؤ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ بیشتر مضامین عالمی سطح پر سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی منظرنامے کا احاطہ کرتے ہیں اس کے علاوہ مذہبی مسائل پر بھی بہت سارے مضامین قلمبند کیے گئے ہیں ساتھ

ہی اس کتاب میں موجودہ مسائل اور حالات حاضرہ کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب 317 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کا مقدمہ سید ممتاز میر نے لکھا ہے جوایک صحافی بھی ہیں اور دانشور بھی۔ساتھ ہی اسلامی ممالک پر گہری نظر رکھتے ہیں۔امام خمینی، علامہ اقبال اور جوانان ملت کے نام کتاب کا انتساب نقوی صاحب کی قوم وملت کے تئیں فکرمندی کی واضح دلیل ہے جس سے ان کا مقصد اسلام کی رہنمائی میں اخلاق کی تربیت اور ماضی کے روشن چراغوں تلے مستقبل کی تعمیر ہے۔نقوی صاحب ایک دوررس، دوراندیش صحافی ہونے کے ساتھ سیاسی بصیرت کے حامل شخص ہیں حالانکہ ان کی صحافت ایران پر مرکوز ہے اور ان کے اکثر مضامین ایران، اسرائیل اور امریکہ تک محدود ہیں لیکن دنیا میں تمام مسائل سے جڑی ان تینوں ممالک سے متعلق دیگر خبروں اور مسائل پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔اس مجموعے میں کل 127 مضامین شامل ہیں جو مختلف اوقات میں اخبارات کے لیے تحریر کیے گئے تھے۔اس میں بیشتر مضامین وہ ہیں جو ایران کی اندرونی طاقت اور اس کی سیاسی صورت حال سے متعلق ہیں۔ اس ضمن میں 'ایرانی انقلاب اور سامراجی عزائم، ''ایران، چین اور نئے عالمی نظام کی ناکامی، ''ایران کی طاقت اور اسرائیل کا بھرم' ایران کا بحران' ایران کا ایٹمی پروگرام' ایران پر حملے کا مقصد اصلی' ایران پر حملے کا فیصلہ 2003 میں ہوا تھا' ایران کے خلاف صیہونی جارحیت کا پہلا محاذ' چھوٹے قد کا بڑا لیڈر: محمود احمدی نژاد' ایران پر حملہ اور مسلم دنیا' ایران کا قیادتی بحران' ایران اور چین ہی کیوں؟' ایران ترکی اور چین' عراق امریکہ معاہدہ اور ایران' ایران یروشلم اور مسلم دنیا' ایران کی طاقت اور اسرائیل کا بھرم' وغیرہ تقریباً بیس موضوعات ایسے ہیں جو ایران کے داخلی اور خارجی معاملات کے علاوہ عالمی سطح پر جس طرح ایران کے خلاف سازشیں کی گئیں وہ جگ ظاہر ہے کیونکہ ایف اے ٹی ایف نے جس کا ہیڈکواٹر پیرس میں ہے نومبر 2010 میں ہندوستان کو ایران کے خلاف متنبہ کیا تھا۔ظاہر ہے یہ کاروائی امریکہ کے اشارے پر ہوئی تھی جس نے ایران کا ایٹمی پروگرام بند کرانے کے لیے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ذریعے اس کے خلاف پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔اس طرح کے بہت سارے حقائق کی نقاب کشائی کی گئی ہے جس سے امریکہ کی اسلامی ممالک خاص طور سے ایران کے تئیں عصبیت واضح ہوتی ہے اور عالم نقوی نے ایسے ہی موضوعات پر قلم اٹھا کر فسطائی طاقتوں کی اصلیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے۔یہ انسانی سماج اور معاشرے میں توازن برقرار رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔انتظامیہ اور مقنّنہ کے ساتھ عدلیہ میں ہونے والے فیصلوں اور خبروں کی ترسیل کے لیے اس فن کا انتخاب کیا گیا ہے۔ماضی کی تاریخ میں اس فن نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔تختِ شاہی کو پلٹنے سے لے کر تختۂ دار کو رکوانے تک کا کام بھی اس فن سے لیا گیا ہے۔معلوم نہیں نقوی صاحب کے مضامین نے کسی تخت شاہی کو متاثر کیا یا نہیں، ہاں جمہوریت اور حقوق انسانی کے نام پر چل رہے غیر انسانی کھیلوں کو نقوی صاحب نے طشت از بام کر دیا ہے اور امن وسلامتی کے قیام کے آڑ میں مسلمانوں کے خلاف اسلام دشمن طاقتوں نے جو جال بن رکھا ہے اس کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔میدان صحافت میں یہ ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ بہرحال نقوی صاحب کی یہ کتاب اسرائیل اور امریکہ کی چالبازیوں اور ان کی خفیہ سازشوں کو سمجھنے کے لیے بہت حد تک معاون ہے، ساتھ ہی صحافت میں دیانت داری کا بھی ایک واضح ثبوت بھی نظر آتا ہے کہ انھوں نے ایران کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔اس میں تو سبھی مضامین اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں لیکن کچھ مضامین ایسے ہیں جن کو پڑھ کر عالم اسلام کی ناکامیوں کے پس پشت کارفرما غیر اسلامی طاقتیں کس طرح کا جال بن رکھی ہیں ان سب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ساتھ ہی ایران، چین اور نئے عالمی نظام کی ناکامیوں کے اسباب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ افغانستان کے بعد عالم اسلام کے خلاف جنگ کی تیاری کس طرح کی جارہی ہے اور ایران کے خلاف صیہونی جارحیت کا پہلا محاذ کون ہو سکتا ہے اس کی بھی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے۔مذکورہ باتوں کے علاوہ بھی کچھ ایسی باتیں اس مجموعے میں شامل ہیں جس سے عالمی سطح پر سیاسی صورت حال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔نقوی صاحب کو ایک سے زیادہ زبانوں پر قدرت حاصل ہے، کیونکہ ان کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے موضوع سے متعلق وسیع تر معلومات کے ذخائر کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ کسی بھی موضوع پر خامہ فرسائی سے قبل اس سے متعلق جملہ معلومات حاصل کر لیتے ہیں پھر اس موضوع پر مدلل اور مفصل گفتگو کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مضامین مختلف کتابوں، رسالوں، اور اخبارات میں شائع کرا کر اس موضوع سے متعلق جملہ تاریخی مواد حوالے کے ساتھ پیش کر کے قاری کے لیے آسانیاں فراہم کر دیتے ہیں جس سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہونے کے ساتھ مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس مجموعے میں زبان و بیان بہت ہی پرکشش ہے، املے اور ٹائپنگ کی غلطیاں تلاش بسیار کے بعد بھی دکھائی نہیں دی۔امید ہے کہ صحافتی حلقوں میں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

ادبی مطالعے

مصنف: ڈاکٹر ریحان حسن

صفحات: 254، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: آئی کون پبلشرز (انڈیا)

مبصر: طلعت جمال

ڈاکٹر ریحان حسن جانا پہچانا نام ہے۔ان کے یہاں تخلیقی ادب کا نمونہ تو نہیں ملتا البتہ پختہ تنقیدی شعور ان کی تحریروں سے اجاگر ہوتا ہے۔اس سے قبل ان کی دو اہم کتابیں تحقیق و تفہیم، ممتاز مفتی حیات اور ادبی خدمات منظر عام پر آچکی ہیں۔پیش نظر کتاب 'ادبی مطالعے' ان کا تیسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو 20 معلوماتی مضامین پر مشتمل ہے۔ کچھ انتخاب کو پیش کر رہی ہوں۔ میر اور انسان دوستی، غالب اور جنگ آزادی، مراثی انیس و دبیر میں ذکر اطفال کربلا، انیسویں صدی کا مجدد سر سید احمد خاں، مولانا آزاد کی صحافت، منشی نول کشور علم وادب کا ایک ناقابل فراموش خادم، پروفیسر احتشام حسین کے دو سفری نوشتے، منٹو منفرد افسانہ نگار، قرۃ العین حیدر اور جزئیات نگاری، پروفیسر محمد حسن کے تنقیدی نظریات۔ میں نے یہاں جن مضامین کا ذکر کیا ہے۔مقصد صرف یہ ہے کہ موصوف نے جن حضرات پر خامہ فرسائی کی ہے یہ اردو ادب کی ایسی کہکشاں ہے جس کی عظمت کا اعتراف سبھو ں نے کیا ہے۔ ایسی ہمہ جہت شخصیتوں پر خامہ فرسائی سے موصوف کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔بیشتر مضامین سیمینار میں پڑھے گئے ہیں اور کچھ مشہور جرائد ورسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔مصنف نے ان تمام مضامین کے حوالے سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ان مشمولات میں کسی خاص نظریے کی تلاش نہیں کرنی چاہیے۔انھوں نے میر کی انسان دوستی کے حوالے سے ان نکات کو بیان کیا ہے کہ میر کے یہاں دیر وحرم میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ کعبہ و دیر دونوں میں خدا کا ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ جو حقیقت شناس ہے وہ خدا کو ہر جگہ تلاش کر لیتا ہے۔میر ظاہری عبادت کے قائل نہیں تھے۔اصل عبادت مخلوق کے دلوں کے درد کو سمجھنا ہی ہے۔

غالب اور جنگ آزادی کے عنوان سے ان کا یہ مضمون بھی بہت عمدہ ہے کیونکہ انھوں نے غالب کو 1850 کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی حمایت کا اعتراف کیا ہے لیکن دستنبو اور خطوط کی اہمیت وافادیت سے انکار بھی نہیں کیا ہے۔دراصل دستنبو اور خطوط

میں انقلاب کے واقعے کو اس طرح پیش کیے کہ اس عہد کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ میر انیس اور دبیر کی مرثیہ نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ میر انیس مرثیہ کو جن بلندیوں تک پہنچایا ہے یہ ان ہی کا کمال ہے۔ دبیر بھی مرثیہ نگاری میں اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کرا چکے ہیں لیکن نوحہ گری کی وجہ سے دبیر غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ مولانا آزاد کی صحافتی خدمات کے علاوہ ان کے زریں اقوال کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ سرسید بحیثیت مجدد ان کی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔مصنف نے تمام مضامین کا ناقدانہ جائزہ اس طرح لیا ہے کہ کئی نکات ابھر آتے ہیں جس سے پڑھنے والے کی دلچسپی بتدریج بڑھتی چلی جاتی ہے۔ منشی نول کشور کے تعلق سے بہت ہی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ان کی مکمل زندگی کو کھنگالنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔اس کتاب کے مشمولہ مضامین شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی کی شاعری کی ان خصوصیات سے بھی متعارف کراتے ہیں جن خصوصیات سے اکثر قارئین ناواقف ہیں۔

مجموعی طور پر پیش نظر کتاب کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ڈاکٹر ریحان حسن کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے اور ادب کے مطالعے کا ماحصل بہترین انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس دیدہ زیب کتاب کو اردو معلوماتی موضوعات کے انتخاب کے لیے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔اس کتاب میں ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جسے پڑھ کر آنے والی نسلیں اپنے علم میں اضافہ کر سکیں گی۔

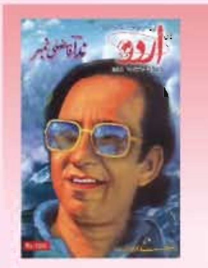

سہ ماہی **'اردو'** امراوتی، (ندا فاضلی نمبر)
مدیر: وسیم فرحت کارنجوی (علیگ)
صفحات: 300، قیمت: 150 روپے
جلد نمبر: 4، شمارہ نمبر: 1، اکتوبر تا مارچ 2014-15
رابطہ: پوسٹ باکس نمبر 5، ایچ او، امراوتی، مہاراشٹر
مبصر: خبیر احمد، جامعہ ہمدرد، دہلی

سہ ماہی 'اردو' امراوتی کے مدیر وسیم فرحت کارنجوی (علیگ) ابتدا سے چونکا دینے کے عادی رہے ہیں۔ اچھوتے موضوعات پر ان کے بے باک اور غیر مصلحت آمیز مضامین ان کی شناخت کا وسیلہ ہیں۔'اردو' کے اجرا سے ہی ایک نئے محاذ پر مدیر جنگ لڑ رہے ہیں اور بہت خوبی سے کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔'اردو' کے خصوصی شمارے 'گوشۂ ترقی پسند تحریک'، 'گوشہء زبانِ اردو' کی کامیابی کے بعد 2013 میں 400 صفحاتی ضخیم 'ساحر لدھیانوی نمبر' پیش کیا گیا تھا، جس کی گونج تا حال باقی ہے۔اردو دنیا نے ساحر نمبر کو سر آنکھوں پر رکھا، اور کالجوں یونیورسٹی والوں نے حوالہ جاتی کتاب کے طور پر کتب خانوں کی زینت بنایا۔'ساحر نمبر' کو ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ پھر ایک نئی خبر نے اردو دنیا کو چونکا دیا۔ وہ خبر تھی 'ندا فاضلی نمبر' کی۔ ندا فاضلی کی کلر پینٹ والی بہترین تصویر (جواب سے پہلے کہیں دیکھی نہیں گئی) سے سجے اس خاص نمبر کا سرورق جیسے ہی اہلِ اردو کو ای میل سے موصول ہوا، چاروں طرف پسندیدگی کا غلغلہ ہونے لگا اور اب جب مذکورہ نمبر بازار میں دستیاب ہو گیا ہے، کل اردو حلقے میں یہی موضوعِ گفتگو بنا ہوا ہے۔ 300 صفحاتی 'ندا فاضلی نمبر' میں ندا کے تمام گوشوں پر سیر حاصل مواد اکھٹا ہو گیا ہے۔

عالمی اردو ادب میں پہلی مرتبہ سہ ماہی 'اردو' امراوتی نے ندا فاضلی صاحب پر خاص نمبر کا اہتمام کیا ہے۔اس اعتبار سے 'اردو' کے مذکورہ نمبر کو اولیت کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ مدیر وسیم فرحت کارنجوی نے بڑی محنت و لگن سے خاص نمبر ترتیب دیا ہے۔'ندا فاضلی نمبر' کو مختلف اور منفرد ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔جن میں اعترافِ ندا، حیاتِ ندا، جہاتِ ندا، نغماتِ ندا، ثباتِ ندا، خراجِ تحسین، نگار خانہ ندا وغیرہ خوبصورت عنوانات شامل ہیں۔'حیاتِ ندا' کے تحت مختلف اور بڑے قلم کاروں کی یادداشتوں پر مبنی عمدہ مضامین ہیں جن سے ندا فاضلی صاحب کی زندگی اور اس کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ان میں کنہیا لال نندن، ممتاز راشد، م ناگ، حامد اقبال صدیقی، وقار قادری وغیرہ شامل ہیں۔ان کے علاوہ اسی باب میں ندا فاضلی صاحب کی ایک خاص انداز سے لکھی گئی خودنوشت 'تبرک' کا درجہ رکھتی ہے۔'حیاتِ ندا – بہ زبانِ خود' کے عنوان سے ندا فاضلی کی آپ بیتی شائع کر کے وسیم فرحت کارنجوی نے اسے دستاویزی اہمیت بخش دی ہے۔جس سے بلاشبہ خاص نمبر کی افادیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔اس کے بعد بے حد اہم باب 'جہاتِ ندا' میں اردو ادب کے مختلف زاویہ فکر رکھنے والے تقریباً سبھی بڑے قلم کار اکھٹا کر لیے گئے ہیں۔جن میں وارث علوی، پروفیسر شمیم حنفی، بشر نواز، یوسف ناظم، مختار شمیم، زبیر رضوی، پروفیسر عتیق اللہ، حمیدہ معین رضوی، علیم اللہ حالی، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، علی احمد فاطمی، احمد سہیل، خورشید سمیع، ڈاکٹر زیبا محمود اور بذاتِ خود مدیر وسیم فرحت کارنجوی کے پرمغز اور وقیع پندرہ مضامین شامل ہیں۔ندا فاضلی کثیر الجہت فنکار ہیں۔شاعری، نثر، ہر دو میدانوں کے وہ شہسوار ہیں۔مذکورہ پندرہ مضامین میں ندا کے تمام گوشوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔جن کے مطالعے کے بغیر ندا کی شاعری اور اس کی مبادیات کا مطالعہ ادھورا ہوگا۔ ان ہی پندرہ مضامین میں ایک مضمون کا عنوان ہی مزے دار نکلا، 'ندائے احتجاج' مدیر وسیم فرحت کارنجوی کے تحریر کردہ اس مضمون میں موصوف نے ندا کے ایک اچھوتے پہلو کو ہاتھ لگایا ہے۔ندا کی شاعری کے مہذب احتجاج پر مدیر نے گفتگو کی ہے۔

اس کے بعد 'نغماتِ ندا' کے تحت ندا فاضلی کی سنیما والی شاعری (نغمہ نگاری) اور مختلف غزل سنگر کے ذریعے گائی ہوئی ان کی غزلوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر کلیم ضیا نے اپنے مضمون میں 'ندا کی علمی اور فلمی شخصیت' پر بھی توجہ کی ہے۔اس کے بعد 'نگار خانۂ ندا' کے تحت ندا فاضلی کی زندگی کو تصویروں کی مدد سے مدیر نے اردو دنیا کے روبرو پیش کیا ہے۔حسنِ ترتیب کی داد ہی دیتے بنتی ہے کہ ندا کی کل حیات تصویروں کی مدد سے چلتی پھرتی دیکھی جا سکتی ہے۔خوبصورت اور دبیز آرٹ پیپر پر مزین رنگین تصویروں نے خاص نمبر کی چمک بڑھا دی ہے۔'خراجِ تحسین' باب میں ندا فاضلی کی زمین پر معاصر شعرا نے غزلیں کہی ہیں۔شعرا میں نذیر فتح پوری، ممتاز منور پیر بھائی، شمیم فرحت وغیرہ شامل ہیں۔ 'ثباتِ ندا' کے تحت ندا کی شاعری، نثر اور تراجم کا 113 صفحاتی انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ جو ندا کے چاہنے والوں کے لیے کسی غیر متوقع تحفے سے کم نہیں۔انتخابِ شاعری میں ندا کی منظومات، غزلیات اور دوہوں کا قابلِ مطالعہ انتخاب شامل کیا گیا ہے۔انتخابِ نثر میں ندا کے تحریر کردہ دلچسپ مضامین دیکھے جا سکتے ہیں جن میں نوح ناروی، جاں نثار اختر، نریش کمار شاد، صابر دت، عصمت آپا، کالرج، منٹو، خمار بارہ بنکوی، کرشن ادیب وغیرہ شعرا و ادبا پر ندا کے خاصے دلچسپ، منفرد اور مزے دار مضامین سے قاری لطف اندوز ہوں گے۔تراجم کے تحت عالمی شاعری اور پولش شاعری پر ندا کے تراجم شائع کیے گئے ہیں۔ کل ملا کر سہ ماہی 'اردو' امراوتی کا 'ندا فاضلی نمبر' کسی شاعر و ادیب کے قد کا تعین اور تفہیم کرنے میں صد فی صد کامیاب ہے۔ وسیم فرحت کارنجوی 'ساحر لدھیانوی نمبر' کے ذریعے اپنی انفرادیت کا ثبوت دے چکے ہیں، اب 'ندا فاضلی نمبر' سے بھی ان کے مجلّے کا تنوع اور امتیاز صاف ظاہر ہے۔آئندہ نسل کے محقق، نقاد اور پی ایچ ڈی اسکالر کے لیے 'اردو' نے خوب سے خوب تر سامان پہنچا دیا ہے۔

سرورق پر ندا صاحب کی خوبصورت تصویر اور جاذب نظر سرورق بہر صورت مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔عمدہ کاغذ، بہترین جلد سازی، کثیر رنگی سرورق جیسی صفات کا حامل 300 صفحاتی ضخیم 'ندا فاضلی نمبر' کی قیمت اس گرانی کے دور میں بھی کتب فروشوں کے لیے محض 100 روپے رکھی گئی ہے جو کسی اعتبار سے مہنگی ثابت نہیں ہو سکتی۔

تعارفی تبصرے

خلیق الزماں نصرت

اِضراب

شاعر: سوز نجیب آبادی، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2014

نجیب آباد کے سوز اپنی 40 سال کی زندگی کے بعد آندھرا پردیس میں جا کر بس گئے۔ ابتدا سے چھپنے چھپانے کا شوق رہا ہے۔ اس شوق کی تکمیل ابھی تک نہیں ہو پائی ہے۔ شاعر کی یہی تو پہچان ہے۔ وہ میدان چھوڑنا نہیں چاہتا۔ شعر کہنے کا عمل تو آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ سوز صاحب کی شاعری میں آج کے انسان کے رویے کی باتیں ہیں۔ لوگوں کے ہونٹوں پہ ہنسی اور دل رو رہا ہے بے غرض کوئی کس کو قریب نہیں رکھتا ہے اور انسان در در بھٹک رہا ہے۔ اسے کہیں اماں نہیں ملتی ہے، یہ دنیا شہہ زوروں کے لیے جنت اور کمزوروں کے لیے دوزخ ہے وہی باتیں جو آج کے شاعروں کی شاعری میں ہوتی ہیں۔ سوز کے یہاں یہ رنگ دیکھنے کو ملے ہیں۔ آپ اس کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں اچھی نظمیں بھی ہیں۔

بساط سخن

شاعر: عبدالمتین جامی، صفحات: 128، قیمت: 125 روپے، سنہ اشاعت: 2014

جامی صاحب کو اردو کے قاری اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ کتاب رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ شاعری کی اس مشکل صنف میں بہت کم شاعر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یہ ذرا مشکل بھی ہے۔ مگر جامی صاحب ہر فن مولا ہیں۔ رباعی کے تمام 24 / چوبیس اوزان پر شعر کہنا واقعی قابلِ ذکر ہے۔ جس کے لیے ملک کے مشہور معروف ناقد و شاعروں کے حوصلہ افزائی کے جملوں نے انھیں سراہا ہے۔ جامی صاحب پرانے شہسوار ہیں۔ انھوں نے بات سے بات پیدا کی ہے۔ دنیا کتنی ہی خراب ہوگئی ہو آج بھی حق بات بولی جارہی ہے اور یہ سفر جاری رہے گا۔ جامی صاحب مایوسی کے سفر میں روشنی دیکھتے ہیں۔ یہ خوبی ہر شاعر میں ہونی چاہیے۔

کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ پھر رباعیاں بھی اچھی ہیں۔ 806SM کے کاغذ پر شعری مجموعہ چھپوانا واقعی دل گردے کا کام ہے۔ غالباً انھیں کسی ادارے نے مدد بھی نہیں کی ہے۔

بکھرے موتی

شاعر: شاد عباسی، صفحات: 231، قیمت: 100 روپے

شاد صاحب کا نام ابوالقاسم ہے۔ ان کے والد کا نام محمد عباس اس تعلق سے آپ عباسی لکھتے ہیں۔ شاد عباسی صاحب شاعر، مضمون نگار اور محقق بھی ہیں اس سے قبل ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے یہ مجموعہ انھوں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر شائع کیا ہے۔ انھیں اتر پردیس حکومت کی جانب سے مالی امداد بھی ملی ہے۔ پھر وہ دیر کیوں کرتے۔ شاد صاحب کے اشعار میں بزرگی جھلکتی بھی ہے اور وہ ہیں بھی بزرگ شاد اپنے اشعار سے تیر چلانا خوب جانتے ہیں۔ نئے موضوع پر یہ شعر:

حفاظت آپ کیجیے خود اپنے جان و مال کی
لکھا ہے آپ کے نگر میں بس یہی جگہ جگہ

یہی جگہ جگہ پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ خیر شاعری میں دو دونی چار نہیں ہوتا ہے۔ یہ دل کا معاملہ ہے اس کتاب میں کئی بکھرے ہوئے موتیوں کے علاوہ ایک موتی فارسی کا ہے۔

ایک استقبالیہ نظم ہے آپ اس نظم سے ان کی فارسی دانی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آج کے مجموعوں میں یہ اب شامل نہیں کی جاتی ہے۔ کئی اشعار ہم جیسوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اس لیے بھی یہ شعری مجموعہ پڑھا جا سکتا ہے۔ کتاب کی قیمت بھی بہت کم ہے۔

رفاقت کی خوشبو

شاعر: مقصود احمد مقصود، صفحات: 203، قیمت: 180

مقصود صاحب بڑودہ گجرات میں یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ جہاں وہ عربی، فارسی اور اردو پڑھاتے ہیں شکیل کے ایک شعر نے انھیں شاعر بنا دیا یہ اعتراف انوکھا ہے۔ انھیں اپنے بزرگ شعرا سے عقیدت ہے حرف آغاز میں کئی باتوں کا ذکر ہے۔ جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ شاعر میں تصوف کا رُجحان حاوی ہے۔ کچھ عارفانہ اشعار بھی الگ سے شامل ہیں۔ نظمیں بھی ہیں غزل میں بھی جگہ جگہ ایسے اشعار پڑھنے کو ملے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ لیکن ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ مقصود کی شاعری میں اقدار کے شکست و ریخت کی داستان بھی ہے۔ پھر بھی صبر و تحمل سے جینے کی ترغیب بھی ہے۔

سانس لیتا شہر

شاعر: مہدی پرتاپ گڑھی، صفحات: 208، قیمت: 300 روپے

پرتاب گڑھ کے موجودہ دور کے شاعروں کا ذکر جب آتا ہے۔ تو فوراً دماغ میں دو نام آ جاتے ہیں۔ نازش پرتاب گڑھی اور مہدی صاحب، فضا ابن فیضی کی طرح رسالوں میں خوب چھپتے ہیں کون سا ایسا رسالہ ہے جس میں ہم اُن کی غزلیں نہیں پڑھتے ہیں:

زندگی تاکہ پر سکوں میں گزرے
دل میں ہر آرزو سُلادی ہے

مہدی صاحب نئی غزل کی نمائندگی کرتے ہیں اسی دشت کے وہ سیاح ہیں اور وہ جہاں رہتے ہیں اس کے مسائل ہی بیان کرتے ہیں۔ کسی آسمانی سلطانی باتوں کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔ شاہ جہاں اور ممتاز کی محبت کا افسانہ پرانا ہوگیا ہے۔ ہم جس حال میں رہتے ہیں اس کی محبت میں اُنھوں نے کیا کیا دُکھ جھیلے ہیں انھوں نے وہ رقم کیے ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب بھی خوبصورت ہے اور اس کے اندر کا مواد بھی کافی جاندار ہے۔ جس پر خوب لکھا جانا چاہیے مضمون نگار حضرات تو اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔

حرف ریزہ ریزہ

شاعر: محمود شاہد، صفحات: 112، قیمت: 150

محمود شاہد صاحب، خاندانی شاعر ہیں۔ باپ، نانا، بھائی سبھی شاعر ہیں۔ ظاہر ہے۔ ایسی حالت میں شاعر ہونا بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ ضرور ان کی حوصلہ افزائی ہوئی ہوگی۔ شعر کہنے پر انھیں مار نہیں پڑی ہوگی۔ ورنہ اکثر گھروں کے لوگ اپنی اولاد شاعر کو ڈانٹتے پھٹکارتے ہیں۔ اشعار اچھے ہیں۔ اگر اسی طرح مشق کرتے رہے تو چند اچھی غزلیں ہاتھ آ جائیں گی۔ شاعری چکی چلانے جیسی مشقت چاہتی ہے۔ یہ بات تو آپ نے اپنے گارجین سے ضرور سنی ہوگی۔

کتاب اچھی چھپی ہے۔ پروف پر دھیان دیا گیا ہے۔ کتاب پر جب اردو اکادمی آندھرا پردیش سے مالی امداد ملی ہے۔ تو اور زیادہ خرچ کرنا چاہیے تھا۔

کلیاتِ شبنم گورکھپوری

شاعر: شبنم گورکھپوری، صفحات: 452، قیمت: 476

شبنم گورکھپوری اردو شاعری کے جانے پہچانے شاعروں میں تھے۔ انھوں نے اپنے استاد مشہور محقق مجنوں گورکھپوری کے خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ گورکھپور میں کئی علم وادب کے رہبر پیدا ہوئے۔

آج کل کلیات کی اشاعت چونکا دینے والا کام ہے۔ یوں بھی کلیات ایک فیصد بھی شاعروں کا شائع نہیں ہوتا ہے۔ اتنا نفیس پیپر ہے کہ قومی اردو کانسل کی کتاب لگتی ہے۔ اور وہ شاعر بہت خوش نصیب ہے جن کے شاگردوں میں ڈاکٹر شہر احمد اور اشفاق احمد صاحبان جیسے شاگرد ہوں۔ شبنم، جگر جیسے شاعر تھے ان کے اشعار عوام میں بے حد مقبول ہوتے تھے:

دم بھر کو جو گلشن میں وہ جانِ بہار آئے
کلیوں پہ شباب آئے پھولوں پہ نکھار آئے

ان کی نظمیں بھی جاندار ہیں شبنم نے نظم کی شاعری کے زمانے میں اس طرح کی غزلیں کہہ کر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ یہ کتاب لائبریری اسکولوں اور کالجوں میں محفوظ رکھی جائے تو بہتر ہوگا۔

مشکِ غزالاں

شاعر: تابش مہدی، صفحات: 176، قیمت: 200

تابش کا تعارف ضروری نہیں ہے۔ اُن کے نو/9 شعری مجموعے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ غزل نامہ شائع ہوا تھا۔ اس کی تمام غزلوں کی ردیف ایک ہے۔ قوافی الگ الگ ہیں۔ ان کی زود گوئی کا کمال ہے۔ ان کے شب و روز کی کہانیاں ان کی غزلوں میں ہیں انھوں نے ماضی کی غزلوں سے رشتہ قائم کر رکھا ہے۔ کسی بھی ازم یا گروپ سے ان کا تعلق نہیں ہے:

نہاتے کیوں ہو خوں کی ندّیوں میں
سمندر میں ابھی پانی بہت ہے

تابش چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا مفہوم دے دیتے ہیں۔ ایک ہی مضمون کو کئی انداز سے پیش کرتے ہیں مگر قاری بھی اُسے پسند کرتے ہیں۔ ان کی زبان کا رکھ رکھاؤ بھی قابل قدر ہے۔ جس سے شعر کی خوبی نکھر جاتی ہے۔ فنی لوازمات کو برتنے میں چوک نہیں ہوتی ہے۔ ان کی نظر میں ان چیزوں کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ وہ اردو کی شعری روایات کے پاسدار ہیں۔

صحیفۂ حیات

شاعر: اشرف علی اشرف، صفحات: 168، قیمت: 150 روپے

اشرف علی اشرف کا یہ شعری مجموعہ ہے۔ جو ان کی تیس/30 سالہ شعری کاوش کا ثمرہ ہے۔ ان کے شعری ذوق کی داد دینی پڑے گی کہ Dialysis پر رہنے کے بعد بھی اُنھوں نے اپنی کتاب چھپوائی ہے۔ کتاب کے پچاس صفحات تک لوگوں کی رائے شامل ہے۔ یہ مضامین ان کی شاعری اور ان کے بارے میں جاننے کے لیے کافی ہیں۔ اشرف کے شعر میں بھی ان کے حالات ہیں۔ ہندو مسلم تعلقات پر سبھی شعر کہتے ہیں اشرف کا شعر دیکھیے:

یہ پہلے بھارتی ہیں اور با ہم بھائی بھائی ہیں
اُنھیں ہندو مسلماں آپ کہیے ہم نہیں کہتے

اُن کی شاعری سے سماج کا سروکار ہے۔ اس میں قدیم اقدار کو بحال کرنے کی سفارش ہے۔

ابرنیساں

شاعر: ارشد مینانگری، صفحات: 403، قیمت: 500 روپے

ارشد مینانگری مہاراشٹر کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے وطن مینانگر کی نمائندگی کی ہے۔ ان سے قبل نسیم مینانگری نے بھی خوب نام پیدا کیا تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔ موجودہ کتاب کافی ضخیم ہے۔ کئی رسالوں نے ان کے گوشے شائع کیے ہیں۔ ناقدوں نے ان پر کتابیں لکھی ہیں۔ اپنی زندگی میں ہی ارشد نے اپنی شاعری کی بدولت شہرت حاصل کر لی ہے۔ انھوں نے اس میدان کے لیے پوری جدو جہد کی ہے۔ اب وقت ہی بتائے گا کہ انھیں کس درجے میں رکھا جائے مگر ان کے ملّی جذبے اور حُب الوطنی کے اظہار نے ہر کسی کا دل موہ لیا ہے۔ انھوں نے جہاں حالات کی قہرمانیوں سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ وہاں اُمید سے ناطہ بھی جوڑ رکھا ہے۔

دشت عجب حیرانی کا

شاعر: عین تابش، صفحات: 172، قیمت: 200 روپے

عین تابش علم و ادب کے پرانے لوگوں میں ہیں۔ اس سے قبل بھی ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو والوں میں وہ اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ معریٰ اور آزاد نظمیں بھی کہتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں موضوعاتی تنوع اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ عین تابش جو دیکھتے ہیں۔ وہی نہیں لکھتے کیونکہ اُن کی شاعری فوٹو گرافی نہیں ہے۔ ان حالات سے ان پر کیا اثر ہونا چاہیے اسے وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اُنھیں ہوش کی آنکھوں سے دیکھنے کی عادت ہے:

کام جو کپڑوں میں آیا صرف اُجلا تھان تھا
صاحب عالم اسی اک تھان میں لپٹے ہیں بند

اُن کے کلام میں دور جدید کی بڑھتی ہوئی مادی مکروہات کا ذکر فنی چابکدستی کے ساتھ ہے جو قابل ذکر بھی ہے۔ عین تابش نے اپنے انتخاب میں بڑی سختی برتی ہے۔ اس ہوش مندی سے اُنھیں شاعری کے میدان میں فائدہ ضرور ہوگا۔

کاغذ کی زمین

شاعر: سریندر چترویدی، صفحات: 120، قیمت: -150 روپے

سریندر چترویدی اردو اور ہندی دونوں میں شعر چھپواتے ہیں۔ اب تک تقریباً سولہ کتابیں شائع کروا چکے ہیں۔ انھیں اس کا صلہ بھی مل رہا ہے۔ اردو والوں میں تو ان کی حثییت مہمان جیسی ہے۔ کیونکہ غیر مسلموں نے اردو کو مسلمان کی زُبان قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ اردو ان کے ہی آبا و اجدا کی زُبان تھی۔

سریندر چترویدی صاحب اردو کی تاریخ جانتے ہیں اور انھیں فخر ہے کہ وہ اردو کی شاعری کرتے ہیں۔ وہ ہندی اور اردو کو دو بہنوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں تو آج ہندوستان میں جو زبان بولی جارہی ہے۔ وہ اردو ہی ہے۔ یہ مہذب لوگوں میں بولی جارہی ہے۔

آنسوؤں کی بارات

شاعر: عبرت مچھلی شہری، صفحات: 140، قیمت: 140 روپے

عبرت مچھلی شہری کی غزلوں کا مجموعہ میرے مطالعے کی میز پر ہے۔ کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ کاغذ بھی بہتر ہے میرے خیال میں ان کے پاس غزلیں بہت ہوں گی۔ انتخاب کر لینا ان کے لیے بہتر تھا۔ شاعر کو مشہور ہونے کے لیے دیوان پر دیوان

لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو ایک شعر ہی اس کو مشہور کر دیتا ہے۔ مگر اس کا فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے دیوان پر دیوان لکھے جا رہے ہیں۔ ایک شعر:

ہم لوگ تو سچائی کاغذ پہ نہیں لکھتے　　　　کچھ لوگوں نے نیزے پر تاریخ لکھی کیسے

کتاب کے نام میں بارات ہے میرے خیال میں برات ہوتا تو اچھا ہوتا ہے۔ کلام اچھا ہے۔ عوام میں مقبول ہوگا۔

غزل کے دیار میں

شاعر: جمیل مجاہد، صفحات: 168

جمیل صاحب ممبئی کے استاد شاعر ہے۔ جہاں یہ بات مشہور ہے کہ جس نے گویوں کے لیے غزلیں لکھیں وہ شعر و ادب کی دنیا سے دور ہو گیا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ جمیل صاحب کی شاعری اس بات کو غلط ثابت کرتی ہے۔ انھوں نے ممبئی میں اپنا ایک گروپ بنا رکھا ہے۔ ہاں انھیں اس وقت غصہ آتا ہے۔ جب ان کے زیرِ نگرانی شعر کہنے والوں کو ان سے زیادہ بڑے عہدوں سے نوازا جاتا ہے یا پھر غیر مستند حضرات سند دینے لگتے ہیں۔ ادب گاہ ممبئی میں ہندوستان کے کونے کونے سے شعرا کا CREAM آکر بسا اور ان حضرات نے بھی نئی غزل کو نیا اسلوب دیا۔ ان کے شعرا کے یہاں زبان و بیان کی بڑی تازگی ملتی ہے۔ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ جمیل صاحب بھی انھیں فنکاروں میں ہیں۔

منو رنجن

شاعر: امان الحق بالا پوری، صفحات: 87، قیمت: 50 روپے

امان الحق صاحب درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔ اس لیے بچّوں کی نفسیات سے خوب واقف ہیں۔ ان کی پسند ناپسند کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بات خاص طور سے نمایاں ہے۔ چھوٹی موٹی کہانیوں کو منظوم کیا گیا ہے۔ جو عموماً اس طرح کے مجموعے میں ہوتا ہے۔ نئے حالات سے روشناس کرانے کے نئے موضوعات پر بھی ان کی نظمیں ہیں۔ جیسے اے ٹی ایم، انٹرنیٹ وغیرہ یہ کتاب اردو کونسل کی مدد سے شائع ہوئی ہے۔ کاغذ بہت اچھا اور قیمت اس کی کم ہے۔

صحرا کے پھول

شاعر: معین الدین شمسی، صفحات: 108، قیمت: 80 روپے

شمس گریڈیہہ کے نو جوان شاعروں میں ہیں۔ اس مجموعے میں ان کی نعت، حمد، نظم اور غزلیں شامل ہیں۔ اردو قاری کم ہوتے جا رہے ہیں اور شعری مجموعوں کے شائع کروانے کا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے شعرا مایوس نہیں ہیں۔

شمس کی یہ منزل نہیں ہے۔ انھیں شعر کہتے رہنا چاہیے اور رسالوں میں بھی شائع کروانا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ کسی شاعر کے تمام اشعار قابلِ مطالعہ ہوا کرتے ہیں۔ پھر جہاں شعر کی پسندیدگی کا سوال ہے۔ سب کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔ شمس ابھی کچھ اور مشق کریں گے تب جا کر نکھار پیدا ہوگا اچھی بات یہ ہے کہ چھوٹی بحروں میں اشعار اچھے ہیں۔

پیمانِ قلم

شاعر: مختار عاشقی جونپوری، صفحات: 232، قیمت: 250

مختار عاشقی جونپوری، جون پور سے ہجرت کر کے احمد آباد گئے اور کسی مل میں ملازمت کی۔ کپڑے کی ملوں میں مزدوری کرنا کافی محنت کا کام ہے۔ پھر شعری میدان میں اُچھل کود کرنا بڑے دل والوں کا کام ہے۔ کافی دنوں سے شعر کہتے ہیں۔ انھیں اب نعت سے زیادہ محبت ہے۔ غزل میں بھی حمد اور نعت کی جھلک ہے۔ ویسے غزلیں بھی کافی کہی ہیں۔ یہ مطالعے کے لائق ہیں۔ مختار صاحب پیچیدہ باتوں کو عام بول چال کی زبان دے دیتے ہیں:

رہ طلب میں جو حق بات کر گئے ہوتے　　　　دیارِ دار سے تم بھی گزر گئے ہوتے

طویل بحروں میں بھی شعر کہے ہیں۔ وہاں بھی زبان و بیان نیز شاعری کے رموز سے واقف دکھائی دیتے ہیں۔

پاسنگ

شاعر: کیفی سنبھلی، صفحات: 112، قیمت: 200 روپے

کیفی سنبھلی رسالوں میں بھی چھپتے رہتے ہیں۔ اس لیے بھی کافی لوگ ان کو جانتے ہیں۔ اس سے قبل بھی کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ یہ مجموعہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ یوں تو کہنے کو سب شعر کہتے ہیں۔ مگر کیفی دردمند دل رکھتے ہیں۔ شعر میں صبر کا عنصر زیادہ ہے:

اتنا بھی تشنگی کا سلیقہ نہ دے مجھے　　　　دریا کسی محاذ پہ دھوکہ نہ دے مجھے

اپنی حیثیت کے مطابق خواہش پیدا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ پریشانی بڑھے گی۔ شاعر عقل والا ہوتا ہے اسے عقل کی بات ہی کرنی چاہیے۔ کیفی نے شعروں کے انتخاب میں احتیاط برتی ہے۔ لوگ ان کی حوصلہ افزائی کریں گے یہ مجھے امید ہے۔

تتلی رانی

شاعر: محبوب حسن ہمدم، صفحات: 204، قیمت: 120

محبوب حسن ہمدم ایم فل اور ایم اے کرنے کے بعد غالباً جواہر لال یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ فکشن کی تنقید پر ان کی کتابیں ہیں۔ بچّوں کی شاعری پر ان کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ زبان بڑی سلیس ہے۔ زیادہ بچّوں میں مشہور ہونے کے لیے انھوں نے ہندی اردو دونوں رسم الخط میں اس کتاب کو شائع کیا ہے۔ اس سے دونوں زبان کے جاننے والے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں زبانیں ایک ہی ہیں۔ لوگوں نے دونوں زبان کو ایک ہی کر دیا ہے۔ صرف رسم الخط کا فرق رہ گیا۔ پرانے موضوعات پر نئے انداز سے لکھی گئی نظمیں کافی دلچسپ ہیں۔ ان نظموں میں پیار محبت کا درس ہے۔ جگہ جگہ اخلاقی قدروں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ سائنسی عنوانات پر بھی نظمیں ہیں یہ ایک اچھی چیز ہے۔ ادب اطفال میں عنوانات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

سیاہی جاگتی ہے

شاعر: احسن شفیق، صفحات: 242، قیمت: 140 روپے

احسن شفیق کلکتہ کے جانے مانے شاعر ہیں۔ سیاہی جاگتی ہے ان کی آزاد اور پابند نظموں کا مجموعہ ہے۔ اشعار سے ان کے جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ چند رباعیاں بھی شامل ہیں۔ جن سے ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج کے دیکھتے ہوئے موضوعات کو اپنی نظم میں شامل کیا ہے۔ کچھ اس قدر نئے ہیں کہ ابھی تک اس عنوان پر کسی کی نظر نہیں گئی ہے۔ ان کا یہ شعر:

آدمی ہندو، مسلماں، سکھ، عیسائی کچھ نہیں　　　　آدمی بس آدمی ہے پیکر حب و جمال

اس بھائی چارگی کی تبلیغ احسن شفیق نے جگہ جگہ پر کی ہے۔ ان کا شعر غیر محسوس طور پر آدمی کی نگاہوں سے ذہن کے پردے پر منتقل ہونے میں دیر نہیں کرتا ہے۔ نظمیں شاعری کے مطالعے کے لیے اس شعری مجموعے کا مطالعہ معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے۔

■

عالمی اردونامہ

قطر میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا یومِ تاسیس

قطر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے سابق طالب علم نجم الحسن خان نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی المنائی قطر قائم کی

اور گذشتہ سال ایک چھوٹا سا پروگرام کیا۔ اس بار ہندوستان کی عبقری شخصیات کو مدعو کیا گیا۔ انڈیا سے جسٹس (ر) ایم ایس اے صدیقی، چیئرمین قومی کمیشن برائے مائنارٹی ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ جناب سید شاہد مہدی (ای اے ایس)، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی اور ڈاکٹر طلعت احمد موجودہ وائس چانسلر کے علاوہ قطر کے بھی بڑے نام شامل تھے۔

سید شاہد مہدی اس شاندار تقریب کے صدر نشین اور قطر کی مشہور اور معروف سماجی اور کاروباری شخصیت جناب حسن چوگلے صاحب مہمانِ خصوصی جبکہ سید عارف مہدی قطر کی کئی کمپنیوں کے سی او ہیں مہمانِ اعزازی کی کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ تقریب کی نظامت کی ذمے داری کا اعزاز قطر کے بین الاقوامی شاعر عزیز نبیل کے حصہ میں آیا جسے انھوں نے نہایت خوبصورتی سے نبھایا۔ بچوں نے صدر اور مہمانان کو پھولوں کے گلدستے پیش کیے۔ مہمانِ اعزازی سید عارف مہدی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اپنی موجودگی کو خوش قسمتی سے تعبیر کیا۔ مہمان خصوصی جناب حسن چوگلے صاحب قطر کی کئی انڈین تنظیموں کے سرپرست اعلیٰ ہونے کے علاوہ انڈیا کی بھی کئی تنظیموں کی مالی اور اخلاقی مدد کرتے ہیں۔ عزیز نبیل نے صدر محفل سید شاہد مہدی صاحب کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ مہمان خصوصی، مہمان اعزازی کے علاوہ کمیونٹی کے فعال رکن اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی المنائی کے بانی جناب حبیب النبی کو ان کی سماجی خدمات کے اعتراف کے طور پر، عزیز نبیل کو شاعری اور ادب میں نمایاں مقام حاصل کرنے پر، شکیل کاکوی کو تعلیمی میدان میں خدمات پر، نجم الحسن خان کو ان کی سماجی خدمات جبکہ شاداب خان کو ٹی وی اور فلم کے شعبے میں خدمات کے اعتراف کے طور پر یادگاری شیلڈز پیش کی گئیں۔ المنائی کے بانی نجم الحسن خان نے آخر میں اظہار تشکّر کے ساتھ پروگرام کی کامیابی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور تمام مہمانوں کا دلی شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: محمد طاہر جمیل، دوحہ قطر، 27 فروری 2015

بشیر مالیرکوٹلوی کے اعزاز میں نشست

گذشتہ دنوں بھارت کے معروف افسانہ نگار محمد بشیر مالیرکوٹلوی نجی دورے پر کراچی تشریف لائے تو فکشن گروپ نے ان کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا جس کی صدارت مشہور افسانہ نگار اے خیام نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض صبا اکرام نے ادا کیے۔ چونکہ فکشن گروپ کے بانی ممبر پروفیسر علی حیدر ملک کا انتقال ابھی حال میں ہوا ہے لہٰذا نشست کی کارروائی مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے ابن عظیم فاطمی کی فاتحہ خوانی سے ہوئی۔ صبا اکرام کے افتتاحی کلمات کے بعد بشیر مالیرکوٹلوی نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کا تعلق مشرقی پنجاب کے علاقے مالیرکوٹلہ سے ہے، وہ حال ہی میں پنجاب وقف بورڈ کے اسسٹنٹ آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں ان کے اب تک پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ایک مجموعہ ٹیلی ڈراموں کا زیر طباعت ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ان کے افسانوں کی کتابوں 'سلگتے لمحے' اور 'چنگاریاں' کو ہریانہ اردو اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ افسانچے بھی لکھے ہیں۔ بشیر مالیرکوٹلوی اور ان کے چند دوستوں نے 'افسانہ 2' کے نام سے ایک تجربہ شروع کیا ہے جن کے تحت ماضی کے افسانوی شہ پاروں کی 'ریمیک' یا توسیع کی کوشش کی جاتی ہے۔ یعنی جہاں افسانہ ختم ہوا ہے وہاں سے اسے مزید آگے بڑھایا جاتا ہے اور اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ افسانے کی فضا بندی کو برقرار رکھا جائے اور زیریں لہر کے طور پر جو کہانی افسانے میں چل رہی تھی، اس کا تسلسل بھی نہ ٹوٹے۔ مہمان نے کہا کہ وہ منٹو کو اپنا آ:یڈیل مانتے ہیں اور انھیں خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ان کے افسانہ 'ٹھنڈا گوشت' کو توسیعی صورت میں 'ٹھنڈا گوشت 2' کے نام سے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے وہ افسانہ پڑھ کر بھی سنایا۔

روزنامہ 'نوائے وقت' 9 فروری 2015

دبئی جشن جمہوریہ مشاعرہ کی ڈی وی ڈی کے اجرا کا منظر

محمد شہزاد اسلم راجہ کی کتاب 'آوارگی' کا اجرا

دبئی جشن جمہوریہ مشاعرہ کی ڈی وی ڈی کا اجرا

دبئی: متحدہ عرب امارات میں ہندوستان کے سفیر ٹی پی سیتارام نے ہندوستانی سفارت خانے میں منعقد ایک پروگرام میں جشن جمہوریہ مشاعرہ و کوی سمیلن 2015 کی ڈی وی ڈی کا اجرا کیا۔ متحدہ عرب امارات میں سالانہ مشاعرہ کا اہتمام کرنے والے چیف آرگنائزر سید صلاح الدین اور کمیٹی کے دیگر ممبران یعقوب ایم تصور، محمد اکرم خان، حنیف کھتری اور شبیر رو کاڈیہ اس موقعے پر موجود تھے۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے ہندوستانی سفیر نے سید صلاح الدین کے ذریعے مسلسل 13 سال سے کامیاب طریقہ سے جشن جمہوریہ کے مشاعرہ و کوی سمیلن کے انعقاد کی کوششوں کو سراہا۔ سید صلاح الدین نے بھی دبئی شاپنگ فیسٹیول کے آرگنائزرس کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 فروری 2015

محمد شہزاد اسلم راجہ کے 'آوارگی' کا اجرا

لاہور، پاکستان: گزشتہ روز پنجاب انسٹی ٹیوٹ لینگویج آرٹ اینڈ کلچر قذافی اسٹیڈیم لاہور کے پنجاب کیفے ٹیریا میں معروف کالم نویس محمد شہزاد اسلم راجہ کے پہلے مجموعہ کالم 'آوارگی' کی رونمائی کے حوالے سے ایک یادگار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ نامور شاعر و ادیب جناب زاہد شمسی کے زیرِ صدارت اس تقریب میں جناب شہزاد عاطر (سخنور انٹرنیشنل)، محترمہ یاسمین بخاری، جناب وسیم عباس اور حبیب اعجاز عاشر نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ندیم اظہر ساگر (ریذیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ سلطنت لاہور) نے انجام دیے، استقبالیہ کلمات بھی ندیم اظہر ساگر کے حصے میں آئی۔ شہزاد اسلم راجہ نے صدرِ محفل جناب زاہد شمسی کے ہمراہ کتاب کی باقاعدہ رونمائی عمل میں لائی۔ اس موقعے پر سید اسلم جاوید ہاشمی نے کہا کہ اسلم راجہ ہمارے لیے کسی اثاثے سے کم نہیں۔ فوزیہ چغتائی، جناب محمد عباس شاہ، جناب حسیب اعجاز عاشر، وسیم عباس اور محترمہ یاسمین بخاری نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ صاحبِ محفل محمد شہزاد اسلم راجہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے صدرِ محفل، مہمانانِ خصوصی اور تمام شرکا کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا جنکی شرکت، اور اظہارِ چاہت نے تقریب کو یادگار بنا دیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں صدرِ محفل جناب زاہد شمسی نے محمد شہزاد اسلم راجہ کو اُن کے پہلے مجموعہ کالم 'آوارگی' کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی اور خوبصورت تقریب کے انعقاد پر انتظامیہ کی خدمات کو بھی سراہا۔

پریس ریلیز: حبیب اعجاز عاشر، لاہور، 26 فروری 2015

انڈیا اردو سوسائٹی قطر کے ماہانہ مشاعرہ کا منظر

انڈیا اردو سوسائٹی قطر کا ماہانہ مشاعرہ

'انڈیا اردو سوسائٹی' قطر کی ایک قدیم اور نمائندہ ادبی تنظیم ہے جو یہاں مقیم اردو ادب دوستوں کی شیرازہ بندی کا ایک معتبر عنوان ہے۔ انڈیا اردو سوسائٹی، نے نئے سال سے اپنی ماہانہ شعری نشستوں کی تجدید کی ہے، جناب شوکت علی درد اور جناب شمس الغنی کی قطر آمد کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوسائٹی نے (23 جنوری 2015 بروز جمعہ بوقت 8 بجے شب) صدر سوسائٹی جناب جلیل نظامی کے دولت کدے پر سالِ رواں کی پہلی شعری نشست کا انعقاد کیا۔ نشست کے ناظم، اور 'انڈیا اردو سوسائٹی' کے نائب صدر جناب عتیق انظر نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، ان کی درخواست پر 'گزرگاہ خیال' کے بانی صدر اور قطر کی قدیم ترین اردو ادبی تنظیم بزم اردو قطر کے چیئرمین ڈاکٹر فیصل حنیف نے مسند صدارت کو رونق بخشی، مہمانِ خصوصی اور مہمان اعزازی کی نشستوں پر علی الترتیب جناب شوکت علی درد اور جناب شمس الغنی صاحبان جلوہ افروز ہوئے۔ اس نشست کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ سوسائٹی نے اس نشست سے مختلف ادب کے تقابلی مطالعے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا مقالہ ڈاکٹر ابوسعد ندوی نے پیش کیا۔ اس کے بعد ناظم مشاعرہ کی درخواست پر مہمان اعزازی اور مہمان خصوصی نے اس مشاعرے کے حوالے سے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا، میزبانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مہمانوں کے تاثرات کے بعد صدر مشاعرہ ڈاکٹر فیصل حنیف نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں سب سے پہلے 'انڈیا اردو سوسائٹی' کو اس کامیاب مشاعرے کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز: افتخار راغب، 9 فروری 2015

اردو انسٹی ٹیوٹ کی ماہانہ نشست

شکاگو: 22 فروری 2015 کو شامبرگ لائبریری میں اردو انسٹی ٹیوٹ کی ماہانہ نشست کا انعقاد ہوا۔ ڈاکٹر کلیم احمد عاجز مرحوم کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کو خراج تحسین پیش کیا گیا اور یوٹیوب پر ان کے مشاعروں کی جھلکیاں پیش کی گئیں۔ پروگرام 'آپ کی نگارشات وتخلیقات' میں بھی ان کو خراج تحسین کا سلسلہ جاری رہا۔ پروگرام کی پہلی نشست میں سید شہاب الدین نے نعتیہ کلام سے 'آپ کی نگارشات وتخلیقات' کی ابتدا کی۔ انھوں نے کلیم عاجز مرحوم کی زمین میں ایک غزل بھی پیش کی۔ ڈاکٹر افضل الرحمٰن افسر، ڈاکٹر سید لطیف سیف، پروفیسر تقی اختر، فاروق برنی، اور ساجد چودھری نے اپنے کلام پیش کیے۔ آخر میں ڈاکٹر صادق نقوی نے اپنے استادانہ رنگ میں غزلیں سنائیں۔ نشست کے دوسرے دولیے میں پروگرام 'اشعار و اظہار' پیش کیا گیا۔ نشست کے آخری حصے میں امین حیدر نے مختصراً اردو ترجے کی تاریخ بیان کی۔ محترمہ سیدہ صالحہ صاحبہ نے ترجے کے مسائل پر روشنی ڈالی اور اپنے تجربوں کے حوالوں سے بتایا کہ وہ ترجے کے الجھے گیسوؤں کو کس طرح سنوارتی ہیں۔ اپنے کلیدی خطبے میں ڈاکٹر لطیف سیف نے دارالترجمہ حیدرآباد دکن پر ایک جامعہ اور تحقیقی رپورٹ پیش کی۔ آخر میں امین حیدر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، امین حیدر، شکاگو، 25 فروری 2015

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل اور نیشنل بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام مشاعرے کا انعقاد، دونوں اداروں کی کئی اہم کتابوں کا رسم اجرا بھی ہوا

نئی دہلی، 20 فروری، 2015۔ دہلی کے پرگتی میدان میں عالمی کتاب میلے کی رونقِ جلوہ افروز میں نیشنل بک ٹرسٹ کے اشتراک سے ایک خوبصورت شام کا انعقاد ہال نمبر۔7 کے، ایوینٹ ہال میں ہوا، جس میں دہلی کے معروف شاعروں و شاعرات نے شرکت کی اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا، اس موقعے پر کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین ، اور ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور این بی ٹی کے ڈائرکٹر ایم اے سکندر اور ایڈیٹر شمس اقبال نے بھی شرکت کی اور اس اشتراک کو ایک خوش آئند قدم قرار دیا۔ مشاعرے کے آغاز سے قبل دونوں اداروں کی کئی اہم کتابوں کا اجرا بھی ہوا، جن میں کونسل کی دو لغات 'اردو کی صوتی لغت' اور 'سہ لسانی لغت' بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کونسل سے شائع ڈاکٹر سمیع الرحمٰن کی کتاب 'ٹی وی نیوز پروڈکشن، فن اور طریقۂ کار اور ڈاکٹر شفیقہ پروین کی کتاب 'قرۃ العین حیدر فکر و فن' کا اجرا بھی ہوا۔ این بی ٹی سے شائع سالم علی کی کتاب 'ایک گوریا کا گرنا' منتظر قائمی کا اردو ترجمہ دادا صاحب پھالکے اور جیلانی بانو کی کتاب 'میں کون ہوں' جیسی کتابیں بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تدوین کردہ 'نو طرز مرصع' اور پروفیسر قدوس جاوید کی کتاب 'متن، معنی اور تھیوری' کی بھی رسم رونمائی ہوئی۔ ان تمام کتابوں کا رسم اجرا کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین ، ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، لسانی اقلیات کے کمشنر پروفیسر اختر الواسع، معروف صحافی گریش جویال اور کونسل کے رکن احتشام عابدی، قومی اقلیتی تعلیمی ادارے جات کمیشن کی رکن پدم شری ڈاکٹر ناہید عابدی، (بنارس) پروفیسر ارتضیٰ کریم اور گلزار دہلوی کے ہاتھوں ہوا اس کے بعد باقاعدہ مشاعرے کا آغاز ہوا، معروف شاعر و صحافی معین شاداب نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور مشاعرے کی صدارت گلزار دہلوی نے کی۔

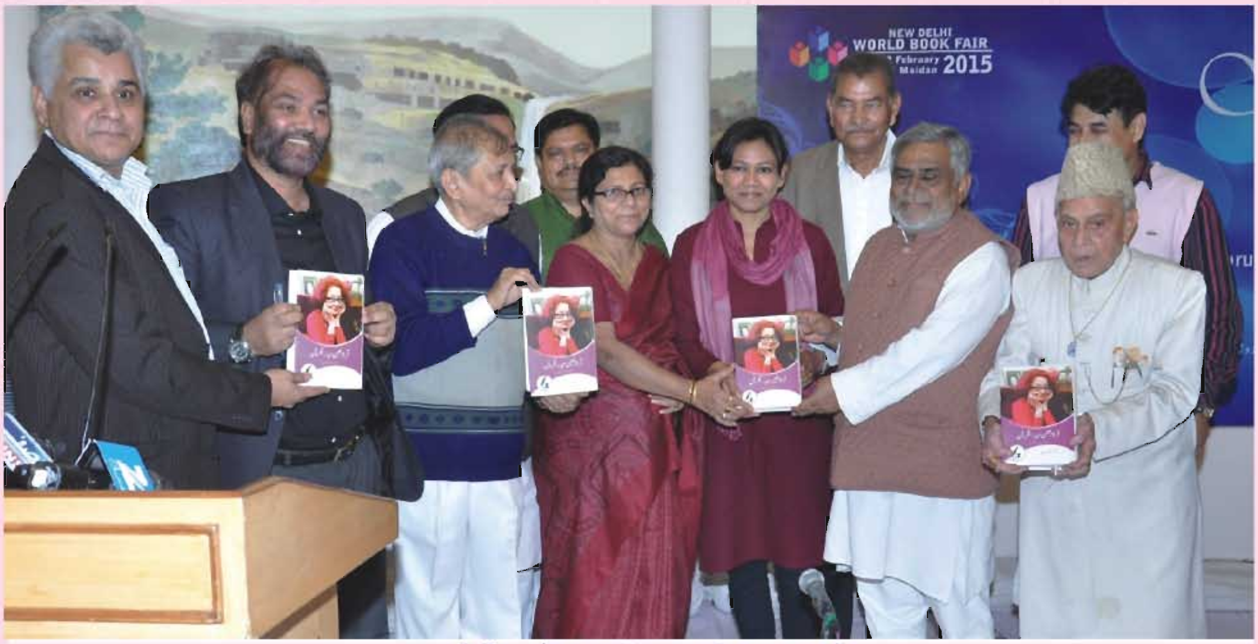

عالمی کتاب میلے میں ڈاکٹر شفیقہ پروین کی کتاب 'قرۃ العین حیدر فکر و فن' کا اجرا

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20 فروری 2015

کونسل کے مالی تعاون سے

اردو صحافیوں کی صلاحیت سازی

پٹنہ: صحافی قلم کے سپاہی ہیں۔ اچھی حکومت اور باخبر معاشرے کا قیام صحافت کا ایجنڈا ہے۔ یہ باتیں انگریزی کے سینئر صحافی سرور احمد نے اردو صحافیوں کی صلاحیت سازی کے لیے قومی اردو کونسل اور مولانا مظہر الحق عربی

اردو صحافیوں کی صلاحیت سازی ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے حکومت بہار کے پرنسپل سکریٹری عامر سبحانی

فارسی یونیورسٹی کے اشتراک سے جج بھون پٹنہ میں منعقدہ 5 روزہ ورکشاپ میں حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ اقلیتی فلاح و بہبود کے پرنسپل سکریٹری عامر سبحانی نے اردو اخبار نویسی اور اس کے مختلف نکات پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی فنی خوبیوں اور خامیوں کو پیش کیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ صحافت صرف ایک پروفیشن نہیں ایک جذبہ بھی ہے۔ انھوں نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ صحافی قلم کے امین ہیں۔ اردو صحافی کو احساس کمتری کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے اردو صحافیوں کو جدید تکنیک کے استعمال اور اس میں اوسی آر کو شامل کرنے پر بھی زور دیا۔ قومی کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت میں تحقیقی و تجزیاتی پہلو کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ انھوں نے اردو صحافت میں دیگر زبانوں کی صحافت کی اچھی چیزوں کو شامل کرنے کی صلاح دی اور موجودہ تقاضوں کو ملحوظ رکھنے پر بھی زور دیا۔ اس موقعے پر اردو اکادمی کے سکریٹری امتیاز احمد کریمی نے اردو زبان و صحافت پر مختصر تبصرہ کیا۔ افتتاحی تقریب سے خطاب کرنے والوں میں مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد، پرووائس چانسلر پروفیسر توقیر عالم، سید احمد قادری، مشتاق احمد نوری، شنکر کیموری کے نام قابل ذکر ہیں۔ تربیتی پروگرام میں شامل ہونے والوں میں قومی تنظیم، راشٹریہ سہارا، پندار، سنگم، فاروقی تنظیم اور دیگر اردو اخبارات کے معروف صحافی قابل ذکر ہیں۔

پانچ روزہ ورکشاپ کے دوسرے دن مولانا مظہر الحق یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں قومی کونسل اردو کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے شرکا سے کہا کہ میڈیا میں کامیابی کا راز وسیع مطالعہ اور گہرا مشاہدہ ہے۔ اردو صحافیوں کی صلاحیت سازی کے پروگرام میں صحافت اور اصناف صحافت پر تربیتی ورکشاپ میں رپورٹنگ، نیوز ایڈیٹنگ، اخبارات کی ادارت، لے آؤٹ اور اداریہ نویسی کے اہم نکات اور طریقہ کار پر ماہرین نے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ایڈیٹنگ کی تکنیک اور اردو میں نئی اصطلاحات کے صحیح استعمال پر زور دیتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام نے کہا کہ نئی اصطلاحات اور موزوں الفاظ کے استعمال سے زبان کو دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔ سینئر صحافی سید شہباز عالم نے کہا کہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے لیے ایڈیٹنگ کی تکنیک کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ معروف صحافی ریحان غنی نے اردو صحافت کی تکنیک پر بات کرتے ہوئے اس کے چند اہم پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا۔ خبروں کی ایڈیٹنگ اور اخباروں کے لے آؤٹ پر گفتگو کرتے ہوئے چندن شرما نے مثالوں کے ساتھ بتایا کہ آرٹ، ڈیکوریشن اور ڈیزائن پیشکش کو دیدہ زیب اور پرکشش بناتے ہیں لیکن اصل پونجی مواد ہے اور اس کے بعد ڈیزائن کو اہمیت حاصل ہے، رنگوں کے انتخاب میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، اخبار کو رنگولی بنانا پھوہڑپن ہے۔ صحافت میں ترجمہ کے مسائل پر بھی تبادلہ خیال کیا گیا۔ صحافی عبدالواحد رحمانی نے اردو صحافت میں ترجمہ کی تراکیب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں پرانے الفاظ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور نئے الفاظ کو شامل کرنا چاہیے۔ سیشن کا اختتام سوالات و جوابات پر ہوا۔ ورکشاپ کے تیسرے دن ویب جرنلزم اور صحافت میں آرٹی آئی پر خصوصی انٹرایکٹو کلاسز کا اہتمام کیا گیا۔

پرنٹ میڈیا صحافت کی ماں ہے۔ صحافت ہمیں اس طرف مائل کرتی ہے جہاں عمومی طور پر نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں۔ صحافیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے یہ باتیں قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے کہیں۔ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی میں وہ اردو صحافیوں کی صلاحیت سازی کے ورک شاپ کی اختتامی تقریب سے مخاطب تھے۔ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر توقیر عالم نے صحافیوں کی اس ورک شاپ میں شرکت کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ صحافیوں کو تفتیشی صحافت کی سمت بھی توجہ کرنی چاہیے۔ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر چودھری شرف الدین اور پروگرام کے کوآرڈینیٹر احمد جاوید نے شرکا اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر شرکا کے درمیان اسناد بھی تقسیم کی گئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25، 26، یکم مارچ فروری 2015

سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں صوفیائے کرام کا حصہ

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی میں سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں صوفیائے کرام کا حصہ کے موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی سیمینار 3-4 مارچ 2015 کو منعقد ہوا جس میں ملک و بیرون ملک کے مشہور دانشوروں اور مقالہ نگاروں نے متعلقہ موضوع کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی گذشتہ برس شبلی نعمانی پر منعقدہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں پر مبنی کتاب 'شبلی شناسی' کی رسم اجرا پروفیسر خواجہ اکرام الدین، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل اور ڈاکٹر تقی عابدی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ شعبۂ اردو کے پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی نے استقبالیہ خطبہ دیتے ہوئے ملک و بیرون ملک کے مہمانوں کا استقبال کیا۔ کلیدی

'سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں صوفیائے کرام کا حصہ' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

خطبہ مشہور دانش ور، نقاد، ادیب ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر علی فولادی، کلچرل کونسلر ایران ایمبسی، دہلی نے ہندوستان میں صوفیائے کرام کو سماجی ہم آہنگی کا نقشِ اول قرار دیا اور اس بات پر زور دیا کہ مختلف ملتوں، مسلکوں، اور تہذیبوں کو صرف اخلاص کے ذریعہ ہی ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے ثقافت اور سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں خانقاہوں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے صوفیائے کرام کو اپنے زمانے کا مرجع قرار دیا اور ثقافتی اداروں، محفلِ سماع، حال، اور موسیقی کی تہذیبی و تمدنی زندگی میں اہمیت کو اجاگر کیا۔ پروفیسر اختر الواسع کمشنر برائے لسانی اقلیات، حکومت ہند نے صوفیائے کرام کی خدمات اور سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں ان کے کردار سے بحث کرتے ہوئے ایثار، قناعت، اطاعت، صوف (اون) اشارہ، غربت، فقر جیسی صفات کو ایک صوفی کے لیے لازمی قرار دیا اور قلت کلام، قلت طعام اور قلت منام کو اس کی شخصیت کے لیے ناگزیر گردانا۔ مشہور عالم دین ڈاکٹر کلب صادق نے سماجی ہم آہنگی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اور انسان دوستی کے فروغ میں مسلمانوں کو اپنی فکر میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے اور تصوف کی مرکزی فکر ''دشمنی کا جواب بھی دوستی اور محبت سے دینا ہے۔''

مشہور وکیل جناب ظفریاب جیلانی نے فرمایا کہ عہد حاضر میں اسلام کی صحیح تعلیمات کی ترویج اور امن عالم کے لیے صوفیہ کے نظریات اور ان کی خدمات کو منظر عام پر لانا ایک اچھی کاوش ہے۔ تشدد پسندی اور انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے متصوفانہ خیالات کی تشہیر ضروری ہے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر خان مسعود احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں اس طرح کے سیمینار کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا اور ملک و بیرون ملک سے تشریف لائے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض سید شفیق احمد اشرفی نے انجام دیا۔ مجموعی طور سے دوروزہ سیمینار کے کل سات سیشن میں ساٹھ سے زائد مقالات پیش کیے گئے جو اپنے آپ میں ہمہ جہتی کی گواہی دیتے ہیں۔ مذکورہ پروگرام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد کیا گیا تھا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ثوبان سعید، ایسوسی ایٹ پروفیسر، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ، 6 مارچ 2015

شاہ ولی اللہ پر یک روزہ سیمینار

نئی دہلی: ''شاہ ولی اللہؒ اور ان کی تحریک نے جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ 1857 کی جنگ کا سپہ سالار جنرل بخت خان بھی ان سے متاثر تھا اور اس تحریک سے تعلق رکھنے والے علما نے بڑھ چڑھ کر آزادی کی لڑائی میں شرکت کی تھی۔'' غالب اکادمی میں ''حضرت شاہ ولی اللہ

محدث دہلویؒ اور ان کے اعزا و اقربا کی علمی و لسانی خدمات'' پر منعقد یک روزہ قومی سیمینار میں پروفیسر ابن کنول، صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے صدارتی خطبہ دیتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن (ڈائیوا) کے ذریعے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے اشتراک سے ''حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے اعزا و اقربا کی علمی و لسانی خدمات'' کے موضوع پر یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ قبل ازیں سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے معروف ماہر اقبالیات او دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر ایمریٹس، عبدالحق نے کہا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان نے جو علمی خدمات انجام دی ہیں اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ پروفیسر عبدالحق نے تجویز پیش کی کہ جامعہ ہمدرد یا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نام پر ایک انسٹی ٹیوٹ یا چیئر قائم کی جائے۔ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر اور آل انڈیا عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس ایسوسی ایشن کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے مہمانِ خصوصی کے طور پر سیمینار میں شرکت کی۔ سیمینار میں کافی پر مغز مقالے پڑھے گئے۔ محمد انس فیضی نے نظامت کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 16 فروری 2015

ہندوستان کی آزادی میں اردو زبان کا کردار

امروهه: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مرکزی سرکار کے مالی تعاون سے آزاد ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی امروہہ کے زیر اہتمام ہندوستان کی آزادی میں اردو زبان کا کردار عنوان سے ایک روزہ سیمینار کا انعقاد امروہہ کے جین مندر احاطے میں ہوا سیمینار کی صدارت اردو اکادمی یوپی کی سابق چیئر پرسن ترنم عقیل نے کی۔ سیمینار کے مہمان خصوصی مشہور صحافی اور ادیب سید محمد ہاشم تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر شیبان قادری نے انجام دیے مقالہ نگار شاہانہ فہیم، فتح نگینوی، ضیاء الحق فہیم، مصباح احمد صدیقی نے جنگ آزادی میں اردو کے کردار اور خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ترنم عقیل نے کہا کہ اردو والوں کے اوپر نہ صرف اپنی زبان کے تحفظ کی ذمہ داری ہے بلکہ اس کی ترویج و اشاعت میں بھی دلچسپی لینی ہوگی۔ مہمان خصوصی سید محمد ہاشم نے کہا کہ اردو زبان کا فروغ تب ہی ممکن ہے جب ہم سب اس کا استعمال اپنی روزمرہ کی زندگی میں کریں۔ آخر میں سیمینار کے کنوینر ناصر منصوری نے سبھی کا شکریہ ادا کیا

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 16 فروری 2015

امیر خسرو کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات

بلرام پور: پروانچل اتھان سمیتی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ایک روزہ قومی سیمینار بعنوان 'امیر خسرو کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات' جروا روڈ، تلسی پور میں ہوا جس کی صدارت

پروفیسر طارق کبیر، شعبۂ اردو ایم ایل کے پی جی کالج بلرامپور اور نظامت ڈاکٹر افروز طالب نے کی۔ پروگرام کا آغاز محمد ارشد صدیقی کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ بعد ازاں کنوینر ڈاکٹر عبداللہ خان رؤف نے خطبۂ استقبالیہ

'فیض احمد فیض فکر و فن' سیمینار کے دوران خطاب کرتے ہوئے، ڈاکٹر شمیم جبکہ اسٹیج پر پروفیسر خواجہ اکرام الدین، پروفیسر عبدالحق، سیما چشتی اور پروفیسر ابن کنول

پیش کیا۔ سیمینار میں مقررین نے امیر خسرو کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے انھیں ہندوستانی تہذیب، ادب و ثقافت کا عظیم معمار بتایا، اس موقعے پر خواجہ معین الدین چشتی عربی فارسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد اکمل اور شعبۂ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عبدالحفیظ، ڈاکٹر تبسم فرحی اور ستیہ نارائن مشرا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اکمل بلرامپوری نے اپنا کلام بھی پیش کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 2 مارچ 2015

فیض احمد فیض فکر و فن

نئی دھلی: سینٹ اسٹیفنز کالج کے شعبۂ اردو اور فارسی کے زیر اہتمام 'فیض احمد فیض فکر و فن' کے موضوع پر ایک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں کونسل کے ڈائرکٹر نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ خواجہ اکرام نے کہا کہ سینٹ اسٹیفنز کالج ایک تاریخی درس گاہ ہے جس کے ذریعے انسانیت کا پیغام عام کیا جاتا رہا ہے۔ فیض کی شاعری انسانیت کا پیغام دیتی ہے اور عظیم ہندوستان کی تعمیر کرنے کی تحریک دیتی ہے۔ افتتاحی اجلاس کے صدر پروفیسر عبدالحق نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ قدیم روایت سے رشتہ قائم کیے بغیر بڑی شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ مہمانِ ذی وقار پروفیسر محمد ذاکر نے فیض کی لفظیات کے حوالے سے گفتگو کی۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ یہاں اردو کے تعلق سے مسلسل تعلیمی اور ادبی پروگرام منعقد ہو رہے ہیں جو اردو کے خوش آئند مستقبل کے نقیب ہیں۔ اس سے قبل کالج کے پرنسپل ریورنڈ ڈاکٹر والسن تھامپو نے کہا کہ زبان کی نشو و نما اور فروغ دراصل انسانیت اور اخلاقی قدروں کا فروغ ہے۔ سینٹ اسٹیفنز کالج میں تعلیم کا مقصد بازار کے لیے طلبا کو تیار کرنا نہیں بلکہ اچھے انسان بنانا ہے اور یہ کام زبان و ادب بالخصوص اردو کے ذریعے ممکن ہے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم احمد نے بتایا کہ شعبے نے مختلف موضوعات پر سیمینار کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اردو کے طلبا کی تعداد مختصر ہونے کے باوجود کالج میں اردو بے حد مقبول ہے اور مختلف کورسز کے طلبا اردو تہذیب سے وابستگی اختیار کرتے ہیں۔ سیمینار کے دوسرے اجلاس میں دس مقالات پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 فروری 2014

اردو ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر

پونے: دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بہ اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دو روزہ قومی سیمینار بہ عنوان 'اردو ادب میں قومی یک جہتی کے عناصر' کا انعقاد ہائی ٹیک ہال اعظم کیمپس میں ہوا جس میں پدم شری جناب اختر الواسع قومی کمشنر برائے اقلیتی لسانی اقلیات نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے بڑے ہی جامع انداز میں قومی یکجہتی کے مفہوم کو واضح کیا اور کہا کہ قومی یکجہتی چار عناصر میں پوشیدہ ہے۔ ماں، مادری زبان، ملک اور مذہب ان چار چیزوں سے قومی یکجہتی پائیدار ہوتی ہے۔ صدر دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ نے کہا کہ ہندوستان کی تمام زبانیں موتیوں کی طرح ہیں لیکن اس کا دھاگہ اردو ہے جس میں تمام زبانوں کو پرو دیا گیا ہے اور اردو کے DNA ہی میں قومی یکجہتی ہے۔

افتتاحی پروگرام میں دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کی صد سالہ تقریب کے موقعے پر اس انسٹی ٹیوٹ کے سابق صدر خان بہادر شیخ صاحب مرحوم کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے قومی یکجہتی ٹرافی رابوڑی فرینڈز سرکل تھانے کو عطا کی گئی۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت محترمہ سلمہ واحد مومن کمیٹی ممبر دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ نے کی۔ اس اجلاس میں مختلف علاقوں سے آئے، مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔

پروگرام کے دوسرے اجلاس کی صدارت محترمہ ممتاز پیر بھائی صدر انجمن ترقی اردو ہند نے کی۔ سیمینار کی اختتامی تقریب میں جناب شاہد لطیف مدیر روزنامہ انقلاب ممبئی نے بطور مہمان خصوصی اپنی تقریر میں کہا کہ اردو کے لیے قومی یکجہتی کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اردو کا خمیر ہی قومی یکجہتی ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر مہتاب عالم نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ محترمہ عابدہ انعامدار صاحبہ نے اپنے صدارتی خطبات میں بچوں کی اردو آنگن واڑی پر زور دیا۔

پروگرام کا اختتام محترمہ عظمہ تسنیم صدر شعبۂ اردو، عابدہ انعامدار کالج کے ہدیہ تشکر پر ہوا اور عظمت دلال اسسٹنٹ پروفیسر اردو عابدہ انعامدار سینئر کالج نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز، محمد آصف دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، اعظم کیمپس، پونے، 28 فروری 2015

لکھنؤ میں میر شناسی کے عنوان پر سیمینار

لکھنؤ: میر تقی میر نے اردو شاعری کو جو وقار بخشا اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میر نے اردو شاعری کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ میر کی شاعری سے ایک سرحد کا احاطہ ہوا اور اسے غالب نے مزید آگے بڑھایا۔ نظیر اکبرآبادی نے اس کو مزید تقویت بخشی۔ ان خیالات کا اظہار عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے جے شنکر پرساد آڈیٹوریم میں اشرف سوشل ویلفیئر سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی

سی عبدالحکیم کالج میں جلسۂ تقسیم اسناد کا منظر

اردو زبان وادب اور انٹرنیٹ پر منعقدہ سیمینار کا منظر

دہلی کے اشتراک سے 'میر شناسی' کے عنوان سے منعقد سیمینار میں کیا۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر ملک زادہ نے کہا کہ میر تقی میر، مرزا غالب اور نظیر اکبرآبادی کی تخلیقات کا مطالعہ کرلیا جائے تو اردو شاعری کا پورا منظرنامہ سامنے آجائے گا۔ سیمینار کے مہمان خصوصی پروفیسر مجاور حسین رضوی نے کہا کہ میر کو سمجھنے کے لیے ان کے زمانے کو سمجھنے اوران کی لفظیات اور ان کے اشعار کی تہہ میں اترنے کی ضرورت ہے۔ سیمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر فخر عالم نے میر تقی میر پر سیر حاصل گفتگو کی۔

روزنامہ 'اردو ایکشن' بھوپال، 17 فروری 2015

21ویں صدی میں اردو ناول

کلکتہ: شہرۂ آفاق ملی ادارہ مسلم انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے '21ویں صدی میں اردو ناول' پر دو روزہ قومی سیمینار کا افتتاح معروف ادیب سید محمد اشرف نے کیا۔ اپنے کلیدی خطبے میں انھوں نے کہا کہ ناول لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لکھنے کے لیے یکسوئی کا ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ناول کا سراغ داستانوں میں ملتا ہے۔ ناول مغربی بنگال کی صنف ہے جس میں حقیقی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے جبکہ داستانوں میں خیالی زندگی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ناول لکھنے کے لیے یکسوئی کا ہونا ضروری ہے۔ ناول تحمل کا تقاضا کرتا ہے۔ زندگی کی بصیرت، تجربہ اور مشاہدہ اگر میسر ہوں تب بھی اچھا ناول وجود میں نہیں آسکتا ہے۔ اس سے پہلے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری شیخ شمشیر علی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ادارہ شروع ہی سے اردو زبان وادب کے فروغ کا کام کررہا ہے اور اردو ناول پر یہ دو روزہ سیمینار اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت مسلم انسٹی ٹیوٹ کے صدر حیدر عزیز صفوی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نعیم انیس نے انجام دیے۔ پروگرام کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی صدارت میں مقصود دانش نے '21ویں صدی کے ناولوں کا معاشرتی پس منظر' ڈاکٹر نصرت جہاں نے '21ویں صدی کے ناولوں میں نسوانی کردار' ڈاکٹر دبیر احمد نے '21ویں صدی میں اردو کے اہم ناول نگار' اور ڈاکٹر زین رامش (ہزاری باغ) نے '21ویں صدی میں جھارکھنڈ میں اردو ناول' پر اپنے مقالات پڑھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتہ، 21 فروری 2015

سی عبدالحکیم کالج میں جلسۂ تقسیم اسناد

میل وشارم: سی عبدالحکیم کالج میل وشارم تامل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا علاقائی مرکز قائم ہے۔ جہاں اردو ڈپلوما کورس، عربی سرٹیفکیٹ کورس اور عربی ڈپلوما کورس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس میں امسال 220 طلبا و طالبات نے ڈپلوما اردو لینگویج اور 180 طلبا و طالبات سرٹیفکیٹ ان فنکشنل عربک کی اسناد حاصل کیں۔ اس سلسلے میں ایک اجلاس بروز شنبہ 23 فروری 2015 کالج آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا تھا۔ جلسہ کی صدارت جناب الحاج ایس زیڈ ابرار احمد صاحب کرسپانڈنٹ کالج ہذا نے کی۔ جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن پاک اور نعت شریف سے ہوا۔ جناب عبدالرؤف صاحب استاذ این سی پی یو ایل سینٹر نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر یس محمد یاسر صاحب صدر، شعبۂ اردو اور کوآرڈی نیٹر، این سی پی یو ایل نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ مہمانِ خصوصی مولانا مولوی ڈاکٹر شیخ سعید احمد عمری صاحب، پرنسپل، جامعہ دارالسلام عمرآباد نے جلسہ سے خطاب فرمایا اور مہمانِ اعزازی ڈاکٹر ایم پریہ درشنی، ریونیو ڈیویژنل آفیسر رانی پیٹ نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جناب ڈاکٹر کے مسعود احمد صاحب، پرنسپل کالج ہذا نے بھی خطاب کیا۔ کامیاب طلبا و طالبات کو صدر اور نائب صدر، میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی عالی جناب الحاج ساہوکار نثار احمد صاحب اور عالی جناب الحاج جی انیس احمد صاحب نے اسناد تقسیم کیں۔ جلسہ میں عمائدین شہر اخبار و رسائل اور الکٹرانک میڈیا کے صحافی اور نامہ نگار خاصی تعداد شامل تھے۔ جناب مفتی فردوس احمد صاحب استاد این سی پی یو ایل نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ قومی ترانہ پر جلسہ کا اختتام ہوا، جلسہ کی نظامت جناب ایم ارشاد احمد اور جناب ایم محمد عارف الدین استاذ این سی پی یو ایل سینٹر نے کی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر یاسر، میل وشارم، 27 فروری 2015

اردو زبان وادب اور انٹرنیٹ

حسن پور: جھمن لال پی جی کالج اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'اردو زبان وادب اور انٹرنیٹ' کے عنوان سے قومی سیمینار منعقد کیا گیا۔ جس کا آغاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر صغیر افراہیم و ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر راشد عزیز، ڈاکٹر ایم اے معروف نے شمع روشن کرکے کیا۔ اس کے بعد کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر ایم اے معروف نے موضوع کا تعارف پیش کیا اور کالج ڈائریکٹر جناب گوپال سکسینہ نے کہا کہ ہم آئندہ سال سے ہی ایم۔اے اردو شروع کر رہے ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ دور جدید انٹرنیٹ کا دور ہے وقت کی تنگی بہت دامن گیر ہے اور معاشی حالات کمزور ہیں تو انٹرنیٹ بہت معاون و مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ اس موقع پر 'تہذیب الاخلاق' کے جدید شمارے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جو سید حامد صاحب کی زندگی اور کارہائے نمایاں پر ایک خصوصی مجلّہ ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ادب کی کوئی صنف سخن ایسی نہیں جو انٹرنیٹ پر موجود نہ ہو۔ انھوں نے گلوبل گاؤں کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ انٹرنیٹ نے پوری دنیا کو ایک مٹھی میں قید کردیا ہے۔ پروفیسر راشد عزیز اپنے مقالے کے ذریعہ نوجوان بزرگوں اور بچوں کو انٹرنیٹ کی دنیا سے فیضیاب ہونے کے مشورے کے ساتھ انٹرنیٹ اور اردو کے مضبوط رشتے کو واضح کیا۔ سابق پرنسپل ڈاکٹر ڈی این شرما نے کہا کہ میں جبکہ میں خود ہندی کا استاد رہا ہوں مگر مجھے اردو سے بے حد محبت ہے اسی لیے میں اکثر اردو کے سیمیناروں میں شرکت کرتا ہوں۔

پریس ریلیز، انجینئر فرقان سنبھلی، علی گڑھ، 27 فروری 2015

وحشت کلکتوی: فن اور فنکار

مرشدآباد: شعبہ اردو، سبھاش چندر بوس سینٹینری کالج، لال باغ، مرشدآباد اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'وحشت کلکتوی۔فن اور فن کار' کے عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار کا انعقا کیا گیا۔ انھوں نے سیمینار کے افتتاحی تقریب کی صدارت پرنسپل انچارج، ڈاکٹر شکیل احمد خان نے کی۔ ڈاکٹر سوپم مکھرجی نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے اور مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ سید مصطفےٰ علی میرزا نے مترنم آواز میں وحشت کی غزل سنائی۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جناب انیس رفیع نے کہا کہ وحشت پہلا شاعر تھا جس کی مادری زبان بنگلہ تھی اس کے باوجود انھوں نے اردو کو اپنایا یا یوں کہیے کہ اردو والوں نے ان کو اپنا لیا۔

ڈاکٹر شکیل احمد خان نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ مرشدآباد کی تاریخ کا یہ پہلا اردو قومی سیمینار ہے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے اشتراک سے 'وحشت کلکتوی۔فن اور فن کار' کے عنوان سے اس سرزمین پر ہو رہا ہے۔ افتتاحی جلسے کے بعد پہلا اجلاس شروع ہوا جس میں کئی مقالے پیش کیے گئے۔ دوسرے دن کے سیمینار کی صدارت جناب انیس رفیع نے کی۔ اس سیشن میں چھ مقالے پیش کیے گئے۔ صدارتی خطبہ میں انیس رفیع صاحب نے تمام شرکا کے مقالے پر سیر حاصل گفتگو کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ندیم احمد (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) نے انجام دیے۔ تیسرے اجلاس میں کل پانچ مقالے پڑھے گئے۔ اس سیشن کی صدارت ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے کی۔

پریس ریلیز: ایس بی سی کالج، مرشدآباد، 4 مارچ 2015

اردو ذریعہ تعلیم ایک جمہوری حق، مسائل اور امکانات

چاندپور: بجنور کی معروف تعلیمی، ثقافتی، تمدنی تنظیم منڈلیہ وکاس سنستھان، چاندپور بجنور کے زیر انتظام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے بعنوان 'اردو ذریعہ تعلیم، ایک جمہوری حق، مسائل اور امکانات' ایک روزہ قومی سیمینار، اسکائی لائن انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر کیمپس، چاندپور بجنور میں منعقد کیا گیا۔

سیمینار کا افتتاح اکھنڈ پرتاپ IAS ضلع بجنور نے کیا۔ سیمینار کی صدارت ڈاکٹر رباب انجم نے اور نظامت سیمینار کے کنوینر الیاس انجم نے کی۔ اپنے استقبالیہ کلمات میں اردو زبان کی صورت حال پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ کلیدی خطبہ میں مشہور مصنف شکیل بجنوری نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ بچہ اپنی مادری زبان اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے۔ کسی قوم کے لیے اس کی مادری زبان اس کا بیش قیمتی سرمایہ ہوتی ہے دوسرا بیش قیمتی سرمایہ اس کی تہذیب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سیدہ سبطین نے کہا کہ جب ہم قوموں اور ملکوں کی بڑھتی ہوئی ترقی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا کہ ان کے پیچھے ان کی اپنی مادری زبانوں کا ہاتھ رہا ہے۔

ڈاکٹر فرزانہ خلیل نے کہا کہ افسوس ہے کہ اردو والے اپنے جمہوری حقوق کی جانب سے غافل ہیں اور ہماری یہ بے حسی اور غفلت ہی اردو کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ خان نے اپنے مقالے میں کہا کہ آج تعلیم حاصل کرنے کے نظریے میں ایک تبدیلی یہ آئی ہے کہ اُسے روزگار سے جوڑا جارہا ہے۔

معروف اسکالر فائزہ زبیر نے کہا کہ اردو سماج کے بارے میں کئی غلط فہمیاں ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اتر پردیش میں اردو مر چکی ہے۔ اس منفی سوچ سے بہت نقصان ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پچھلی مردم شماری کے مطابق صوبے میں تین کروڑ سے زیادہ لوگوں نے اپنی مادری زبان اردو لکھوائی ہے۔ مادری زبان لکھنے پڑھنے کی صلاحیت نہ رکھنے کو زبان نہ جاننے سے تعبیر کرنا سراسر غلط ہے۔ اردو زبان کروڑوں کے درمیان بولی جاتی ہے اس لیے زندہ ہے۔ مشہور و مقبول ناول نگار، افسانہ نگار نصرت شمشی نے کہا کہ مادری زبان تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے بلا شبہ ہماری شناخت اور ہماری تہذیبی بقا اردو زبان میں ہی ہے۔

سیمینار کی صدارت کررہیں ڈاکٹر رباب انجم نے کہا کہ اردو ہندستان کے مشترکہ ادب کی علامت ہے۔ یہ واحد زبان ہے جو ملک کے مختلف لسانی صوبوں میں سرکاری حیثیت رکھتی ہے۔ اس موقعے پر عمائدین شہر کی کثیر تعداد موجود تھی۔

پریس ریلیز: الیاس انجم (کنوینر)، منڈلیہ وکاس سنستھان، چاندپور، 1 مارچ 2015

اردو زبان وادب پر تصوف کے اثرات

نئی دہلی: شاہین پبلک اسکول، جامعہ نگر، نئی دہلی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے سوشل پرائڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام 'اردو زبان و ادب پر تصوف کے اثرات' کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں نظامت کے فرائض غوث سیوانی نے جبکہ سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر کمال نے تمام مہمانانِ کرام اور شرکا کا تہہ دل سے استقبال کیا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر عارف بسمل نے تصوف کے حوالے سے کہا کہ فارسی زبان سے اردو شاعری میں سب سے پہلے حضرت امیر خسرو اور ولی دکنی کے یہاں متصوفانہ

رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی دکنی کے یہاں سے جو روایت شروع ہوئی وہ اب بھی باقی ہے اور آج بھی اردو کے ہر قابل ذکر شعرا کے کلام میں تصوف کی جا بجا جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ ظفرالدین برکاتی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں صوفیائے کرام نے دعوت و تبلیغ کے لیے علاقائی لب و لہجے میں مقامی زبان استعمال کی۔ ظفر انور نے اپنے مقالے میں کہا کہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ پروفیسر عبیدالرحمٰن سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب میں متصوفانہ کلام کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 فروری 2015

ہندوستان میں اردو کی تعلیم و تدریس مسائل اور حل

علی گڑھ: اردو زبان عالمی سطح پر بولی جانے والی زبان بن گئی ہے مگر افسوس کہ ہندوستان میں اس زبان کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکا ہے، ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایمریٹس فرحت اللہ خاں نے کیا وہ ملت بیداری مہم کمیٹی اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے زیر اہتمام این آر ایس سی کلب میں 'ہندوستان میں اردو کی تعلیم و تدریس: مسائل اور حل' موضوع پر قومی سیمینار میں بطور مہمانِ خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمبھو ناتھ تیواری نے کہا کہ اروزبان دنیا کی سب سے میٹھی زبان ہے اور اسے محبت کی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو نفرت سے پرے ہے اور اس نے ہمیشہ حب الوطنی، قومی یکجہتی، بھائی چارے اور اتحاد کا پیغام دیا ہے۔

سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر جسیم محمد نے کہا کہ اردو زبان نے ملک کی آزادی میں جو قابلِ قدر تعاون پیش کیا وہ ہماری تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شیخ مستان نے کہا کہ وقت کا تقاضہ ہے کہ اردو کو نئی نسلوں تک پوری ایمانداری اور سنجیدگی کے ساتھ پہنچایا جائے۔ اس موقعے پر معروف صحافی دیپک شرما کو ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں تہنیتی نشان سے سرفراز کیا گیا۔ سیمینار کی نظامت مصائد قدوائی نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 مارچ 2015

عالمی یومِ مادری زبان کے انعقاد سے متعلق خبریں

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام ملک بھر میں یوم مادری زبان منایا گیا، مقررین نے مادری زبان کو عام کرنے پر دیا زور

نئی دہلی: 21 فروری، 2015، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'یوم مادری زبان' کے موقع پر ایک پروقار تقریب منعقد ہوئی جس میں مادری زبان کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی، مرکزی

حکومت نے 21 فروری کو بطور یوم مادری زبان منانے کا فیصلہ کیا ہے اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے اردو کے سب سے بڑے حکومتی ادارے قومی اردو کونسل نے اس پروقار تقریب کا انعقاد کیا جس میں مقررین نے حکومت کے اس قدم کی پرزور ستائش کی۔ تقریب کا آغاز قومی ترانہ سے ہوا، اس پروقار تقریب کے مہمان خصوصی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چانسلر اور سماجی کارکن جناب ظفر سریش والا تھے، اپنی تقریر میں انھوں نے مادری زبان میں تعلیم دیے جانے پر زور دیا اور کہا کہ اردو والوں کو اپنے مستقبل سے ہرگز مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو والوں کو دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ پیشہ وارانہ تعلیم پر بھی زور دینا ہوگا تاکہ انھیں روزگار کے مواقع مل سکیں اور جدید وسائل سے وہ جڑ سکیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کسی ایک خاص فرقے کی زبان نہیں، وزیراعظم جناب نریندر مودی کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وزیراعظم کو اردو زبان نہ سیکھنے کا افسوس ہے لیکن انھیں اس پیاری زبان سے بڑی محبت ہے۔ اسی لیے فلم ساز سلیم خان نے وزیراعظم کی اردو ویب سائٹ تیار کی ہے۔ تقریب کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو والوں کو تنگ نظر نہیں سمجھا جانا چاہیے کیونکہ اردو والوں کی زبان مراٹھی، گجراتی، تیلگو، تمل و دیگر علاقائی زبانیں بھی ہیں۔ اس لیے ہمیں اردو کے ساتھ دیگر زبانوں کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ کونسل حکومت کی ایما پر 26 ریاستوں میں 'یوم مادری زبان' منا رہی ہے اور کونسل کے تمام اردو، عربی، کمپیوٹر و کیلی گرافی مراکز کو اس دن کے تعلق سے خصوصی ہدایت جاری کردی گئی ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ حکومت کے اس قدم سے عوام الناس میں مادری زبان کے تئیں مزید بیداری آئے گی۔ کلیدی خطبہ لسانی اقلیات کے کمشنر پروفیسر اخترالواسع نے پیش کیا، اپنے کلیدی خطبے میں انھوں نے اردو زبان کی تعلیم پر زور دیا اور کہا کہ مادری زبان سے کسی بھی صورت میں رشتہ نہیں توڑا جاسکتا۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب رضا حیدر نے بھی اپنے خیالات پیش کیے، اظہار تشکر کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے کیا اور کونسل کی جانب سے تمام مہمانان و طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب میں کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ، ریسرچ آفیسر انتخاب احمد کے علاوہ اسٹاف کے دیگر عہدیداران نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 فروری 2015

نئی دہلی: پورے ملک کی طرح دہلی میں الامین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی نے بھی یوم مادری زبان کو انوکھے انداز میں منایا۔ قومی کونسل کی ہدایت پر الامین کی جانب سے طلبا کے لیے نہ صرف مادری زبان اردو میں متعدد مقابلوں کا اہتمام کیا گیا بلکہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبا کو انعام اور اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ اس پروگرام میں کوئیز مقابلے کے اہتمام کے ساتھ اردو زبان میں سلوگن لکھے گئے اور اردو ٹائپنگ مقابلہ کے علاوہ بیت بازی اور شعروشاعری کی محفل بھی جمی۔ بیت بازی مقابلوں میں نہ صرف آخری حرف سے شعر کہے گئے بلکہ میر کے اشعار پڑھنے کے لیے طلبا کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ بیت بازی میں شامل ہوئے محمد آرزو نے بتایا کہ یوم مادری زبان منانا ان کے لیے آج خوشی کی بات تھی کیونکہ اس سے اردو زبان سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے۔ تاہم پوسٹر مقابلہ میں طلبا و طالبات نے صفائی مہم پیش کرنے کی کوشش کی۔ پوسٹر مقابلہ میں نمایاں مقام حاصل کرنے والی طالبہ نے بتایا کہ وہ چاہتی ہیں کہ اردو زبان کا فروغ ہو اور تمام ہندوستانی صفائی مہم میں شامل ہوں۔ اس موقعے پر سینٹر انچارج نوین راج بھاٹیا اور مولانا عابد نے بتایا کہ یوم مادری زبان سے طلبا اور طالبات کو معلوم ہوا کہ ان کی مادری زبان کیا ہے اور کس طرح سے وہ زبان کے ذریعے اپنی شناخت بنا سکتے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 فروری 2015

رام پور: یومِ مادری زبان کے موقعے پر شہر کے مختلف اسکولوں میں تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ پرانا گنج بے تک روڈ واقع چاند ویلفیئر سوسائٹی کے صدر دفتر پر ایک پروقار تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر معروف صحافی و سماجی کارکن ذیشان محمد خاں مراد نے شرکت کی۔ انھوں نے تقریب کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے حصول کے لیے مادری زبان سے بہتر کوئی دوسری زبان ذریعہ تعلیم نہیں بن سکتی۔ انسان کی زندگی میں ویسے تو کئی زبانوں مثلاً عالمی رابطے کی زبان انگلش اور قومی زبان ہندی کی کافی اہمیت ہے لیکن مادری زبان جو بچہ ماں کی گود میں دوران پرورش سیکھتا ہے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ اردو کی بقا کے لیے سنجیدگی سے غور کریں اور کوشش کریں کہ اپنے بچوں کو اردو پڑھنے اور لکھنے کی ترغیب دیں۔ سوسائٹی کی سکریٹری صدا توصیف نے کہا کہ 21 فروری کو یونیسکو نے بین الاقوامی طور پر یومِ مادری زبان منانے کا اعلان کیا ہے جو ایک خوش آیند قدم ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیں دوسروں کا سہارا لینے کے بجائے خود آگے بڑھ کر کام کرنا ہوگا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو کسی فرد یا مذہب کی زبان نہیں بلکہ وہ ہندوستان میں بولی جانے والی معروف و مقبول زبان ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 22 فروری 2015

امروہہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام چلائے جارہے اردو خطاطی و گرافک ڈیزائننگ سینٹر پر یوم مادری زبان کے تحت ایک سیمینار کا انعقاد ہوا جس میں مقررین نے اردو کی تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے اردو کی زبوں حالی پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ مقررین نے کہا کہ اردو کو کسی ایک فرقے یا مسلک سے منسوب کردینا نہایت افسوس ناک ہے۔ اردو مختلف زبانوں سے مل کر وجود میں آئی زبان ہے اور اسی لیے مختلف تہذیبوں کی عکاسی بھی اردو سے ہوتی ہے۔ اس موقعے پر انیس احمد فاروقی، حکیم امیرالدین علوی، مولانا شرافت حسین نوری، رضوان علی انصاری نے مادری زبان کی اہمیت پر اپنے خیالات پیش کیے۔ سیمینار میں سینٹر پر اردو خطاطی فن کی تعلیم حاصل کرنے والے جملہ طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 22 فروری 2015

بریلی: یوم مادری زبان کے موقعے پر ایک میٹنگ کا انعقاد انجمن ترقی اردو اترپردیش کے زیر اہتمام قصبہ فتح گنج، بریلی میں حافظ لئیق کی صدارت میں کیا گیا۔ میٹنگ کا آغاز نعت پاک سے مولانا عبدالستار نے کیا۔ میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر ایم اے خاں ضلع صدر انجمن ترقی اردو، اترپردیش نے اردو زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ برصغیر میں آج بھی سب سے زیادہ استعمال ہونے والی زبان اردو ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگتا ہے کہ سبزی فروش سے لے کر ایک آئی اے ایس افسر بھی اردو کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو چاشنی اس زبان میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں۔ اس موقعے پر پروین عشرت جہاں ضلع رکن اترپردیش رابطہ کمیٹی نے ریاستی حکومت سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے درجہ اوّل سے لے کر درجہ بارہ تک کے بھی اسکولوں میں اردو زبان کو لازمی قرار دیا جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 فروری 2015

سیتاپور: دنیا میں پیدا ہونے والے کسی بھی انسان کی مادری زبان وہی زبان ہوتی ہے جو کہ وہ اپنی ماں کی گود میں پرورش کے دوران سننے سمجھنے کے بعد بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں مختلف زبانوں کے علاوہ سب سے بڑی تعداد میں جو زبان بچے اپنی ماں کی گود میں سنتے سمجھتے اور سیکھتے ہیں وہ اردو ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مسلم جونیئر ہائی اسکول میں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تحت قائم کمپیوٹر سنٹر پر یوم مادری زبان کے عنوان سے منعقدہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے شاعر و صحافی مست حفیظ رحمانی نے سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ مفتی مولانا محمد صفوان اطہرندوی نے کہا ہندوستانی آئین میں درج ضابطوں کے مطابق ہندوستان کے ہرشہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرے۔ مفتی محمد خبیر ندوی نے کہا کہ مدارس کے ذریعے اردو کو فروغ تو حاصل ہو رہا ہے لیکن ان مدارس کا نصاب ایسا نہیں ہے جہاں سے ادبا، شعرا اور دانشور تیار کیے جاسکیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے حوالے سے ہونے والے سیمینار اور مشاعرے عوام میں ہماری مادری زبان اردو کی مقبولیت کا مضبوط ستون ہیں۔ سماجی کارکن شوبھت ٹنڈن نے مادری زبان پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی شخص کی اور اس کے کلچر کی پہچان اس کی مادری زبان سے ہی ہوتی ہے۔ اردو زبان میں وہ خوبی ہے کہ اس کے بولنے والے افراد کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ سیمینار و مشاعرہ کے کنوینر و مسلم جونیئر ہائی اسکول کے منیجر حاجی محمد سلیم انصاری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 فروری 2015

امروہہ: حمیدی تعلیمی و سماجی مشن کے ذریعے منعقد پروگرام میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی سے تشریف لائے مہمان خصوصی حاجی محمد اقبال خاں نے اردو کی مقبولیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہماری مادری زبان ہے۔ اس لیے اس کو دلچسپی سے سیکھیں اور اپنی روزانہ کی بات چیت میں استعمال کریں۔ موجودہ دور میں لوگ دیگر زبانوں کے مقابلے اردو زبان کو مشکل سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر افتخار انیس نے قومی کونسل کے ذریعے چلائے جارہے اردو ڈپلومہ کورس کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

بذریعہ ڈاک: ڈاکٹر افتخار انیس، سردار حمید تعلیمی و سماجی مشن، 22 فروری 2015

تروچناپلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی

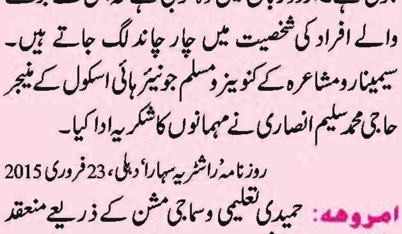

دہلی کے تعاون سے شعبۂ اردو، جمال محمد کالج، تروچناپلی،

'مرکز ادب وسائنس رانچی ٹرسٹ' کے زیر اہتمام 'یوم مادری زبان' تقریب کا منظر

جامعہ نورالاسلام چٹگوپہ ضلع بیدر میں منعقدہ یوم مادری زبان کا منظر

تمل ناڈو میں چل رہے، کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سنٹر میں 21 فروری کو عالمی یوم مادری زبان کا انعقاد عمل میں آیا۔ صدر شعبۂ اردو اور کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سنٹر کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر پی احمد بادشاہ نے جلسے کی صدارت کی۔ سینئر فیکلٹی جناب احمد جلال الدین نے حاضرین کا استقبال کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر پی احمد بادشاہ نے مادری زبان کی اہمیت اور مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر جناب ڈاکٹر شیخ کریم اللہ، صدرِ شعبۂ ہندی، جمال محمد کالج، تروچناپلی مدعو تھے۔ انھوں نے عصر حاضر میں تمل ناڈو میں زبانوں کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ریاست میں چل رہی ذولسانی پالیسی کی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے دیگر اقلیتی زبانوں کی ترقی کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے مادری زبان میں تعلیم اور مادری زبان کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر سنٹر کے طلبا و طالبات نے مادری زبان کی اہمیت پر تقاریر کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا جنھیں انعامات سے نوازا گیا۔ سینئر فیکلٹی محمد بلال نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: محمد خالد شریف، اردو فیکلٹی، شعبۂ اردو، جمال محمد کالج، تروچناپلی، 22 فروری 2015

سرینگر: مادری زبان کے دن کے سلسلے میں 21 فروری کو کئی تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ ملک کی دوسری ریاستوں کی طرح ہی جموں کشمیر میں بھی اس اہم دن کی مناسبت سے سیمینار منعقد کیے گئے۔ کئی ادبی وثقافتی اداروں کی طرف سے منعقد کیے گئے پروگراموں میں مادری زبان کو کسی بھی قوم کی بقا اس کے وجود اور ہر طرح کی ترقی کے لیے اہم قرار دیا گیا جبکہ مقررین نے اس بات کی ضرورت پر زور دیا کہ اپنی مادری زبان کے تحفظ کے لیے سبھی کو سنجیدہ ہو جانا چاہیے۔ جموں کشمیر کلچرل اکادمی کی طرف سے سری نگر اور جموں میں منعقد کی گئی تقریبات میں مقررین نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ اپنی مادری زبان سے نئی نسل دور ہوتی جا رہی ہے۔ مقررین نے اس بات کی ضرورت پر زور دیا کہ کشمیری زبان کے تحفظ کے لیے کشمیری سبجیکٹ کو سرکاری و نجی تعلیمی اداروں میں لازمی بنایا جانا چاہیے تاکہ نئی نسل اپنی مادری زبان کی طرف بھرپور طریقے سے متوجہ ہو اور اس زبان کی ترقی بھی ہو۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 فروری 2015

رانچی: 'مرکز ادب وسائنس ٹرسٹ رانچی' کے زیر اہتمام 'یوم مادری زبان' کے عنوان پر طلبہ و طالبات کی ایک مقابلہ جاتی تقریب ٹرسٹ کے فاؤنڈر چیئرمین ڈاکٹر احمد سجاد کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ ڈاکٹر احمد سجاد نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ اس کے بعد ٹرسٹ کی چیئرپرسن ڈاکٹر رفعت آرا و سکریٹری ٹرسٹ ڈاکٹر طارق سجاد نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر احمد سجاد نے اپنے خطاب میں 'مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت' کے عنوان پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے طلبا پر زور دیا کہ مادری زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جس کو بچہ اپنی ماں کی گود سے سیکھتا ہے اور اس پر اگر عبور حاصل کر لیتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی بھی زبان اس کے لیے آسان تر ہو جاتی ہے۔

معزز مہمانان کے خطاب کے بعد باضابطہ طور پر طلبا کی مسابقتی کارروائی شروع کی گئی جس میں مرکز ادب و سائنس کے زیر اہتمام چلنے والے بریاتو سینٹر SCTGC کے طلبا اور SIIT کانٹا ٹولی سینٹر کی دونوں یونٹ CABA-MDTP اور DREAM نے حصہ لیا اور بہترین مظاہرہ کیا۔ اس مسابقتی کارروائی میں منتخب ہونے والے طلبا کو انعامات سے نوازا گیا۔

رپورٹ: یوسف انصاری، میڈیا انچارج مرکز ادب وسائنس، رانچی، 4 مارچ 2015

بیدر: جامعہ نور الاسلام چٹگوپہ ضلع بیدر کرناٹک میں 21 فروری 2015 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی جانب سے بین الاقوامی یوم مادری زبان (International Mother Language Day) منایا گیا اس موقعے پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت جناب سید راشد علی پٹیل صدر ادارہ نے کی، جناب محمد ضیاء الدین صاحب اسپیشل تحصیلدار چٹگوپہ نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، محمد ضیاء الدین تحصیلدار نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ عالمی سطح پر مفکرین و ماہرین تعلیم بسیار تحقیق وجستجو کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ بچہ مادری زبان میں ہی بہت جلد پروان چڑھتا ہے اور اس کے لیے آگے صحیح راہیں کھلتی ہیں لہٰذا بچوں کو ان کی مادری زبان میں ہی ابتدائی تعلیم دلائی جائے۔ عوام میں مادری زبان کے تئیں رغبت بڑھانے کی غرض سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے ملک بھر میں اپنے تمام سنٹرس کو ہدایت دی تھی کہ وہ 21 فروری کو بین الاقوامی یوم مادری زبان منائیں۔ جناب اسلم میاں سکریٹری نے تمام شرکاء اجلاس کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، مولانا محمد تصدق ندوی، چٹگوپہ ضلع بیدر، کرناٹک، 25 فروری 2015

پونے: 21 فروری کو بین الاقوامی یوم مادری زبان دنیا بھر میں منایا گیا۔ اعظم کیمپس کے عابدہ انعامدار سینئر کالج، شعبۂ اردو نے بھی بڑے تزک واحتشام کے ساتھ بین الاقوامی یوم مادری زبان منفرد انداز میں منایا۔ شعبۂ اردو نے اس موضوع پر 'پوسٹر نمائش' کی اور اپنی مادری زبان میں ایک دستخطی مہم کی۔ اعظم کیمپس میں تعلیم حاصل کرنے والے

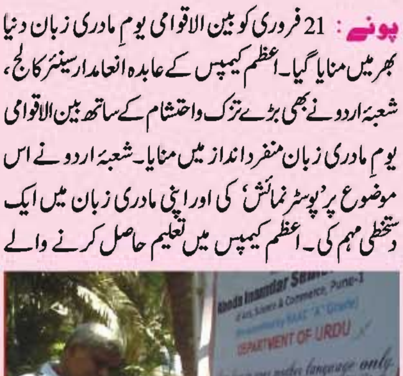

طلبا نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تقریباً بائیس زبانوں میں دستخط کیے گئے اس دستخطی مہم سے یہ بات سامنے آئی کہ اعظم کیمپس میں نہ صرف ہندوستان بلکہ افریقہ، سری لنکا، بنگلہ دیش، افغانستان، ایران، عراق، ناگالینڈ، نیپال، بھوٹان وغیرہ ممالک کے طلبا زیر تعلیم ہیں۔ ابتدا میں پوسٹر نمائش کا افتتاح وائس پرنسپل، شہلا بوٹ

کانکی نارہ میں منعقدہ یوم مادری زبان کا منظر

مدرسہ محمدیہ چھندواڑہ میں منعقدہ 'یوم مادری زبان' کا منظر

والا نے کی۔ فہمیدہ انصاری، چیئرمین، بورڈ آف اسٹڈیز اردو، یونیورسٹی آف پونے نے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے مادری زبان کی اہمیت پر زور دیا اور مہمان اعزازی جناب عبداللطیف انصاری، سابق چیئرمین، بورڈ آف اسٹڈیز اردو، یونیورسٹی آف پونے نے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ عالمی زبان کے ساتھ ساتھ مادری زبان ایک انسانی زندگی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ یہ خوشگوار تقریب صدر شعبۂ اردو، عظمیٰ تسنیم کے شکریے پر ختم ہوئی۔

پریس ریلیز، عظمیٰ تسنیم، صدر شعبۂ اردو، پونے، 2 مارچ 2015

کانکی نارہ: حمایت الغربا ہائی اسکول میں ایک شاندار و کامیاب یومِ عالمی مادری زبان کی تقریب کا انعقاد ہوا۔ تقریب کی صدارت کمپیوٹر سنٹر ہذا کے اردو ٹیچر محمد اسلم علی نے جبکہ تقریب کی نظامت متذکرہ کمپیوٹر سنٹر کے سینئر فیکلٹی کم سپروائزر شاہد علی نے بخوبی انجام دی۔ تقریب میں مہمانِ خصوصی اور مہمان مقرر کی حیثیت سے ہگلی محسن کالج کے سابق صدر اردو شعبہ پروفیسر ڈاکٹر شاہد اختر صاحب نے شرکت کی۔ دیگر مقررین میں اسکول ہذا کے ہیڈ ماسٹر جناب اختر حسین، ڈاکٹر رام نرائن بھارتی (ہیڈ آف ہندی ڈپارٹمنٹ)، عاطف جلیس (سینئر استاذ واین سی سی افسر) نے عالمی یومِ مادری زبان، قومی مادری زبان اور ریاستی مادری زبان کے حوالے سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سنٹر انچارج راقم الحروف (ابوالکلام انصاری) کی جانب سے سینٹر کے فعال رکن محمد تنویر راجا نے پروفیسر صاحب کو تحفہ نذر کیا نیز مہمانان و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: ابوالکلام انصاری، سنٹر انچارج سنٹر ہذا، 24 فروری 2015

کرنول: الرحمٰن ایجوکیشن سوسائٹی کرنول میں یوم مادری زبان کی اہمیت و افادیت پر تحریری و تقریری مقابلے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت حضرت مولانا سید ذاکر احمد صاحب رشادی نے کی۔ اس موقعے پر طلبہ و طالبات نے مادری زبان کی اہمیت و افادیت، مادری زبان میں تعلیم اور اسی طرح مادری زبان کا فروغ اور اردو ہماری مادری زبان ہے وغیرہ مختلف عنوانات پر اپنے خیالات پیش کیے جس میں ثنا (شاہینہ) شاہین بیگم کو انعام اوّل، عرفانہ کو انعام دوم اور بلقیس کو انعام سوم حاصل ہوا۔ صدرِ جلسہ کے ہاتھوں طالبات میں انعامات اور میڈل عطا کیے گئے۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

بذریعہ ڈاک: زین العابدین، الرحمٰن ایجوکیشنل سوسائٹی، کرنول، 21 فروری 2015

اورنگ آباد: خواجہ ناصر اردو پرائمری اسکول میں 'یوم مادری زبان' کا انعقاد عمل میں آیا۔ زبان تہذیب کی کلید ہے۔ زبان ہے تو نیک و بد کا شعور ہے۔ اپنی تہذیب شناخت اردو کی بقا، ترقی و ترویج کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو زبان میں اسکول کے ننھے منے طلبا نے نظمیں گیت، تقاریر بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیں۔ اس موقعے پر منعقدہ پروگرام کی صدارت صدر معلّمہ منور منہاج نے کی اور پروگرام خواجہ نور الصبا کی زیر نگرانی عمل میں آیا۔ نظامت کے فرائض آفرین شیخ اور تشکر کے کلمات سمیہ بیگم نے ادا کیے۔

روزنامہ 'اورنگ آباد ٹائمز'، اورنگ آباد، 25 فروری 2015

چھندواڑہ: قومی کونسل برائے فروغ زبان کی ہدایت کے مطابق مدھیہ پردیش کے مدرسہ محمدیہ جناردیو ضلع چھندواڑہ ایم پی میں 21 فروری کو بین الاقوامی یومِ مادری زبان منعقد کیا گیا جس میں اردو، ہندی، سندھی، مراٹھی، بنگالی اور گونڈی مادری زبان کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام میں مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر شیل پربھا کوسٹا سرکاری کالج جناردیو کی پرنسپل نے اپنی تقریر میں کہا کہ مادری زبان سے ہی ہماری ترقی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں پر مہارت حاصل کرنا ہوگی۔ یومِ مادری زبان کے موقعے پر سرکاری اسکولوں کے طلبا و طالبات نے تحریری مسابقہ میں حصہ لیا جنھیں بطورِ حوصلہ افزائی انعامات سے نوازا گیا۔ پروگرام کی نظامت جناب محمد طاہر ناظم مدرسہ محمدیہ جناردیو نے انجام دیے پروگرام میں سندھی زبان میں ڈاکٹر پرکاش اجوانی نے سوچھ بھارت ابھیان پر سندھی مادری زبان میں روشنی ڈالی۔

پریس ریلیز، محمد طاہر، چھندواڑہ، مدھیہ پردیش، 23 فروری 2015

کلکتہ: اس ملک کی آزادی کے لیے مسلمانوں نے بھی اتنی ہی قربانی دی ہے جتنی کسی اور قوم نے۔ اس میں رہنے والے برابر کے حصے دار ہیں، ہر کسی کو حق ہے کہ وہ اپنی مادری زبان اور کلچر کو بڑھاوا دینے کے لیے جدوجہد کرے۔ ان خیالات کا اظہار ریاستی وزیر دمکل جاوید احمد خان نے عالمی یوم مادری زبان کے حوالے سے کلکتہ ایران سوسائٹی میں انجمن ترقی اردو ہند مغربی بنگال کی جانب سے منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو اس کا جائز مقام دلوانے اور اسے روزگار سے جوڑنے کے لیے ہمیں مل کر عملی کوشش کرنی ہوگی صرف جلسے جلوس اور سیمینار کرنے سے کام نہیں بنے گا۔ اس موقعے پر دیگر احباب نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتہ، 22 فروری 2015

کلکتہ: 21 فروری یوم عالمی مادری زبان کے طور پر منایا جاتا ہے اس دن زبان سے محبت رکھنے والے اس کے تحفظ و فروغ کا عہد لیتے ہیں۔ محبان اردو نے بھی اس موقعے پر اپنی اردو دوستی کا اظہار بالکل نئے ڈھنگ سے کیا۔ جس سے خضر پور کے عوام متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکے۔ ڈنٹ مشن روڈ (خضر پور) پر واقع اردو دوست نامی ایک رضا کار تنظیم نے فیاض احمد خان کی قیادت میں 400 سے زائد اردو اخبارات پورے علاقے میں تقسیم کیے۔ اس موقعے پر بیداری پیدا کرنے کے لیے لوگوں میں پمفلٹ بھی تقسیم کے گئے جس میں اپنی مادری زبان اردو کو ترقی دینے، اردو کو روزگار سے جوڑنے اور نئی نسل کو اردو سے روشناس کرانے کی اپیل کی۔ علاقائی عوام نے تنظیم کی کاوشوں کی ستائش کرتے ہوئے ان کی زبردست حمایت کا یقین دلایا۔ راشد احمد راشد، شوکت علی صدیقی، عبدالصمد رضوی سمیت دس نفری گروپ نے ڈنٹ مشن روڈ، ڈاکٹر سدھیر باسو روڈ، ابراہیم روڈ، اقبال پور روڈ، مومن پور درگاہ کمیٹی، مولانا محمد علی روڈ اور بنگالی شاہ وارثی لین سمیت پورے علاقے میں گاڑی کے ذریعے مائیک لگا کر لوگوں میں اپنی زبان کے تعلق سے بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اپنی اپیل میں وفد نے کہا کہ اگر اردو زبان کی ترقی چاہتے ہیں تو ہمیں اردو اخبارات کے ساتھ ساتھ رسائل و جرائد خرید کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ماضی میں اردو تحریک کے ایک سپاہی راشد احمد راشد نے فیاض احمد خان کے جذبے کو سلام کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اردو زبان کے حق میں عملی خدمات ادا کی ہیں۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' کولکاتہ، 22 فروری 2015

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

23واں عالمی کتاب میلہ

نئی دھلی: 23ویں نئی دہلی عالمی کتاب میلے کا افتتاح ہفتہ کو نئی دہلی کے پرگتی میدان میں فروغ انسانی وسائل کی

دہلی عالمی کتاب میلے کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزیر اسمرتی ایرانی

مرکزی وزیر اسمرتی زبین ایرانی نے کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ہندی کے معروف ادیب نریندر کوہلی تھے، افتتاح پرگتی میدان کے ہنس دھونی تھیٹر میں صبح 11 بجے کیا گیا، اس کا اہتمام نیشنل بک ٹرسٹ کی جانب سے کیا گیا، افتتاح کے فوراً بعد کتاب میلہ عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔ پروگرام کے آغاز میں دہلی یونیورسٹی کے فیکلٹی آف میوزک اینڈ فائن آرٹ کے طلبا نے قومی ترانہ پیش کیا۔ اس موقعے پر سنگاپور کے ہائی کمیشنر لی ٹنگ کنگ اور ساؤتھ کوریا کے امبیسڈر رلی چنگ جو نے بھی شرکت کی۔ مہمان خصوصی ملک کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس سال سنگاپور کو مدعو کیا گیا تھا اور اس مرتبہ فوکس ملک کو جگہ دینے کی شروعات بھی کی گئی۔ یہ اعزاز اس مرتبہ ساؤتھ کوریا کو دیا گیا۔ ساؤتھ کوریا اور سنگاپور کا ایک بہت بڑا وفد اپنی کتابوں کے ساتھ شامل ہوا۔ اس بار کا تھیم سوریودیہ رکھا گیا تھا۔ اپنے خطاب میں مہمان خصوصی نریندر کوہلی نے ہندی ادب اور ہندوستانی کتاب کے ساتھ ہورہے استحصال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ریلوے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں، ایئرپورٹ، بس اسٹینڈ اور میٹرو اسٹیشنوں پر بک اسٹال نہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بھی کتابیں پڑھنے سے محروم رہ جاتے ہیں جنھیں کتب بینی کا شوق ہے۔ انھوں نے یہ بھی درخواست کی کہ ان اسٹالوں پر صرف ہندوستانی زبان کی کتابیں ہی رکھی جائیں۔

وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اسمرتی ایرانی نے اپنے خطاب میں کہا کہ میں کوہلی صاحب کا خطاب غور سے سن رہی تھی اور یہ واقعی ضروری ہے اس لیے میں نے ایجوکیشنل سیکریٹری کو کوہلی صاحب کی تمام تجاویز کو حل کرنے کے لیے منصوبہ تیار کرنے کو کہا ہے۔ 14 فروری سے شروع ہوکر 22 فروری تک چلنے والے اس میلے میں تقریباً 31 زبانوں کی کتابیں اسٹالوں پر نظر آئیں اور اس مرتبہ دنیا کے 12 ممالک کے صحافیوں، ادیبوں اور پبلشروں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 فروری 2015

جامعہ میں انٹرنیشنل ایجوکیشن کانفرنس کا انعقاد

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقدہ بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس 2015 سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر اقلیتی امور نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ آزادی کے وقت ہمارے ملک میں 20 یونیورسٹیاں اور 500 کالجز تھے جن میں 2.1 لاکھ طالب علم پڑھتے تھے جنگ آزادی کے عظیم

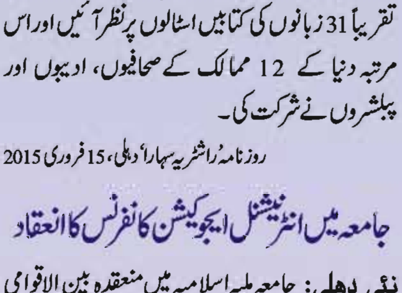

مجاہد اور ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے اس چیلنج کو قبول کیا اور تعلیمی پسماندگی، قدامت پسندی اور نااتفاقی کے خلاف ایک مہم کا آغاز کیا جس کا ہمارے ملک کو اس وقت سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ امام الہند مولانا آزاد کو یہ بھی احساس تھا کہ آزادی کا ہمارا تصور تب تک نامکمل رہے گا جب تک ہم اسے لبرل، سیکولر تعلیم سے آراستہ نہ کرلیں۔ گزشتہ سات دہائیوں میں آزادی کے وقت کے اعداد و شمار کے مقابلے یونیورسٹیوں کی تعداد میں تقریباً 35 گنا اضافہ ہوا ہے، کالجز کے معاملہ میں 70 گنا اور اعلیٰ تعلیم کے باقاعدہ نظام میں طلبہ کے داخلوں میں تقریباً 100 گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ ملک بھر میں 700 سے زیادہ یونیورسٹیاں 35000 سے زیادہ کالجز ہیں جن میں 25 ملین سے زائد طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ آزادی کے وقت ہماری بنیادی خواندگی کی سطح تقریباً 12 فیصد تھی جو آج 1.2 بلین سے زائد آبادی کی بڑھ کر تقریباً 75 فیصد ہوگئی ہے۔ محترمہ نجمہ ہپت اللہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کانفرنس کو کامیاب قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کانفرنس کا انعقاد ایک ایسے موقعے پر کیا جارہا ہے جب ہم تکنیکی انقلاب کے موڑ پر ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 فروری 2015

لکھنؤ یونیورسٹی میں دوروزہ عالمی سیمینار

لکھنؤ: لکھنؤ میں بین الاقوامی سیمینار بیاد استاد پروفیسر ولی الحق انصاری کا اہتمام بعنوان احوال آثار عصر عرفی شیرازی شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کی جانب سے اے پی سین ہال لکھنؤ یونیورسٹی میں منعقد کیا گیا۔ یہ سیمینار چار سیشن میں چلا۔ اس موقعے پر مقامی اور بیرونی ماہرین عرفی نے گراں قدر مقالے پیش کیے اور شعبہ سے وابستہ ریسرچ اسکالر نے بھی اظہار خیال کیا۔ سیشن کے دوسرے مرحلے کی صدارت ڈاکٹر سید احسن الظفر اور ڈاکٹر حمیرہ قادری نے کی۔ جس میں چھ مقالے پیش کیے گئے۔ تیسرا اجلاس ڈاکٹر سید احسن الظفر کی صدارت سے شروع ہوا جس میں سکینہ خان نے سترہویں صدی کے معروف شاعر عرفی شیرازی کا تعارف کرایا اور ڈاکٹر شبیب انور علوی نے عرفی شیرازی کی شاعری میں جنت کے خوشنما پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

سیمینار کا چوتھا مرحلہ دوپہر ڈھائی بجے سے شروع ہوکر ساڑھے پانچ بجے اختتام پذیر ہوا۔ اس میں ڈاکٹر ایس مظاہر علی رضوی اور ڈاکٹر سید احسن الظفر سیشن کے چیئرمین رہے۔ اس سیشن میں چار مقالے پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 13 فروری 2015

جے پور میں چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا منظر

جے پور میں چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس

جے پور: یکم مارچ سے 4 مارچ 2015 تک راجستھان سینٹر، شعبۂ اردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی جے پور اور کمپیریٹو لٹریچر ایسوسی ایشن آف انڈیا کے باہمی اشتراک سے ’جنوبی ایشیا میں تہذیبی فنی سماجی سیاسی تحریکات: تقابلی تناظر‘ کے موضوع پر چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ یکم مارچ کو کانفرنس کی افتتاحی تقریب میں نیدرلینڈ کے پروفیسر ہینس برٹنس نے بطور چیف گیسٹ شرکت کی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر جینسی جیمس نے کی۔

راجستھان اسٹڈی سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر کرشن گوپال شرما نے اپنے استقبالیہ خطبے میں ملک کی مختلف جامعات سے آئے ہوئے اساتذہ، اسکالرس اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے مہمانان کا استقبال کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ ادبیات کا تقابلی مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور باہمی افہام وتفہیم کی فضا بھی ہموار ہوتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کانفرنس میں امریکہ، بیلجیم، نیوزی لینڈ، فرانس، جرمنی اور پاکستان جیسے کئی ممالک سے تقریباً 250 نمائندے شرکت کررہے ہیں۔ تقریب کی صدارت کررہیں پروفیسر جینسی جیمس نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ جنوبی ایشیا میں سماجی، سیاسی اور ادبی تحریکات تعمیری ادب کے نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہیں۔ مہمانِ خصوصی کے بطور دہلی سے تشریف لائے نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام نے جنوبی ایشیا خصوصاً ہندو پاک میں لسانیات کے تناظر میں ہندی اور اردو کے اثرات پر نہایت بااثر اور مدلل خطبہ پیش کیا، انھوں نے کہا کہ جتنی زبانیں ہمارے ملک میں بولی جاتی ہیں اتنی دنیا کے کسی خطے میں نہیں بولی جاتیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں ہندی اور اردو کا تعمیری ادب محرک اور موثر نہ ہو۔ کینڈا سے تشریف لائے ماہر معالج اور اردو کے معروف نقاد اور ادیب ڈاکٹر تقی عابدی نے ادبیات کے تعلق سے اپنے تجربات کا اظہار کیا اور اہل زبان وقلم کو اپنے پیشے کے تئیں مخلص اور دیانت دار رہنے کے مشوروں سے بھی نوازا کلائی (CLAI) کے سکریٹری پروفیسر چندر موہن نے اپنی تنظیم کی سرگرمیوں کی ایک رپورٹ پیش کی اور اس کے فعال ممبران کا تعارف کرایا۔ تقریب کے اختتام پر شعبۂ اردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی جے پور کی صدر ڈاکٹر ثریا خانم نے تمام مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض شعبۂ تاریخ کی ڈاکٹر نکی چترویدی نے انجام دیا۔

کانفرنس کے چاروں دن انگریزی، اردو، ہندی میں تحقیقی مقالے پیش کیے گئے۔ جنوبی ایشیا میں قومیت کا تصور، ماحولیات، فلم، فیمنزم، مذہب اور مادی ارتقا کے تہذیب پر اثرات کانفرنس کے اہم سیشنس کے موضوعات تھے۔ 4 مارچ کو کانفرنس کی اختتامی تقریب عمل میں آئی جس کے چیف گیسٹ ساہتیہ اکادمی کے سابق سکریٹری، اہم نقاد اور شاعر پروفیسر کے سچد انند تھے۔ انھوں نے قومیت کا ذکر کرتے ہوئے ٹیگور اور گاندھی کے نظریات کو پیش کیا۔ موصوف کے خطبے کے بعد CLAI کے ممبران کی 7 سات اہم کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

اختتامی تقریب کی صدارت انگریزی کی معروف مصنفہ پروفیسر جسبیر جین نے کی۔ انھوں نے راجستھان اسٹڈی سینٹر، شعبہ اردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی جے پور اور کلائی کے ذمے داران کو کامیابی کے ساتھ کانفرنس کے انعقاد پر مبارکباد پیش کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر ثریا خانم، صدر شعبۂ اردو و فارسی راجستھان، یونیورسٹی جے پور، 12 مارچ 2015

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام محفل افسانہ

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیراہتمام اکادمی کے

آڈیٹوریم میں ایک محفل افسانہ کا انعقاد کیا گیا جس میں عصر حاضر کے ممتاز افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے پیش کیے۔ پروفیسر ابن کنول نے ’مٹی کی گڑیا‘ اور ’نیا درندہ‘ کے عنوان سے دو کہانیاں پیش کیں۔ ذکیہ مشہدی نے ’ہواؤں پر لکھی لکھائی‘، مشرف عالم ذوقی نے ’اڑنے دو ذرا‘، پروفیسر طارق چھتاری نے ’آسمان منزل‘ کے عنوانات سے افسانے پیش کیے۔ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے محفل افسانہ کی نظامت کی اور تمام مندوبین کا خیر مقدم وشکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر پڑھے گئے افسانوں پر گفتگو بھی ہوئی جس میں سہیل انور، عبدالسمیع، ڈاکٹر ابوبکر عباد وغیرہ نے حصہ لیا۔

پریس ریلیز: مشتاق صدف، پروگرام آفیسر، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 27 فروری 2015

مصر میں عربی ناول نگاری

نئی دھلی: مصر میں ناول نگاری ہر دور میں ادبا کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک ہی نہیں، بلکہ اب بھی مصر میں ناول کو مرکزی حیثیت حاصل ہے مصر کی موجودہ ناول نگاری میں بھی مثبت اور تعمیری رجحانات کی عکاسی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان

خیالات کا اظہار جامعہ بنی سویف، قاہرہ کے پروفیسر اور الهيئة المصرية العامة للكتب کے جنرل ڈائرکٹر ڈاکٹر شریف الجیار نے کیا۔ وہ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی میں ’مصر میں عربی ناول نگاری‘ کے موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کررہے تھے۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں عربی ادبیات کے مایہ ناز صاحب اسلوب نثر نگاران مصطفیٰ لطفی المنفلوطی، طٰہٰ حسین، یحییٰ حقی، توفیق الحکیم، نجیب محفوظ، یوسف السباعی، احسان عبدالقدوس کے اہم ناولوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے موجودہ ناول نگاروں کا بھی تعارف کرایا۔ اس توسیعی خطبہ کی صدارت مصری سفارت خانہ کے کلچرل مشیر پروفیسر احمد بن عبدالرحمٰن نے کی۔ شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر ولی اختر ندوی نے جلسہ کی نظامت کی۔ شعبہ کے استاد ڈاکٹر نعیم الحسن اثری نے معزز مہمانوں اور شرکا وحاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 24 فروری 2015

مانو میں دوروزہ ورکشاپ کا منظر

اردو یونیورسٹی میں دوروزہ ورکشاپ

حیدرآباد: خود کا محاسبہ ترقی کا ضامن ہے۔ تعلیم کا مقصد ایسے طالب علموں کو پیدا کرنا ہے جو دنیا میں بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکیں اور اس مسابقتی دور میں اپنے صلاحیتوں کا لوہا منوا سکیں۔ ان خیالات کا اظہار جناب ظفر سریش والا، چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے شعبۂ تعلیم و تربیت اور نیشنل کونسل فار ٹیچر ایجوکیشن (این سی ٹی ای) نئی دہلی کے اشتراک سے منعقدہ دو روزہ اورینٹیشن ورکشاپ بعنوان 'تعلیم اساتذہ کے قواعد 2014، اصول و معیارات اور جدید نصابی خاکے' کے افتتاحی اجلاس میں بحیثیت مہمانِ خصوصی کیا۔ پروفیسر محمد میاں، وائس چانسلر نے صدارت کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں این سی ٹی ای کی جانب سے ورکشاپ کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا اور شرکا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی تلقین کی۔ اس ورکشاپ کے مہمانِ اعزازی پروفیسر سنتوش پانڈا، صدر نشین، این سی ٹی ای نے اپنے خطاب میں ٹیچر ایجوکیشن ریگولیشن 2014 سے شرکا کو روشناس کروایا اور کہا کہ اس نئے ریگولیشن میں 4 چیزوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، جس میں انفارمیشن اینڈ کمیونکیشن ٹکنالوجی، یوگا، جنسی مساوات اور شمولیاتی تعلیم شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے کلیدی خطبہ میں ٹیچر ایجوکیشن پرنسپل اور یونیورسٹیوں کے صدر شعبہ جات سے خواہش ظاہر کی کہ نئے تعلیمی سال سے وہ اپنے ٹیچر ایجوکیشن پروگرام کو نئے ریگولیشن کے مطابق ترتیب دیں۔

پریس ریلیز، عابد واسع پبلک ریلیشنز آفیسر، حیدرآباد، 13 فروری 2015

'نیا زمانہ اور غالب'

نئی دھلی: غالب اکادمی کے 46ویں یومِ تاسیس اور مرزا غالب کے 146 ویں یومِ وفات کے مناسبت سے غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین اولیا، نئی دہلی میں 'نیا زمانہ اور غالب' کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکادمی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ بیسویں صدی کے وسط میں حکیم عبدالحمید نے غالب اکادمی کے نام سے ایک سوسائٹی تشکیل دی جس میں کرنل بشیر حسین زیدی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، قاضی عبدالودود، مالک رام، کنور مہندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد فاروقی، پرتھوی چند، گوپی ناتھ امن، خواجہ غلام السیدین، ہمایوں کبیر، تارکیسوری سنہا اور وی کے کرشنا وغیرہ شامل ہوئے۔ ابتدا میں سوسائٹی کا رجسٹرار آفس ہمدرد منزل، لال کنواں دہلی 6 میں قائم ہوا۔ بعدازاں سوسائٹی کے صدر حکیم عبدالحمید نے مزار غالب سے ملحق 2 قطعہ اراضی 910 اسکوار یارڈ پر مشتمل پلاٹ خرید کر غالب اکادمی کی عمارت تعمیر کرائی جس کا افتتاح غالب صدی کے موقعے پر 22 فروری 1969 میں اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا۔ اس موقعے پر ابوبکر عباد نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب کی شاعری نے سائنسی مزاج کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر ظفر محمود نے 'دورِ حاضر میں کلامِ غالب کی معنویت' کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے 'غالب اور جدید ذہن' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ عبدالسمیع نے 'غالب کی تہذیبی شخصیت اور مطالعہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انجم عثمانی نے 'غالب اور الیکٹرانک میڈیا کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب کی مقبولیت میں گلزار کی فلموں کے ساتھ ساتھ ٹی وی سیریل اور دستاویزی فلموں کا بھی اہم رول رہا ہے۔ گنگا پرساد بمل نے کہا کہ غالب کے بیشتر اشعار میں سوال ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غالب کے کلام کا ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر قاضی

غالب اکادمی میں سیمینار کے دوران قاضی جمال حسین، وشال کھلر، جی آر کنول، قاضی افضال حسین، ظفر محمود و دیگر

افضال حسین نے صدارتی تقریر میں کہا کہ "نیا زمانہ اور غالب" بہت عمدہ عنوان ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب کی شاعری میں وہ صفات موجود ہیں جس کی وجہ سے ہر زمانے میں وہ قابل قبول ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 فروری 2015

جامعہ میں انقلاب اسلامی کی 36ویں سالگرہ کا انعقاد

نئی دھلی: ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد نہ صرف ہماری زبان، ہماری ادبیات میں نمایاں اور مثبت تبدیلیاں ہوئیں بلکہ اسلامی انقلاب نے ایران کے پورے سماجی ڈھانچہ کو متاثر کیا۔ بالخصوص فارسی ادبیات کے دونوں زمرے نثر و نظم کے پرانے قالب کو برقرار رکھتے ہوئے اسے اسلامی اقدار اور قرآنی تعلیمات سے سرشار کردیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی کے زیراہتمام

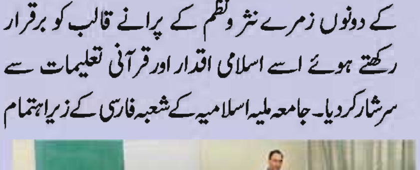

'فارسی ادب پر ایران کے اسلامی انقلاب کے اثرات' کے عنوان سے منعقدہ تیسرے توسیعی لکچر میں مقرر خصوصی اور ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی فولادی نے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ واضح رہے کہ ایران کے اسلامی انقلاب کی 36 ویں سالگرہ کے موقعے پر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس خصوصی خطبے کا اہتمام کیا تھا۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 فروری 2015

علامہ فضل حق خیرآبادی پر چار روزہ کانفرنس

پورٹ بلیئر: علامہ فضل حق خیرآبادی چیریٹیبل فاؤنڈیشن کے زیراہتمام ریاست کے مختلف حصوں میں چار روزہ کانفرنس منعقد کی گئیں اور علامہ فضل حق خیرآبادی کی عالمانہ و قائدانہ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ پہلا اجلاس ترنگا پارک پورٹ بلیئر میں منعقد کیا گیا جس میں مقامی مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم ہندو اور عیسائیوں کی کثیر تعداد شریک ہوئی۔ مولانا خوشتر نورانی مدیر اعلیٰ ماہنامہ 'جام نور' دہلی مہمان خصوصی تھے۔ مولانا عبدالرحیم مصباحی پرڑیاوی (مدرسہ عین الہدیٰ پورٹ بلیئر) نے علامہ اور انڈمان سے متعلق خطاب میں لوگوں سے خیرآبادی مشن کو ساری دنیا میں عام کرنے کی

اپیل کی، عنبر مصباحی نے علامہ کی قیادت و بصیرت کے تحت انھیں جنگ آزادی اور آزاد ہند کا 'عظیم محسن' قرار دیا اور کہا کہ علامہ مختلف علوم و فنون میں مہارت اور صفت قیادت کی خوبی کے ساتھ فن شاعری میں بھی امام وقت تھے، اپنی زندگی میں کم و بیش چار ہزار عربی اشعار کہے جن میں سے اکثر نعتیہ ہیں۔ مہمانِ خصوی مولانا خوشتر نورانی نے اپنے خطاب میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا۔ دوسرا اجلاس جنوبی انڈمان مایابندر میں منعقد ہوا، جس میں مندوبین نے کہا کہ ہم ہندوستانیوں نے ان کی جدوجہد کو وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ بجا طور پر حقدار ہیں۔ یہ انڈمان والوں کی خوش نصیبی ہے کہ اللہ نے علامہ فضل حق خیرآبادی کی آخری آرامگاہ کے طور پر انڈمان کو منتخب فرمایا جن کے مزار اقدس کی زیارت کے لیے ایک زمانہ بے تاب ہے اور مہمان مقرر ڈاکٹر خوشتر نورانی نے ہندو مسلم اتحاد کو واضح کرتے ہوئے علامہ فضل حق خیرآبادی کی ذات کو آئیڈیل قرار دیا۔ مولانا رضوان رضا قادری (مدرسہ فضل حق خیرآبادی مایابندر) نے کہا کہ جب 1857 میں پہلی جنگ آزادی چھڑی تو علامہ فضل حق خیرآبادی نے ایک دوراندیش مدبر کی طرح بہادر شاہ ظفر کو اہم اور کلیدی مشوروں سے نوازا پھر تاریخ دانوں کے نزدیک یہی جنگ 1947 میں ملی آزادی کی بنیاد بنی۔ انڈمان میں وقف بورڈ کی جانب سے علامہ فضل حق خیرآبادی کا عرس مبارک ہر سال 12 فروری کو منایا جاتا ہے۔ اس مناسبت سے تیسرے اجلاس کی عرفانی محفل منعقد ہوئی۔ آخری اجلاس پورٹ بلیئر کے نواحی خطہ سٹیورٹ گنج میں منعقد کیا گیا۔ مولانا رفیق ثقافی نے علامہ فضل حق خیرآبادی کے حوالے سے شافعی المذہب بھائیوں کی عقیدت اور شیخ ابوبکر احمد مسلیار کے والہانہ عشق پہ روشنی ڈالی۔ مفتی جاوید احمد عنبر مصباحی نے کہا کہ علامہ کا احسان صرف مسلمانوں پہ نہیں بلکہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی آزاد سرحدوں میں بسنے والا ہر شخص ان کے احسان تلے ہے جس کا شکر ہم پر واجب ہے۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 17 فروری 2015

دلی گلزار دہلوی کی نظروں سے

نئی دھلی: تہذیب اردو کے وارث اور دہلی کے معروف

شاعر و ادیب پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کہا ہے کہ اردو عالمی افق پر تابندہ ہے اور اس کو اب دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی لیکن مسلمانوں کو اس کے رسم الخط کی حفاظت کرنی ہوگی اور اس کے لیے اپنی نسلوں کی تربیت کرنی ہوگی۔ موصوف انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 'دلی گلزار دہلوی کی نظروں سے' پر اپنا خطبہ پیش کر رہے تھے۔ گلزار دہلوی نے اپنے دو گھنٹہ کے خطاب میں اجڑتی بستی دہلی، دہلی کے اولیا دین، دہلی کے سیاست داں، دہلی کے استاد شعرا و ادبا، حکما و صلحا، دہلی کی تہذیب، دہلی کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور دہلی کی تاریخ پر سیر حاصل بحث کی۔ پروگرام کا افتتاح صدر سراج الدین قریشی نے کیا۔ انھوں نے گلزار دہلوی کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ گلزار دہلوی اردو کی وہ تاریخ ہیں جس کے بغیر تہذیب دہلی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ پروگرام کی نظامت سکریٹری وصی احمد نعمانی نے کی۔ نائب صدر صفدر ایچ خان نے گلزار دہلوی کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 27 فروری 2015

جامعہ میں سجاد ظہیر یادگاری خطبہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سجاد ظہیر یادگاری خطبے کا منظر

نئی دھلی: منظر سلیم ترقی پسند تھے لیکن شاعری میں انھوں نے ترقی پسندوں کا بلند آہنگ اور نعرہ نما لہجہ اختیار نہیں کیا۔ منظر سلیم نے شروع سے ہی اپنی شاعری کو فرد یا ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کے یہاں جدید شعرا کی طرح ذاتی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا ذکر نہیں لیکن انھوں نے شعر کو اپنے ہی تجربات کا اظہار بنا کر اسے ایک داخلیت اور گہرائی بخش دی۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز نقاد اور دانشور شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سجاد ظہیر یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ بعنوان 'سجاد ظہیر کی یاد میں: کچھ منظر سلیم کے بارے میں' شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ منظر سلیم انسانی تجربات اور محسوسات کو سادہ لیکن موثر زبان میں بڑی خوبی سے بیان کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند حلقوں سے باہر بھی ان کی قدر و منزلت ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے سجاد ظہیر سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سجاد ظہیر کو میں اپنے لیے زیادہ بامعنی سمجھتا تھا۔ وہ 'ذکر حافظ' اور 'پگھلا نیلم' کے سجاد ظہیر تھے۔ اس توسیعی خطبے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ منظر سلیم کے بارے میں کچھ لکھا اور پڑھا نہیں گیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کھوئے ہوئے شاعر کا انتخاب کیا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر وہاج الدین علوی نے مہمان کا استقبال کیا اور شمس الرحمٰن فاروقی کا بھرپور تعارف طلبا کے سامنے پیش کیا۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے اس موقعے پر سجاد ظہیر کا تعارف پیش کیا۔ خطبے کے کنوینر پروفیسر شہزاد انجم نے اس جلسے کی نظامت کی۔ پروفیسر شہپر رسول نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 فروری 2015

اسلامی فن خطاطی کا ارتقا

نئی دھلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی جانب سے فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز کے اسمارٹ کلاس روم میں چوتھے توسیعی خطبے کا انعقاد بعنوان 'اسلامی فن خطاطی کا ارتقا' عمل میں آیا۔ اس خطبے کے مقرر ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ڈائریکٹر شعبۂ کتب شناسی ناگپور نے اپنے خطبہ کے دوران اسلامی فن خطاطی کی ابتدا اور ارتقا کے سلسلے میں کہا کہ اسلامی فن خطاطی کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں عرب خانہ بدوش قبیلے تجارت کے لیے نبطان کے علاقے میں جایا کرتے تھے۔ وہاں موجود آرمینی رسم الخط کے زیر اثر پنپنے والے نبطانی خط سے متاثر ہو کر عربوں نے اپنا رسم الخط اخذ کرنا شروع کیا۔ حرّان، ابن الجمال اور آس پاس کے علاقوں میں ملے مزاروں کی لوحوں سے ہمیں عربی رسم الخط کے ارتقا کے ثبوت ملتے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی میں کوفہ میں خطاطوں اور ماہر علم ہندسہ نے ایک خط کی بنیاد رکھی جو اپنی جائے پیدائش کی مناسبت سے خط کوفی کہلایا۔ ہندوستان کے عربی و فارسی کتبات میں ہمیں کوفی، نسخ، ثلث، محقق، رقاع، طغری اور نستعلیق نامی مشہور خطوط کے علاوہ کئی ایسے نمونے بھی ملتے ہیں جنھیں اسلامی خطاطی پر علاقائی اثرات کا غماز کہا جاسکتا ہے۔ ان میں بنگال، گجرات اور بہار کے خط قابل ذکر ہیں۔ آخر میں صدر شعبہ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے مہمان محترم کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 فروری 2015

چنڈی گڑھ میں اردو کے خدو خال

چنڈی گڑھ: مرکز کے زیرانتظام اور دو ریاستوں ہریانہ و پنجاب کے مشترکہ دارالحکومت چنڈی گڑھ میں اردو زبان و ادب کا بول بالا نہیں ہے۔ یہاں عام طور پر بول چال کی زبان ہندی و پنجابی ہے لیکن ان زبانوں میں اردو کی آمیزش ہے۔اس طرح چنڈی گڑھ والے اردو کی مٹھاس سے پوری طرح محروم نہیں ہوئے ہیں۔ چنڈی گڑھ میں قائم جہاں ایک دو مدارس اسلامیہ نے اردو کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دیا ہے، وہیں پڑوسی ریاست ہماچل پردیش نے بھی اس زبان کو جلا بخشی ہے۔ان خیالات کا اظہار شانتی دیوی میموریل انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج میں منعقد ’چنڈی گڑھ میں اردو کے خد و خال‘ کے موضوع پر منعقدہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کی پرنسپل ثمینہ انور نے کیا۔ثمینہ انور نے کہا کہ شانتی دیوی میموریل انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج چنڈی گڑھ اردو کی ترویج کے لیے حتی الامکان کوشش کررہا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ میں قائم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے مرکز میں چنڈی گڑھ واطراف کے طلبا وطالبات داخلہ لے کر دلچسپی کے ساتھ اردو سیکھ رہے ہیں۔ اس موقعے پر انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین ڈاکٹر ویندر کمار جندل، علامہ اقبال ایجوکیشنل سوسائٹی کے ڈائرکٹر حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر ابوحریرہ، ایڈووکیٹ منظور احمد اور مولانا فاروق اعظم وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ ’اردو ایکشن‘ بھوپال، 19 فروری 2015

اردو اکادمی کے زیر اہتمام ’نئے پرانے چراغ‘ کا منظر

اردو کا مطالعہ دماغی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرتا ہے

لکھنؤ: زبانیں سیکھنا نہ صرف علم میں اضافہ کرتا ہے بلکہ انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو بڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے تاہم کچھ زبانوں میں یہ قدرتی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دماغ کی افزائش کو تیزی سے بڑھانے میں مددگار ہوتی ہیں ان میں اردو کو بھی یہ مقام حاصل ہے۔لکھنؤ میں کی جانے والی ایک نئی تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اردو اشعار پڑھنے سے ایک طرف روحانی سکون ملتا ہے تو دوسری طرف یہ دماغی صلاحیتوں کو تیزی سے پروان چڑھانے میں مددگار ہوتی ہے۔

لکھنؤ میں سینٹر فار بائیو میڈیکل ریسرچ کے نیوروسائنس کے شعبہ میں کی گئی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ اردو شاعری بالخصوص ہم آواز ردیف اور قافیہ رکھنے والے اشعار دماغ کے مرکزی فنکشنز کو کنٹرول کرنے والے حصوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ اردو شاعری اور اچھی نثر کے مطالعہ سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت، اچھے اور برے میں تمیز، جذباتی عناصر، تناو سے جنگ، معلومات کے حصول اور مشاہدہ کرنے کی صلاحیتوں کی تیزی سے افزائش ہوتی ہے جب کہ اس کی بدولت یادداشت اور ذہنی صلاحیتوں میں کمی کا عمل سست ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ معذور بچوں میں سیکھنے کی صلاحیت کو بڑھانے میں بھی مددگار ہوتی ہے۔ ریسرچ کے بانی اتم کمار کا کہنا ہے کہ اس تحقیق کے نتائج مخصوص مضمون کے مطالعہ کے دوران ذہن کے پردے پر بننے والے نقشوں کی بنیاد پر حاصل کیے گئے ہیں، ان نقشوں کو ’فنکشنل میگنیٹک ریسوننس امیجنگ‘ تکنیک استعمال کرتے ہوئے ترتیب دیا گیا اور یہ ایسی تکنیک ہے جو دنیا بھر میں ذہن کی ساخت اور اس کے کاموں کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔اتم کمار کے مطابق اس عمل کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ زبان دماغ پر مخصوص پیٹرن تخلیق کرتی ہے جن کی دماغ میں موجود نیورون سے تعلق پیدا کرکے نشان دہی کی جاتی ہے جب کہ تمام زبان کا بنیادی پیٹرن ایک ہی جیسا ہوتا ہے لیکن جب انتہائی باریک بینی سے یعنی مائیکرو لیول پر مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس میں زبان کا اسکرپٹ اور بولنے کا لہجہ یا فونیٹک زبانوں کی خصوصیات کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے اس کے علاوہ زبانوں کی خصوصیات کو آرتھوگرافی یعنی نظر آنے والے حروف (گرافیم) اور لکھے گئے لفظوں کو آواز میں تبدیل کرنے کے عمل (فونیم) کے درمیان فرق کرکے بھی جانچا جاتا ہے۔

تحقیق کے دوران اس تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے زبانوں کو آسانی سے سمجھنے والی (ٹرانسپیرنٹ) اور مشکل سے سمجھ آنے والی (ڈیپ) میں تقسیم کیا گیا جس کے مطابق ہندی اور جرمن ٹرانسپیرنٹ جب کہ انگلش اور فرنچ ڈیپ زبان قرار پائی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو ’ڈیپسٹ‘ یعنی سب سے زیادہ گہری زبان قرار دی گئی کیوں کہ اس میں دیگر دو زبانوں کے مقابلے میں 2 اہم خصوصیات اس کے حروف کے لکھنے کا پیچیدہ طریقہ اور دوسرا لکھنے کی سمت اسے ڈیپسٹ بناتی ہیں۔اتم کمار نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی اس گہرائی کی بدولت اس کو پڑھنے والے کے دماغ کے غالب اوپری اور درمیانی حصے تیزی سے سرگرم ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے دماغ کے علم و آگہی رکھنے والے اہم ترین اجزا تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور خاص طور پر فیصلہ کرنے کی صلاحیت سب سے اہم ہے جو اچھے اور برے کرنے کی صلاحیت اور کسی بھی عمل کے نتائج کا ادراک پیدا کرتی ہے۔انھوں نے کہا کہ جو لوگ کئی زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں ان کی یادداشت بڑھاپے میں بھی تیزی سے کام کرتی ہے۔

دی ایشین ایج، لکھنؤ، 6 مارچ 2015

دھلی:

نئے پرانے چراغ

نئی دھلی: پرانی نسل کے چراغوں سے نئے چراغوں کو تجربات کے روغن حاصل کرنے چاہئیں تاکہ بعد کی نسلوں تک مسلسل روشنی کی ترسیل ہو سکے۔ان خیالات کا اظہار نئے پرانے چراغ کے افتتاحی جلسے میں صدارتی خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے اردو اکادمی کے قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں کیا۔وائس چیئرمین اردو اکادمی پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اردو اکادمی دہلی کا یہ مقبول ترین سالانہ پروگرام اپنی عمر کی 20 منزل پار کرکے آج 21 ویں منزل پر پہنچ چکا ہے۔انھوں نے کہا کہ اس پروگرام کا مقصد ہے کہ نوآموز قلمکاروں کے ذوق کو جلا دی جائے۔اس پروگرام میں 267 قلم کار شرکت کررہے ہیں۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ یہ چارروزہ تقریب جو نئے اور پرانے چراغ کے نام سے منعقد ہورہی ہے اس کو ’جشنِ اردو زبان و ادب‘ بھی کہا جاسکتا ہے۔اس افتتاحی اجلاس کی نظامت پروفیسر شہزاد انجم نے بحسن وخوبی انجام دیا۔سکریٹری اردو اکادمی انیس اعظمی نے پروگرام کے تعلق سے اپنے خیالات پیش کیے۔اس کے بعد سیمینار کے پہلے تحقیقی وتنقیدی اجلاس کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر سہیل انور نے کی۔اس اجلاس میں کئی مقالات پیش کیے گئے۔صدارتی

خطاب کے دوران ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے کہا کہ نئے اور پرانے چراغ کا یہ سیمینار جسے جشن بھی کہا گیا واقعی جشنِ اردو ہے۔ میں اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کے جس کارواں کو دیکھ رہا ہوں اس کا مستقبل یقیناً تابناک ہے۔ اس کے بعد تخلیقی اجلاس کا انعقاد ہوا جس کی صدارت معروف فکشن نگار پیغام آفاقی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض شاہنواز ہاشمی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس اجلاس میں کئی افسانے پڑھے گئے، آخر میں سکریٹری اردو اکادمی انیس اعظمی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

سیمینار کے دوسرے دن تحقیقی وتنقیدی اجلاس کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر محمد ذاکر اور پروفیسر صادق نے کی جبکہ نظامت مسرور فیضی نے کی۔ اس اجلاس میں کئی اہم مقالے پیش کیے گئے۔ بعدازاں صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر صادق نے عہد در عہد اردو ادب کے رجحانات و تحریکات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اب جو وسائل نوجوانوں کو دستیاب ہیں ان کا استعمال کرکے اردو ادب کے دامن کو بین الملسانی رجحاناتِ ادب سے مالامال کرسکتے ہیں۔ پروفیسر محمد ذاکر نے اپنے صدارتی خطبے میں ترجمے کے دوران پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمارے نئے لکھنے والوں کو بڑے بڑے لفظوں کے پیچھے بھاگنے سے گریز کرنا چاہیے اس کی جگہ اگر وہ الفاظ کو برتنے کا سلیقہ اپنے اندر پیدا کریں تو وہ زیادہ بہتر ہے۔ ظہرانے کے بعد تخلیقی اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے اور نظامت ڈاکٹر احمد امتیاز نے کی۔ اس نشست میں معروف فکشن نگاروں نے اپنے افسانے پیش کیے۔ پروفیسر اختر الواسع نے صدارتی خطاب میں کہا کہ جن نئے لوگوں نے افسانے پیش کیے وہ سب ان کے اپنے تجربات ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے ماریشس کی باشندہ نازیہ جفو کو بھی مبارکباد پیش کی کہ ماریشس کے معاشرے کی جو جھلک ان کے انشائیے میں تھی وہ ہمارے معاشرے سے الگ نہیں۔ اس سے قبل نئے پرانے چراغ کے پہلے روز دیر شام ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے اور نظامت شکیل جمالی نے کی جبکہ 37 شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔

سیمینار کے تیسرے دن پہلے تحقیقی وتنقیدی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر رضا حیدر اور ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی جبکہ نظامت کے فرائض عینین علی حق نے ادا کیے۔ اس موقع پر کئی مقالات پیش کیے گئے۔ مقالات کے بعد صدارتی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ حق تو یہ ہے کہ نئے اور پرانے چراغ کے دوران جتنا بڑا ادیبوں کا اجتماع ہوتا ہے پوری دنیا میں یہ ایک مثال ہے۔ بعد ازاں ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اس اجلاس میں پڑھے گئے تمام مقالات پر الگ الگ رائے دی۔ تحقیقی اجلاس کی صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی اور پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے کی۔ اس نشست میں کل 8 افسانے پڑھے گئے۔ 'نئے پرانے چراغ' کے تحت دوسری شعری نشست گلزار دہلوی کی صدارت میں منعقد کی گئی جس میں 36 شعرا نے شرکت کی۔

اردو اکادمی کے 4 روزہ ادبی پروگرام 'نئے پرانے چراغ' کے آخری دن تحقیقی وتنقیدی اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور محترمہ زبیدہ حبیب نے کی جبکہ نظامت انس فیضی نے کی۔ اس اجلاس میں کئی پر مغز مقالے پڑھے گئے۔ صدارتی خطبے میں زبیدہ حبیب نے گیارہ مقالوں کا نام بہ نام ذکر کرتے ہوئے ان میں سے بیشتر مقالوں کی تعریف کی اور مقالہ نگاروں کو انداز پیشکش پر محنت کرنے کی تلقین کی۔ بعدازاں پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ اقبال کو خاطر میں لائے بغیر نہ تو کوئی محقق ہوسکتا ہے اور نہ ناقد۔ انھوں نے کہا کہ جدید ادب کا میں منکر نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ کلاسیکی ادب کے بغیر بات بنتی نہیں۔ تخلیقی اجلاس کی صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے کی۔ اس اجلاس میں سات تخلیقات پیش کی گئیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ نئے پرانے چراغ سے دہلی میں اردو ادیبوں، شاعروں نیز نئے ناقدوں کی تربیت نہایت باوقار طریقے سے ہوئی ہے۔ پروفیسر کریم نے اپنی گفتگو میں افسانہ، کہانی اور اس کی تکنیک پر نہایت پرمغز نکات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 تا 4 مارچ 2015

دہلی میں یومِ غالب کا اہتمام

نئی دهلی: غالب کے یومِ وفات کے موقعے پر انجمن ترقی اردو دہلی شاخ، غالب انسٹی ٹیوٹ اور غالب اکادمی کے زیراہتمام یوم غالب کا اہتمام کیا گیا۔ جس کا افتتاح کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب کی حیات وشاعری پر اب تک بے شمار کتابیں آچکی ہیں مگر آج بھی ہم غالب کے کلام میں نئی تعبیریں اور نئے معانی تلاش کررہے ہیں۔ غالب کے فارسی کلام

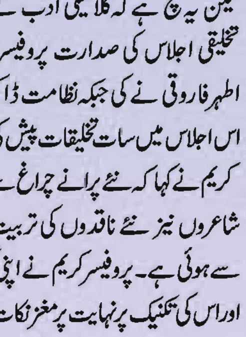

پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ غالب کا فارسی کلام ہمیشہ ہمیں دعوتِ غور وفکر دیتا رہتا ہے۔ غالب کے فارسی کلام کا ذخیرہ اردو کلام سے کافی زیادہ ہے مگر فارسی کلام میں جتنی تحقیق وتنقید ہونی چاہیے ابھی تک نہیں ہو پائی ہے۔ انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے جنرل سکریٹری شاہد ماہلی نے مزار غالب پر منعقد ہونے والے یوم غالب کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر، معروف ادیب سلیل مشرا، غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 فروری 2015

دہلی یونیورسٹی میں ادبی نشست کا انعقاد

نئی دهلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے میری پرانی وابستگی رہی ہے۔ شعبہ کے اس پروگرام میں آکر مجھے بہت خوشی محسوس ہورہی ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، رشید حسن خاں جیسی اہم شخصیات اسی شعبے سے وابستہ رہی ہیں جس سے اس شعبے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کثیر تعداد میں طلبہ کے ان پرگراموں میں شرکت اردو زبان کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ ان خیالات کا اظہار صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام نے کیا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کی ترویج وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اردو کو نئی تکنیک سے جوڑ کر اردو کو جدید دور کے اعتبار سے ترقی دے رہے ہیں۔ اس موقع پر مہمان خصوصی پروفیسر خواجہ محمد اکرام اور ہریانہ اردو اکادمی کے جوائنٹ ڈائرکٹر شمس تبریزی کا پھولوں کے گلدستہ سے استقبال کیا گیا۔ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں بزم ادب کے زیراہتمام منعقدہ اس ادبی نشست میں شمس تبریزی، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر ابن کنول، عارف اقبال اور توصیف احمد نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس موقعے پر معروف صحافی وشاعر مرحوم دیوان تصور کے شعری مجموعے 'گل بداماں' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ساتھ ہی شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر چند شیکھر نے اپنے والد دیوان تصور کا ایک مضمون بھی پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 فروری 2015

اردو زبان اور مستقبل کے امکانات

نئی دهلی: عہد حاضر میں اردو زبان کے فروغ کے امکانات بہت زیادہ ہیں مگر اس کے ساتھ کچھ چیلنج بھی ہیں جن سے مقابلے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار

جشن نور کے عنوان سے کل ہند مشاعرے کا منظر

رحمانیہ نیشنل فاؤنڈیشن کے زیراہتمام قومی سیمینار ’اردو زبان اور مستقبل کے امکانات‘ میں پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی سابق صدر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے صدارتی تقریر میں کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ان کا اردو سے دیرینہ رشتہ ہے اور انھوں نے چھ برس تک عربوں کو اردو سکھانے کا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان قیصر نے اردو زبان کے عالمی مسائل پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ جبکہ ڈاکٹر عزیر اسرائیل استاذ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے سائبر ورلڈ اور اردو کے موضوع پر ایک پرمغز مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر اشوک کمار شرما نے اردو زبان کے تعلق سے اپنے دلی لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے حال ہی میں اردو زبان سیکھی ہے۔ روزنامہ ہمارا سماج کے نیوز ایڈیٹر عامر سلیم خاں نے پرنٹ میڈیا میں اردو زبان کے مسائل اور وسائل پر اظہار خیال کیا اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر توقیر راہی نے دینی مدارس اور اردو کے حوالے سے مقالہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ساری دنیا میں اہل مدارس ہی اردو کے فروغ کے لیے اصل کام کررہے ہیں۔ صحافی غوث سیوانی نے سیمینار کی نظامت کی اور الیکٹرانک میڈیا میں اردو کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ سیمینار کے اخیر میں رحمانیہ نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر محمد رفیق نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 2 مارچ 2015

آندھرا پردیش:

آزاد ڈسکورس فورم کی نشست

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ اردو میں ’آزاد ڈسکورس فورم‘ کی ادبی نشست کا حال ہی میں انعقاد عمل میں آیا، جو تین نشستوں پر مشتمل تھا۔ پہلی نشست کی صدارت عبدالقدوس نے کی، جس میں غلام مصطفیٰ نے ’اپنے ہی گراتے ہیں نشیمن پہ بجلیاں‘ کے عنوان سے اور نہال احمد نے ’وہاب اشرفی اور ان کے کارنامے‘ کے عنوانات سے مقالے پڑھے۔ دوسری نشست کی صدارت محمد زبیر نے کی، جس میں انشائیے اور افسانے پڑھے گئے۔ آخر میں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کے آخر میں اساتذۂ کرام نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ پروفیسر نسیم الدین فریس نے صدارت کی۔ توصیفہ عاشق نے ہدیۂ تشکر پیش کیا، جبکہ ریاض احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ’آزاد ڈسکورس فورم‘ کا قیام 2 جون 2014 کو بورڈ آف اسٹڈیز شعبۂ اردو کی میٹنگ میں منظوری کے بعد عمل میں آیا جس کا باقاعدہ افتتاح پروفیسر خالد سعید کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ ’آزاد ڈسکورس فورم‘ کا مقصد طلبا میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں پیدا کرنا اور ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو منظرعام پر لانا ہے۔ روزنامہ ’جدید خبر‘ دہلی، 18 فروری 2015

اقلیتوں کی تعلیمی ترقی: پالیسی، اقدامات اور اثرات

حیدرآباد: تہذیبی تنوع اور کثرت میں وحدت ہی ہندوستان کی طاقت ہے۔ یہ ہماری کمزوری نہیں ہے۔ 21 ویں صدی ہندوستان کی ہے۔ تاہم ہر سطح پر شمولیاتی ترقی کے بغیر ہندوستان کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر امیتابھ کنڈو، ڈائرکٹر، سنٹر فار اسٹڈی آف ریجنل ڈیولپمنٹ وصدر نشین مابعد سچر جائزہ کمیٹی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ایک قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں بحیثیت مہمانِ خصوصی کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ دو روزہ سیمینار ’اقلیتوں کی تعلیمی ترقی: پالیسی، اقدامات اور اثرات‘ کا اہتمام شعبۂ سیاسیات ونظم ونسق عامہ، اردو یونیورسٹی نے وزارت اقلیتی امور، حکومت ہند کے تعاون سے کیا تھا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد، پرووائس چانسلر نے کی۔ ڈاکٹر فضل غفور، صدر مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی، کالی کٹ، کیرالا مہمانِ اعزازی تھے۔ پروفیسر کنڈو نے مزید کہا کہ طبقاتی اور علاقائی سطح پر اگر عوامی امنگوں کی تکمیل نہیں کی گئی تو ہندوستان کی ترقی متاثر ہوگی۔ ڈاکٹر فضل غفور مہمان اعزازی نے اپنی تقریر میں شمولیاتی ترقی کے ’کیرالا نمونہ‘ پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس پر مل کے دیگر حصوں میں عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کیرالا کی تاریخ اور کثرت پر مبنی آبادی کی ہیئت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ریاست کے سماج میں اقلیت اور اکثریت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ مہمانِ اعزازی نے کیرالا کی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو حاصل ہونے والے فوائد کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ انھوں نے حکومت ہند کی تحفظات پالیسی اور ریاست میں مختلف سرکاری ایجنسیوں کی جانب سے اس پالیسی پر کامیاب عمل آوری کو ان فوائد کے استفادے سے منسوب کیا۔ مسلم برادری کی ترقی کے لیے سچر کمیٹی نے جو سفارشات پیش کی تھیں ان پر کیرالا اور مغربی بنگال ہی میں مؤثر عمل آوری کی گئی۔ ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ کسی بھی ادارے کی کامیابی کے ساتھ تنظیم کی زبردست اہمیت ہے۔ انھوں نے ایک اہم موضوع پر سیمینار کے انعقاد پر منتظمین کو مبارکباد دی۔ روزنامہ ’منصف‘ حیدرآباد، 11 فروری 2015

اردو ادب اور بچوں کی شخصیت سازی

کڈپہ: جامعہ وینکٹیشورا کے ایسوسی ایٹ پروفیسر نے کہا کہ اردو ادب میں وہ قوت وتاثر ہے کہ لوگوں اور ان کے دلوں کو متاثر کرسکتا ہے بالخصوص بچوں کی شخصیت سازی میں ادب اطفال کا اہم رول ہے۔ 29 جنوری 2015 کی شام کڈپہ میں رایل سیما اردو رائٹرس فیڈریشن کے دفتر میں ’اردو ادب- بچوں کی شخصیت کی نشو ونما‘ کے عنوان پر انھوں نے لکچر دیا۔ ڈاکٹر اقبال خسرو قادری نے کہا کہ ریاست آندھرا پردیش کے رایل سیما علاقہ میں ستار فیضی واحد ایسی شخصیت ہیں جو بچوں کے ادب پر محنت کررہے ہیں اہل اردو ان کی خدمات سے واقف ہیں۔

بذریعہ ڈاک: ستار فیضی، 29 جنوری 2015

اتر پردیش:

جشن نور کے عنوان سے کل ہند مشاعرہ کا اہتمام

امروهه: بزمِ زندہ دلانِ امروہہ اور انجمن ترقی اردو، اتر پردیش کے زیراہتمام نور امروہوی کی امروہہ آمد پر جشن نور کے عنوان سے ایک کل ہند مشاعرہ ٹاؤن ہال، امروہہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرہ کی شمع روشن انجمن ترقی اردو، کے صدر اور ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کی۔ جبکہ مشاعرہ کی صدارت امروہہ کے سینئر شاعر متین امروہوی نے اور نظامت کے فرائض نوجوان شاعر سید شیبان قادری نے انجام دی۔ مشاعرہ میں نور امروہوی کو ان کی شعری خدمات کے سلسلے میں ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کے ہاتھوں سفیر ادب ایوارڈ سے نوازا گیا جبکہ چیئرمین افسر پرویز کو فخر امروہہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ امروہہ ابتدا سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ بلکہ دبستان دہلی اور لکھنؤ کے درمیان واقع ہونے پر اسے اردو زبان وادب کا تیسرا دبستان کہہ دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ نور امروہوی نے کہا کہ اپنے شہر میں جو پیار ومحبت مجھے ملا ہے اس کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، 20 فروری 2014

14 ویں قومی اردو صحافتی کانفرنس کے افتتاح کا منظر

14 ویں قومی اردو صحافتی کانفرنس

علی گڑھ: انڈین اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام کرشنا نجلی ناٹیہ شالا میں 14 ویں قومی اردو صحافی کانفرنس منعقدہ کی گئی۔ کانفرنس کا افتتاح مہمان خصوصی ڈی آئی جی گووند اگروال، انچارج ڈی ایم اودھیش تیواری، دینک جاگرن کے سینئر یونٹ منیجر اجے تومر، کانگریس لیڈر رویک بنسل وغیرہ نے کیا۔ مہمان خصوصی ڈی آئی جی گووندا اگروال نے کہا کہ اردو سادہ، نرم، مہذب اور شیریں زبان ہے جو معاشرے کے ہر طبقے میں بولی جاتی ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ اردو ختم ہوتی جارہی ہے تو وہ غلط ہیں۔ آج ہندی بولنے والے لوگ بھی عام بول چال میں اردو الفاظ کا بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے پروگرام کے کنوینز مبین خاں کے کاموں کی کھلے دل سے تعریف کی۔ اس سے پہلے پروگرام کا افتتاح دیپ جلا کر اور تلاوت قرآن پاک سے کیا گیا۔ نظامت مشرف حسین محضر اور بصیر الحسن وفا نگی نے مشترکہ طور پر کی۔ کانفرنس میں شہر مفتی خالد حمید نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کانفرنس میں اتنی بڑی بھیڑ دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ لوگ آج بھی اس زبان کے کتنے قریب ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 فروری 2015

چکبست کے فن اور شخصیت پر مذاکرہ

لکھنؤ: مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن کے تحت پنڈت برج نارائن چکبست لکھنوی کے فن اور شخصیت پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی، نظامت کے فرائض ڈاکٹر ہارون رشید نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ٹی این گپتا ایڈوکیٹ اور ملک زادہ جاوید نے شرکت کی۔ دیگر مقررین میں چودھری شرف الدین، انجینئر محمد احمد فاروقی، ڈاکٹر شمیم صدیقی اور ڈاکٹر اسرار الحق قریشی کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے چکبست کے حوالے سے گراں قدر گفتگو کی۔ فاؤنڈیشن کے بانی جنرل سکریٹری وصی صدیقی نے کلمات استقبالیہ پیش کیا۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ ہم کسی شخصیت کو اس لیے یاد کرتے ہیں کہ اس نے زندگی کو کس طرح جیا ہے اور زندگی کو اور ادب کو کیا دیا۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے کہا کہ چکبست کو نظموں کا شاعر کہا جاتا ہے لیکن ان کی غزلیہ شاعری جو پچاس غزلوں پر محیط ہے ان کی نظموں کے مقابلہ کہیں سے کمزور نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسرار الحق قریشی نے چکبست کی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی نظمیں لطافت بیان اور فنی خوبیوں سے مرصع ہیں۔ پروگرام کے دوسرے حصہ میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔

پریس ریلیز: ہارون رشید، لکھنؤ، 12 فروری 2015

'موجودہ دور میں تعلیم کی اہمیت اور ذمے داری'

علی گڑھ: گنگا جمنی تہذیب کے شہر علی گڑھ کی نمائش کے مکتا وکاس منچ میں اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن اتر پردیش علی گڑھ کی جانب سے اردو ٹیچرس سیمینار بعنوان 'موجودہ دور میں تعلیم کی اہمیت اور ذمے داری' منعقد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت ڈاکٹر مفتی زاہد علی چیئرمین شعبہ دینیات سنی، اے ایم یو علی گڑھ نے کی اور مہمانِ خصوصی ممتاز صحافی فیاض رفعت خان شریک رہے۔ مہمانانِ ذی وقار کے طور پر محمد خالد حمید صاحب، مفتی شہر علی گڑھ ڈاکٹر رکشپال سنگھ، آفاق احمد، محترمہ آمنہ ملک پرنسپل عبداللہ گرلس، ہائی اسکول تھیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کہا کہ ہر اردو ٹیچر کو کم از کم ایک اردو کا اخبار خریدنا چاہیے ڈاکٹر مفتی زاہد علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو زبان سے ہماری محبت اب صرف دکھاوے کے لیے رہ گئی ہے۔ مہمانِ خصوصی فیاض رفعت خان نے کہا کہ اگر اردو زبان کو فروغ دینا ہے تو ہر گھر میں اردو زبان کا استعمال کرنا ہوگا۔

اس موقعے پر جناب ڈاکٹر مفتی زاہد علی صاحب اور مہمانِ فیاض رفعت خان صاحب کے دستِ مبارک سے 35 سینئر اساتذہ کو اچھی تعلیم فراہم کرنے کے لیے اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 21 فروری 2015

امیر خسرو کے یومِ پیدائش پر سیمینار

فیروز آباد: امیر خسرو کے یومِ پیدائش پر ایک سیمینار کا انعقاد حالی پبلک اسکول میں کیا گیا، جس میں شہر کے ادیب و شعرا نے خسرو کے کلام کے ساتھ ساتھ اُن کی حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی۔ مقرر خاص کے طور پر شرکت کرر ہے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر شہر یار علی نے کہا کہ امیر خسرو کا مطالعہ کرنا، اُن کی یاد تازہ کرنا، محض ایک بڑے شاعر، پچھلی دنیا کے ایک اہم مصنف و فنکار سے آگاہی یا لطف اندوزی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے موجودہ ہزار سال دور کی پہلی مرکزی سلطنت، کل ہند نظام حکومت کے تانے بانے اور اس کی قوت کے راز معلوم کرنا بھی ہے۔ سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے میاں بصار الدین نے کہا کہ امیر خسرو ایک بلند پایہ شاعر اور مقبول موسیقار تھے۔ ان کو مختلف اصناف میں کمال حاصل تھا۔ یوں تو وہ فیروز آباد کے قریب ایٹہ ضلع کے پٹیالی گاؤں میں پیدا ہوئے لیکن اُن کے کلام کی دھوم صرف ملک میں ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک تک خوب ہوئی۔ وہ فی الوقت ہندوستان، پاکستان، ایران، افغانستان اور تاجکستان جیسے ممالک میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ اردو مدرس افضال احمد نے اپنے خطاب میں بتایا کہ خسرو نے تقریباً چار لاکھ اشعار کہے تھے، اور اُن کی تعدادِ کتب اتنی زیادہ تھی کہ اس سے ایک مکمل کتب خانہ بھی تعمیر کیا جا سکتا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مارچ 2015

بہار:

غلام سرور اور سید شاہ مشتاق کی اردو خدمات

پٹنہ: جب تک اردو والے انعامات، خطابات، تقاریر اور خودستائی سے اوپر اٹھ کر اردو کے حقوق کی لڑائی نہیں لڑیں گے اردو کو اس کا جائز مقام نہیں ملے گا۔ ان خیالات کا اظہار اردو کونسل ہند کے زیر اہتمام سالار اردو الحاج غلام سرور اور مجاہد اردو سید شاہ مشتاق کی خدمات اردو کے اعتراف میں منعقد اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے میزورم کے عزت مآب گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی نے مقامی انجمن اسلامیہ ہال میں کہا۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ ملک کے لیے ہم سے جو بھی قربانی مانگی جائے گی ہم اس کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں لیکن ہم کسی بھی حالت میں اردو کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔ اپنے صدارتی خطبے میں اردو کونسل ہند کے صدر شمائل نبی نے کہا کہ ہم اردو کونسل کے توسط سے نئی نسل کو اسلاف

نظام آباد میں دو روزہ اردو فیسٹیول کے انعقاد کا منظر

اور اکابر کے کارناموں سے واقف کرا کران کے اندر اپنی زبان اور ملت کے تئیں بیدار اور سرگرم عمل ہونے کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر ابوذر کمال الدین نے اردو کے تعلق سے خصوصی اور بڑی مدلل تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو چین، جاپان، ایران، توران اور عربستان کی زبان نہیں ہے بلکہ بھارت کی مٹی سے ابھری اور یہاں کی ہوا پانی میں پلی بڑھی خالص ہندوستانی زبان ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے کہا کہ کسی زبان کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ اس کی پڑھائی لکھائی کو یقینی بنایا جائے۔ اس موقعے پر سابق رکن قانون ساز کونسل اور 20 نکاتی پروگرام عملدر آمد کمیٹی کے نائب صدر نشیں پروفیسر غلام غوث نے اردو کے فروغ اور بقا کے سلسلے میں بنیادی باتیں کرتے ہوئے کہا کہ اردو صرف شعر و شاعری اور افسانہ نگاری سے زندہ نہیں رہے گی بلکہ اس کے لیے اردو کی الف ب پڑھانے یعنی ابتدائی تعلیم کو گھر گھر رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اسلم جاوداں کے ذریعے مرتب کردہ کتاب بدیع الزماں: فن اور فنکار کا اجرا ڈاکٹر عزیز قریشی، عزت مآب گورنر، میزورم، ڈاکٹر عزیز قریشی کے بدست ہوا۔ ڈاکٹر جاوداں نے کانفرنس کی نظامت کی۔ کونسل کے ناظم انوار الہدیٰ نے تمام معزز مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ پریس ریلیز، انوارالہدیٰ، پٹنہ، 1 مارچ 2015

تلنگانہ

نظام آباد میں دو روزہ اُردو فیسٹیول

نظام آباد: شعبہ اُردو تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد کے زیر اہتمام ڈگری اور یونیورسٹی طلبا و طالبات میں فروغ اُردو جذبے کو پروان چڑھانے کے مقصد سے دو روزہ بین جامعاتی اُردو فیسٹیول سمینار ہال سائنس اینڈ کامرس بلڈنگ تلنگانہ یونیورسٹی میں 25-24 فروری کو منعقد ہوا۔ اُردو فیسٹیول کا افتتاح نائب وزیر اعلیٰ تلنگانہ اسٹیٹ جناب محمود علی نے کیا اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اُردو نہ صرف تلنگانہ بلکہ ہندوستان اور عالمی سطح کی مقبول زبان ہے۔ اس زبان کے ساتھ ہماری تہذیب وابستہ ہے اور حکومت اس زبان کو سرکاری موقف دینے کے اپنے عہد کی پابند ہے۔ فیسٹیول میں مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے پروفیسر ایس اے شکور سکریٹری ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی تلنگانہ یونیورسٹی نے کہا کہ تلنگانہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے تحت اُردو فیسٹیول کا انعقاد خوش آئند بات ہے۔ اس سے نئی نسل کے طلبا میں اُردو کا ذوق بڑھے گا۔ ڈاکٹر موسی اقبال جنرل کنونیز اُردو فیسٹیول و چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز تلنگانہ یونیورسٹی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ڈاکٹر اطہر سلطانہ صدر شعبہ اردو و سرپرست اُردو فیسٹیول نے خیر مقدمی تقریر کی اور کہا کہ شعبہ کی جانب سے ہر سال اُردو فیسٹیول کا کامیابی کے ساتھ انعقاد عمل میں آرہا ہے۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر اسلم فاروقی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، 27 فروری 2015

بزم اساتذہ کا یوم تاسیس

حیدر آباد: اردو کی تاریخ میں ریاست تلنگانہ کو نمایاں مقام حاصل ہے اور تلنگانہ میں اردو کا عظیم تہذیبی ورثہ پایا جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار سید رؤف ریحان ریاستی صدر بزم اساتذہ برائے فروغ اردو زبان و ثقافت نے گولکنڈہ میں بزم اساتذہ کے یومِ تاسیس کے ضمن میں منعقدہ ادبی اجلاس میں کیا۔ انھوں نے تلنگانہ کے تاریخی ورثہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کے عظیم شعرا، ادبا، فصحا بشمول پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ، بابائے رباعیات امجد حیدر آبادی، دنیا کی پہلی اردو جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی، دار الترجمہ، دار المعارف وغیرہ کا تعلق تلنگانہ سے رہا ہے۔ روبینہ خانم شریک معتمد نے بزم اساتذہ کی ایک سالہ کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ محمد عبد الرفیق نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'منصف' حیدر آباد، 26 فروری 2015

کیرالہ:

کیرالہ اردو ٹیچرس کی سالانہ اردو کانفرنس

کالی کٹ: اردو زبان کے فروغ و ارتقا کے لیے ریاست کی معروف و مشہور تنظیم کیرالہ اردو ٹیچر ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ضلع سطح پر ایک روزہ اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ بی آر سی ہال میں منعقدہ کانفرنس کا افتتاح مقامی ایم ایل اے جناب وی ایم عمر ماسٹر نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ اردو زبان ہماری شناخت ہے۔ اس زبان کی حلاوت میں شیرینی موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیرالہ میں اردو زبان کی ترقی کے لیے اساتذہ کی محنت و لگن قابل ستائش ہے۔ کانفرنس میں ایم ایل اے عمر ماسٹر کے ہاتھوں سال رواں ریٹائرمنٹ ہونے والے اردو ٹیچرس کو تشجیعی انعامات سے نوازا گیا۔ پروگرام کی صدارت کالی کٹ ضلعی صدر جناب پی کے سی محمد ماسٹر نے کی جبکہ خیر مقدمی کلمات جناب نود پی کے نے پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 14 فروری 2015

کیرل: کیرالہ کی مشہور اردو تنظیم، ٹیچرس ایسوسی ایشن آف کیرالہ کے تحت منعقدہ سہ روزہ صوبائی اردو اجلاس کے دوسرے روز تعلیمی کانفرنس کا افتتاح ریاستی وزیر برائے تعلیم جناب پی کے عبدالرب نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ کیرالا میں اردو زبان کا فروغ یہاں کے اردو اساتذہ کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ حکومت اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن تعاون کے لیے تیار ہے۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ کئی سالوں سے مسلسل اسکول فیسٹول میں اردو زبان کو خاص مقام دیا گیا ہے۔ یہاں کے کالجز اور سماجی اداروں میں اردو کے فروغ میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ عبدالرب نے اردو کی رغبت دلاتے ہوئے کہا کہ اردو زبان سے محبت کریں ہم اس زبان کی ترقی کے لیے جو بھی ہوسکے گا وہ پورا کرنے کو تیار ہیں۔ اس تنظیم کے بینر تلے ریاست بھر میں اردو کے فروغ کی عملی کوشش جاری ہے جس کے نتائج بہتر آرہے ہیں۔ اجلاس کی صدارت شمس الدین ترور کاڈ نے کی جبکہ ترحیبی کلمات ایم کنجی محی الدین کٹی جنرل سکریٹر کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن) اجلاس سے ڈاکٹر عبدالغفور، پی معین کٹی، ڈاکٹر فیصل ماوڑتل (ریسرچ اردو آفیسر) ایم سی ابوبکر وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ ریاست کے مشہور اردو شاعر جناب سرور کی یادگار میں 'سرور ایوارڈ' پی محی الدین کٹی کو' کو اور معروف ادیبہ زلیخا حسین کی یاد میں پی محمد کٹی اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 22 فروری 2015

مہاراشٹر:

دیگلور میں کل ہند مشاعرہ

دیگلور: دیگلور میں اے ایم جی فنکشن ہال مدنور روڈ دیگلور میں بزم تنویر ادب ایجوکیشن سوشل ویلفیئر کلچرل سوسائٹی

سید حامد کی یاد میں یک روزہ سیمینار کا منظر

حالی، شبلی، عبدالسلام ندوی اور اقبال سہیل کی شعری جہات پر منعقدہ سیمینار کا منظر

دیگلور کے زیراہتمام منعقدہ کل ہند ادبی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ایم ایل اے دیگلور نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے فنڈ سے اردو بھون کی تعمیر کروائیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان ہم سب کی زبان ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے ہم سب مل کر کام کرائیں گے۔ مسٹر لکشمی کانت پدمروار صدر بلدیہ دیگلور نے کہا کہ یہ مشاعرہ بزم تنویر ادب کا پندرہواں مشاعرہ ہے۔ قاضی حامد علی تنویر اور آنجہانی فقتاجی راؤ بیلوار نے مشاعرے کی روایت کو دیگلور میں قائم کیا ہے اور مشاعرے کی شمع انھوں نے جو روشن کی ہے ہم اسے ہر سال پابندی سے کل ہند ادبی مشاعرے کے طور پر جاری رکھیں گے۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 11 فروری 2015

سید حامد کی یاد میں یک روزہ سیمینار

اردو کی عصری تعلیم و تقاضوں پر ایک قومی سیمینار کا انعقاد انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی کے مالی تعاون سے ممتاز ماہر تعلیم سید حامد مرحوم کی یاد میں منعقد کیا گیا۔ اس پہلے سیشن کی صدارت انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے فرمائی۔ پروفیسر دلوی نے نظامت کی ذمہ داری سنبھالی۔ پروفیسر دلوی صاحب نے اردو تعلیم کی افادیت اور عصری تقاضے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور حالات حاضرہ کا جائزہ پیش کرتے ہوئے مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس بات پر زور دیا کہ اردو کے ساتھ انگریزی زبان اور علاقائی زبانوں کی تحصیل بھی ضروری ہے اور ان پر عبور مادری زبان کی طرح ہونا چاہیے۔ اس موقعے پر پروفیسر دلوی نے ڈاکٹر سید حامد مرحوم کا اجمالی تعارف بھی پیش کیا۔ پروفیسر وہاب قیصر نے بڑا پر مغز اور معلوماتی کلیدی خطبہ دیا۔ ڈاکٹر ظہیر قاضی نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات کا اظہار کیا کہ انجمن اسلام وہ ادارہ ہے جو بغیر کسی ڈونیشن اور سفارش کے قابل اساتذہ کی تقرری کرتا ہے اور ساتھ ہی اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے مختلف قسم کے ورک شاپ کا بھی انعقاد کرتا ہے۔

اس سیمینار میں محترمہ سلمیٰ لوکھنڈوالا (ممبئی)، بشیر انصاری (پونہ)، محمد حسن فاروقی (مالیگاؤں) اور پروفیسر یونس اگاسکر (ممبئی) نے مقالے پیش کیے۔ سیشن کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر یونس اگاسکر نے بخوبی نبھائی۔ جبکہ مہمان خصوصی اردو اکادمی کے سابق چیئرمین خورشید احمد صدیقی تھے۔ انجمن اسلام کے کلچرل بورڈ کے چیئرمین جناب فواد پاٹکا اور اے آر رنگون والا بھی بہ نفس نفیس پروگرام میں حاضر رہے۔ پروگرام کا اختتام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر سعیدہ پٹیل کے شکریہ پر ہوا۔ ڈاکٹر شہناز ہمدولے، ڈاکٹر بدرالاسلام، پروفیسر مسرت علی اور آخر میں ڈاکٹر معزہ قاضی نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔

پریس ریلیز: اے ایم آئی دلوی، ڈائریکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی، 31 جنوری 2015

حالی، شبلی، عبدالسلام ندوی اور اقبال سہیل کی شعری جہات

ممبئی: مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن کے زیراہتمام انجمن اسلام ممبئی کی کریمی لائبریری میں حالی، شبلی، عبدالسلام ندوی اور اقبال سہیل کی شعری جہات کے عنوان پر دو روزہ قومی سیمینار میں موضوع کی مناسبت سے اہم اور پر مغز مقالے پڑھے گئے۔ سیمینار کے دوسرے دن کل چار سیشن ہوئے جس کے شرکا میں علی گڑھ سے آئے پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر خالد محمود کے علاوہ شمیم طارق، سلمیٰ لوکھنڈوالا، ڈاکٹر کلیم ضیا، ماجد قاضی، عمیر منظر اور عبداللہ امتیاز وغیرہم موجود تھے۔ پہلے سیشن میں شاہنواز فیاض، رابعہ صدیقی، سلمیٰ لوکھنڈوالا، ظفر صدیقی وغیرہ نے مقالے پڑھے۔ تیسرے سیشن کے آغاز میں عائشہ سمن نے عرشیہ جبین (حیدرآباد) کا مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر خالد محمود نے اپنا مقالہ 'شبلی کی اردو غزل اور غالب' کے عنوان سے پڑھتے ہوئے واضح کیا کہ شبلی نے غالب کو ہمیشہ اپنا آئیڈیل سمجھا اور یہی قربت ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ چوتھے سیشن میں شبانہ خان، عمیر منظر، ڈاکٹر کلیم ضیا، مولانا عارف عمری نے مقالے پڑھے۔ شمیم طارق نے زیر بحث چاروں شخصیتوں کے تعلق سے کہا کہ ان کے تذکرے سے پورا ایک عہد سامنے آجاتا ہے، ان شعرا نے مشرق و مغرب کے فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجلس کے روح رواں پرنسپل محمد ہارون اعظمی نے تمام شرکائے مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ ساتھ ہی شبلی نعمانی اور عبدالسلام ندوی مرکز کے قیام کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی، 23 فروری 2015

مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں یک روزہ قومی سیمینار

اورنگ آباد: شعبۂ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں بتاریخ 23 فروری کو ایک روزہ قومی سیمینار بعنوان 'جاں نثار اختر حیات اور ادبی خدمات' کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت ڈاکٹر اظہرالدین اکاؤنٹس اینڈ فائنانس آفیسر باموا یونیورسٹی نے کی۔ استقبالیہ کلمات صدر شعبہ اردو پروفیسر غیاث الدین نے ادا کیے۔ کنوینر ڈاکٹر صدیق محی الدین نے اپنے خطاب اردو نظم کے مختلف رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے جاں نثار اختر کی شعری خدمات پر گفتگو کی۔ جبکہ سیمینار میں کلیدی خطبہ پروفیسر انور گجرات نے پیش کیا۔ انھوں نے جاں نثار اختر کی حیات اور شاعری کے مختلف ادوار اور فکر و فن کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر مسرت فردوس کے شکریہ پر اجلاس کا اختتام عمل میں آیا۔ سیمینار کا دوسرا اجلاس پروفیسر انور ظہیر انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر شرف النسا، پروفیسر محمد غیاث الدین نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر حمید اللہ خان نے کی اس اجلاس میں عبدالرب، ڈاکٹر اشرف جاوید، ڈاکٹر مسرت فردوس نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اخیر میں ڈاکٹر صدیق محی الدین نے جاں نثار اختر کی طویل نظمیں ایک جائزہ کے عنوان سے پیش کیا۔ پروفیسر غیاث الدین کے تاثرات اور اظہار تشکر پر سیمینار کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'اورنگ آباد ٹائمز' اورنگ آباد، 25 فروری 2015

مغربی بنگال:

رہروانِ ادب کولکاتا کی ادبی تقریب

کولکاتا: اردو ادب کی نشو و نما میں مغربی بنگال کا کردار روزِ اوّل سے ہی اہم رہا ہے۔ رہروانِ ادب کولکاتا کی جانب سے مولالی یوتھ سینٹر میں منعقد ہوئے پروگرام میں رانچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر شین اختر نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ بنگال وہ سرزمین ہے جہاں اردو کی نہ صرف نشو نما ہوئی بلکہ اردو کی بقا کا دارو مدار بھی بہت حد تک بنگال کے سر ہی ہے۔ بنگال سے ہی اردو ادب کے سنہرے اور زریں باب کا آغاز ہوتا ہے۔ جب 1800 میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا جہاں سے اردو ادب نے ایک نئی راہ اور سمت پائی اردو ادب میں فصاحت اور بلاغت پیدا ہوئی اور اردو ادب کو باغ بہار کے علاوہ درجنوں شاہکار میسر ہوئے اتنا ہی نہیں بنگال ہی وہ سرزمین ہے جہاں اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما شائع ہوا۔ اردو کے اخبارات بنگال سے شائع ہوتے ہیں۔ غالباً وہ ملک کے کسی بھی حصے سے نہیں ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شہناز نبی کا لکھا ہوا ڈرامہ 'کاہے کو بیاہی بدیس' پیش کیا گیا۔ حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے ڈاکٹر زاہد الحق اور مگدھ یونیورسٹی گیا کے پروفیسر حسین الحق نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس موقعے پر چار کتابوں کا اجرا بھی ہوا جن میں پروفیسر ڈاکٹر شہناز نبی کی دو کتابیں 'فیمن ازم تاریخ اور تنقید' اور شعری مجموعہ 'شرار جستہ' اور پروفیسر ڈاکٹر ندیم احمد کی دو کتابیں 'تعصبات اور تنقید' اور شعری مجموعہ 'غزال شب' شامل ہیں۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر شہناز نبی نے تمام مہمانان کا اظہار تشکر کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے بہ خوبی نبھائی۔

روزنامہ 'آزاد ہند' بنگال، 7 فروری 2015

روزنامہ 'عکاس' کا 36واں یومِ تاسیس

کلکتہ: تمام انگلش اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لیے ٹیچر رکھے جائیں گے جن کی تنخواہ اردو اکادمی ادا کرے گی۔ اس کا اعلان پروفیسر منال شاہ قادری نے اردو روزنامہ 'عکاس' کی 36ویں یوم تاسیس کے منچ سے اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اسکولوں سے تعلیم حاصل کرنے والے بچے بھی اعلیٰ مقام پر پہنچتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں انگریزی ذریعہ تعلیم کا مخالف نہیں ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہمارے بچے اردو ضرور پڑھیں۔ اسی لیے ہم نے انگلش اسکولوں میں اردو ٹیچر رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سابق ایم پی احمد سعید ملیح آبادی نے کہا کہ بنگال اردو صحافت کی پہچان ہے یہیں سے 1822 میں اردو صحافت کا آغاز ہوا تھا۔ اردو صحافت نے آزادی کی جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان حالات میں مغربی بنگال کے اردو داں قابل تحسین ہیں کہ انھوں نے اردو کو زندہ رکھا ہے اور اس میں اہم کردار اردو اخبارات کا ہے لہٰذا اردو دانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو نہ صرف اردو تعلیم کی طرف راغب کریں بلکہ اخبارات کے مطالعہ کا شوق بھی ڈالیں۔ ایم پی سلطان احمد نے کہا کہ اگر میں پورے ہندوستان میں پہچانا جاتا ہوں تو وہ اردو اخبارات کی دین ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو اخبارات میں اخبارِ مشرق کا وہی مقام ہے جو بنگلہ میں آنند بازار اور انگلش میں اسٹیٹس مین کا ہے میری خواہش ہے کہ عکاس سمیت تمام اردو اخبارات کا معیار اسی طرح بلند ہو۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' کولکاتا، 22 فروری 2015

تہذیب و ثقافت:

ایک شام سامعین کے نام

بھوپال: یہاں 'حلقۂ اربابِ ادب' نے عام ڈگر سے ہٹ کر ایک منفرد انداز کی تقریب منعقد کی۔ تقریب کا عنوان تھا 'ایک شام سامعین کے نام' اور اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے میسور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر مسعود سراج جبکہ صدارت کر رہے تھے، صحافی و سماجی رہنما راجکمار کیسوانی، مہمان ذی وقار ساہتیہ اکادمی دہلی کے اعزاز سے سرفراز شاعر راجیش جوشی تھے۔ اس تقریب میں سید حفیظ علی (لال میاں) شیتل بھائی سونی اور یوسف علی خاں کا استقبال کرتے ہوئے انھیں شال پیش کی گئی اور گل پوشی کی گئی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود سراج نے کہا کہ بھوپال ادب و شعر کا قدیم مسکن ہے اور اردو ادب کے نقشے میں ایک مخصوص مقام کا مالک ہے۔ اس تقریب میں پانچ ایسے شاعروں کو زحمتِ سخن دی گئی جو اپنی کامیاب ادبی و شعری زندگی کے 80 سال گزار چکے ہیں۔ ان میں جناب ظفر نسیمی (پیدائش 1931)، پروفیسر آفاق احمد (1932)، پروفیسر سعید اختر (1933)، جناب کوثر صدیقی اور جناب ادریس مونس (1934) شامل تھے۔ اسی موقعے پر راجکمار کیسوانی نے اپنے صدارتی خطبہ میں باذوق سامعین کی شرکت کی ضرورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ادب کی پیش کش زیادہ بامعنی ہو جاتی ہے جب اس کے سننے والے اس میں دلچسپی لیں۔ یہ ایک مبارک پہل ہے۔ اس تقریب کی نظامت بھوپال کے ممتاز ناظم بدر واسطی نے اپنے مخصوص انداز میں کی۔

روزنامہ 'بھوپال'، 27 فروری 2015

ڈاکٹر ذاکر حسین کالج میں محفلِ قوالی کا اہتمام

نئی دہلی: بزمِ ادب ذاکر حسین کالج (دہلی یونیورسٹی) ایوننگ کے زیر اہتمام سلمان غنی ہاشمی آڈیٹوریم میں شاندار محفل قوالی کا اہتمام کیا گیا جس میں مشہور قوال شاہد نیازی اور سمیع نیازی نے اپنی فنکاری سے طلبہ و طالبات کے دل جیت لیے۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے بزم ادب کے صدر ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے پروگرام پر روشنی ڈالی۔ اپنے صدارتی کلمات میں قوالی کے حوالے سے گفتگو کرتے

ہوئے شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ قوالی قول سے مشتق ہے، گزشتہ زمانے سے اب تک من کنت مولاہ فعلی مولاہ قوال گارہے ہیں، یہ قول ہے۔ اس میں بحث ہے کہ کیا قوالی ساز کے ساتھ جائز ہے یا ناجائز ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت امیر خسرو کے ساز کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ایک ایسا ساز ایجاد کیا تھا جس کی حضرت نظام الدین اولیا نے اجازت دی تھی۔ پروفیسر علوی نے مزید کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا نے قوالی کے جواز کی تین شرطیں لگائی تھیں۔ اس میں زمان، مکان اور اخوان کی شرطیں ہیں اور اگر یہ شرطیں پائی جائیں تو قوالی جائز ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حضرت امیر خسرو اور حضرت میر درد کو موسیقی اتنی اچھی آتی تھی کہ وہ دونوں اپنے اپنے دور میں موسیقی کے نائک کہلاتے تھے۔ انھوں نے قوالی کی تہذیب اور تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کو ایک تہذیبی ورثہ بتایا۔ قبل ازیں بزم ادب کے صدر ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے قوالی کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ قوالی اردو زبان و ادب کا سماجی ادارہ ہے، یہ صرف موسیقی کا ایک ذریعہ نہیں ہے بلکہ انسان کے جذبات اور احساسات کو متحرک کرتی ہے اور اس کو اعلیٰ اخلاق و اقدار کی طرف مائل کرتی ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے پروگرام میں شریک تمام مہمانوں اور طلبہ و طالبات کے ساتھ ساتھ کالج انتظامیہ کا بھی شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 فروری 2015

'اودھ رتن ایوارڈ' کا منظر

اعزاز و اکرام:

'اودھ رتن ایوارڈ'

لکھنؤ: سنگم فاؤنڈیشن لکھنؤ کی جانب سے بلی اوماناتھ آڈیٹوریم، قیصر باغ میں ہندو بیرون ہند کی مختلف شخصیات کو مختلف میدانوں میں خدمات کے لیے 'اودھ رتن' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر اختر الواسع کمشنر برائے لسانی اقلیات، حکومت ہند نے کی۔ خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی-فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خان مسعود احمد اس پروگرام میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ پروفیسر خان مسعود احمد نے سنگم فاؤنڈیشن کے ذمے داران بالخصوص پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی کی ادبی وسماجی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ اس پروگرام میں وقار رضوی اور نعمان اعظمی مہمانان ذی وقار تھے۔ عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کو 'مخدوم اشرف اودھ رتن ایوارڈ' برائے عالمی سفیر اردو، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین کو 'سید انوار اشرف اودھ رتن ایوارڈ' برائے مجموعی خدمات اردو، معروف ادیب سید محمود الحسن رضوی کو 'سید امتیاز احمد اشرفی ایوارڈ' برائے اردو ادب، اردو کے معروف نقاد اور ناول نگار پروفیسر سید مجاور حسین رضوی کو 'سید نعیم اشرف اودھ رتن ایوارڈ' برائے اردو تنقید، جناب امان عباس کو 'سید منظور احمد اشرفی اودھ رتن ایوارڈ' برائے اردو صحافت اور جناب محمد سلیم قریشی کو مفتی عبداللہ پھول پوری اودھ رتن ایوارڈ' برائے سماجی خدمات، ہندی ادب کے لیے ملک محمد جائسی ایوارڈ کناڈا کی اسنیہہ ٹھاکر کو دیا گیا۔ ساتھ ہی مذکورہ ایوارڈ یافتگان حضرات کو سپاس نامے بھی پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا سپاس نامہ ڈاکٹر محمد اکمل نے پڑھا، ڈاکٹر ثوبان سعید نے پروفیسر خواجہ اکرام الدین کا سپاس نامہ پڑھا، ڈاکٹر اعظم انصاری نے پروفیسر سید مجاور حسین کا سپاس نامہ پڑھا جبکہ ڈاکٹر محمد جاوید اختر نے پروفیسر سید محمود الحسن کا سپاس نامہ پڑھا۔ ڈاکٹر مرتضٰی علی اطہر نے امان عباس کا سپاس نامہ پیش کیا۔ ادبی وسماجی تنظیم 'سنگم' کا تعارف اور اس تقسیم ایوارڈ کی نظامت ڈاکٹر ثوبان سعید نے کی۔ شکریہ کے فرائض سید شفیق اشرف نے ادا کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 مارچ 2015

عکس ادب کے زیر اہتمام تقسیم انعامات

اورنگ آباد: اورنگ آباد سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالے 'عکس ادب' کے زیر اہتمام ایک شاندار سالانہ جلسہ بمقام شہناز فنکشن ہال اورنگ آباد منعقد کیا گیا جس کی صدارت تمل ناڈو کے معروف شاعر و ادیب جناب علیم صبا نویدی نے فرمائی اور جناب اشفاق الرحمٰن مظہر، سابق سکریٹری تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ جناب علیم صبا نویدی کو ان کی مجموعی اردو خدمات کے اعتراف میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (حاصل حیات انعام) اور چاندی کے میڈل سے نوازا گیا اور اشفاق الرحمٰن مظہر کو عتیق احمد ایوارڈ برائے شاعری نوازا گیا۔ ان کے علاوہ محترمہ سیدہ مہر کو قرۃ العین حیدر ایوارڈ، عظیم دیواسی کو ڈاکٹر محبوب راہی ایوارڈ، شیخ عبدالوہاب کو ڈاکٹر منظور حسن ایوبی ایوارڈ، ڈاکٹر مجید بیدار کو مولوی عبدالحق ایوارڈ، غفور نازش کو ارشد مینانگری ایوارڈ اور علیم طاہر کو بشر نواز ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس اجلاس کے بعد مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جناب علیم صبا نویدی نے کی اور نظامت ڈاکٹر یوسف صابر اور ڈاکٹر سلیم نواز حشر، جعفر آبادی نے کی۔ ڈاکٹر سلیم نواز کے ہدایۂ تشکر کے ساتھ مشاعرہ اور اجلاس کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 26 فروری 2015

اردو اکادمی دہلی کا جلسہ انعامات

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ایوانِ غالب میں جن طالب علموں نے اس سال اکادمی کے تعلیمی و ثقافتی مقابلوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا ان کے لیے جلسۂ تقسیم انعامات برائے تعلیمی مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام میں بطور مہمان خصوصی جامعہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے شرکت کی۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے تمام مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ اردو اکادمی دہلی کی بنیاد کافی مستحکم ہے۔ یہ اکادمی اب تک محدود نہیں رہی، اس نے ادب کے ساتھ ساتھ زبان کی ترویج و اشاعت میں بھی اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری انیس اعظمی نے اکادمی کی کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ جلسے میں اکادمی کے اراکین پروفیسر شہپر رسول، مرغوب حیدر عابدی، ڈاکٹر عفت زریں اور معصوم مرادآبادی بھی موجود تھے۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر شبانہ نذیر، کنوینر تعلیمی کمیٹی نے اظہار تشکر ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی کا یہ بنیادی پروگرام ہے جو اردو کے فروغ کے لیے ہے۔ پروگرام کی نظامت ریشما فاروقی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 فروری 2015

مدرسہ فیضان مصطفٰی میں منعقد جلسہ تقسیم اسناد

علی گڑھ: اردو شیریں زبان ہے۔ اس زبان نے اپنی مٹھاس سے لوگوں کا دل جیتا ہے۔ ملک کی آزادی میں اردو زبان کے نعروں نے دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیے،

اردو اکادمی دہلی کے جلسہ انعامات کا منظر

'یش بھارتی' ایوارڈ کی تقسیم کا منظر

اردو پورے ملک کی زبان ہے، ان خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری کی بیگم سلمیٰ انصاری نے زہرا باغ واقع مدرسہ فیضانِ مصطفیٰ میں منعقد جلسہ تقسیم اسناد میں بطورِ مہمانِ خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ دورِ حاضر میں تعلیم نسواں کا فروغ بہت ضروری ہے کیونکہ جب لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوں گی تو اس سے بہترین معاشرے کی تشکیل ہوگی۔ سلمیٰ انصاری نے اردو کی تابناک تاریخ پر بولتے ہوئے کہا کہ اس زبان نے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر اس زبان کی زبوں حالی کو دور کریں۔ اس موقعے پر جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کرتے ہوئے معروف عالم دین سید جمال نے کہا کہ ترقی کا راستہ تعلیم ہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے فروغ پر توجہ دی جائے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محمد عباس نے کی جبکہ خطبۂ استقبالیہ سابق اے ڈی ایم نواب علی خان نے پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 فروری 2015

'یش بھارتی' ایوارڈ کی تقسیم

لکھنؤ: لکھنؤ کے ڈاکٹر رام منوہر لوہیا پارک میں منعقد یش بھارتی اعزازی تقریب میں بیکل اتساہی، راحت، نواز الدین وانوپ جلوٹا، رویندر جین سمیت 56 ہستیوں کو اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ ان ہستیوں کو یش بھارتی اعزاز سے ریاست کے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو، سابق وزیر دفاع ملائم سنگھ یادو اور ریاست کی وزیر ثقافت ارونا کماری نے سرفراز کیا۔ سال 14-2013 اور سال 15-2014 کے لیے مختلف شعبوں میں قابل ذکر تعاون پیش کرنے والی 56 مختلف قسم کی صلاحیتیں رکھنے والی شخصیتوں کو یش بھارتی اعزازات سے سرفراز کیا گیا، محترمہ ریشمہ فاطمہ کو رانی لکشمی بائی بہادری انعام سے اور محترمہ سیما تیواری کو مہارانی اہلیہ بائی ہولکر انعام سے نوازا گیا۔ یش بھارتی اعزاز تقریب میں سال 15-2014 کے لیے جن صلاحیتوں کو اعزاز سے نوازا گیا، ان میں حمید اللہ (حامد ہندی)، پروفیسر ریتا گانگولی، درشن سنگھ یادو، پروفیسر بھاگی رتھ پرساد ترپاٹھی، پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، پروفیسر جے کرشن اگروال، ونود مہتا، ڈاکٹر ارمل کمار تھپلیال، رویندر جین، یوگیش گوڑ، ٹی پی ترویدی، گردھر لال مشر جگد گرو راماننداچاریہ سوامی رام بھدراچاریہ، راج کمار ورما، ڈاکٹر گیان چترویدی، بدھی پرکاش، وشنو یادو، ڈاکٹر کم کم دھر، ڈاکٹر وشنو سکسینہ، محترمہ شوبھا مدگل، کرشن کنہاہی اور گووند کنہاہی، ڈاکٹر سی ایس یادو، راج کمار، ڈاکٹر آر پی سنگھ، ڈاکٹر راکیش یادو، افتخار ندیم خان، جمیت سنگھ گل جی شیر گل، کیلاش کھیر، راحت علی خاں صابری، نواز الدین صدیقی، اونیش کمار یادو، محترمہ الکا تومر، محترمہ پونم یادو، محترمہ گیتانجلی شرما اور خوشبیر سنگھ شاد شامل ہیں۔ اسی طرح سال 14-2013 کے لیے جن ہستیوں کو اعزاز دیا گیا، ان میں لودی محمد صفی خاں 'بیکل اتساہی'، ہیرا لال یادو، ڈاکٹر جگدیش گاندھی، دیوی پرساد پانڈے، پروفیسر ماتا پرساد ترپاٹھی، اشوک کمار سنگھ، ونش گوپال یادو، انوپ جلوٹا، راجن، ساجن مشر، رمیش بھیا، پنڈت وکاس مہاراج، شیتلا پانڈے سمیر، لال بچن یادو، منور انظار، محترمہ ریکھا بھاردواج، دھرمیندر یادو، بھگت سنگھ، یوگیندر سنگھ یادو، وجے پال یادو، راجیش کمار یادو، ابھشیک یادو اور محترمہ شوبتا پریہ درشنی شامل ہیں۔ محکمہ ثقافت کی سکریٹری محترمہ انیتا سی۔ میشرام نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

وزیر مملکت برائے خواتین بہبود اور ثقافت (آزاد چارج محترمہ ارونا کماری نے کہا کہ بہادری کا کارنامہ انجام دیے جانے والے رانی لکشمی بائی بہادری انعام کے لیے ایک لاکھ روپے، سرٹیفکیٹ اور توصیفی سند اور مہارانی اہلیہ بائی ہولکر انعام سے سرفراز ہونے والی صلاحیت کو توصیفی سند، سرٹیفکیٹ کے ساتھ ساتھ پانچ لاکھ روپے اعزاز کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح یش بھارتی اعزاز سے سرفراز ہونے والی ہستیوں کو 11 لاکھ روپے اور توصیفی سند پیش کی جاتی ہے۔ اس موقعے پر اعزازی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اترپردیش کے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے کہا کہ موسیقی، ادب، کھیل کود، فنون لطیفہ، معالجہ اور دیگر شعبوں میں خصوصی تعاون پیش کرنے والی ریاست کی ہستیوں کو سرفراز کرنا فخر کی بات ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 10 فروری 2015

کرناٹک اردو اکادمی کی تقریب تقسیم ایوارڈ

گلبرگہ: کرناٹک کے وزیر اعلیٰ سدارمیا نے کہا ہے کہ اردو کو کسی فرقہ یا مذہب تک محدود نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ یہ ایک قومی اور عالمی زبان ہے، اردو بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ اردو زبان نے ملک میں سیکولرزم، فرقہ وارانہ یگانگت کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی حکومت اردو کے بشمول تمام زبانوں کا یکساں احترام کرتی ہے۔ وزیر اعلیٰ نے ودھان سدھا بنگلور میں کرناٹک اردو اکادمی کی ایوارڈس تقریب کو خطاب کرتے ہوئے مزید کہا کہ اردو زبان نہ صرف ریاست کرناٹک، ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ سدارمیا نے کہا کہ وہ اردو زبان کی شیرینی لطافت اور اس کی اثر انگیزی سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ مسٹر رامیا نے کہا کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھا جارہا ہے جبکہ یہ ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ انھوں نے اردو ذریعہ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے کرناٹک اردو اکادمی کو فاصلاتی تعلیمی نظام شروع کرنے کی ہدایت دی۔ انھوں نے اردو اکادمی کی چیئرپرسن ڈاکٹر فوزیہ چودھری اور تمام ممبران کو ہدایت دی کہ وہ اردو کو ترقی دینے اور اردو زبان کے مسائل کے حل کے لیے انھیں تجاویز پیش کریں۔ تقریب کی صدارت آر۔ روشن بیگ وزیر اطلاعات و حج انفراسٹرکچر نے کی۔ وزیر اعلیٰ نے سال 2010 سے 2013 تک مختلف شخصیات کو ادبی، صحافتی، تعلیمی اور مجموعی خدمات کے لیے ایوارڈس عطا کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 فروری 2015

کلیم تیاگی 'محسن اردو ایوارڈ' سے سرفراز

دیوبند: پاشا ارو لائبریری، مظفر نگر کی جانب سے 15-2014 کا 'محسن اردو ایوارڈ' اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، مظفر نگر کے ضلع صدر کلیم تیاگی کو ان کی اردو خدمات کے اعتراف میں دیا گیا۔ اس ایوارڈ کے تحت کلیم تیاگی کو پاشا

ممتاز حسین کی کتاب 'لفظوں کی تصویریں' کے اجرا کا منظر

عارف نقوی کی کتاب 'کیرم سے رشتہ' کے اجرا کا منظر

اردو لائبریری کے صدر قاضی فرید پاشا آزاد (گولڈ میڈلسٹ) نے ایک توصیفی سند اور 5000 روپے نقد پیش کیے۔ مظفر نگر کے مناکشی چوک پر واقع پیغامِ انسانیت کے ضلع دفتر میں منعقد ایک عظیم الشان پروگرام میں اردو ہندی کے مشہور مصنف، اسلامک اسکالر اور پاشا اردو لائبریری کے صدر قاضی فرید پاشا آزاد نے یہ ایوارڈ کلیم تیاگی کو پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، یکم مارچ 2015

رسم اجرا:

لفظوں کی تصویریں

نئی دهلی: اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام نیویارک میں مقیم معروف افسانہ نگار، فلم ساز، قصہ گو اور مصور ممتاز حسین کی کتاب 'لفظوں کی تصویریں' کا اجرا شاہد ماہلی، پروفیسر ابن کنول، اے رحمٰن اور ڈاکٹر عقیل احمد کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے اے رحمٰن نے ممتاز حسین کی ادبی، فنی اور علمی خدمات پر روشنی ڈالی۔ متین امروہوی نے منظوم استقبالیہ پیش کیا۔ انجم عثمانی نے اے رحمٰن کی فکری، فنی، علم دوستی پر گفتگو کی۔ شاہد ماہلی نے کتاب پر اپنا تجزیہ پیش کیا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ ممتاز حسین مختلف فنون میں مہارت رکھتے ہیں، اس کتاب کو پڑھنے اور افسانہ سننے کے بعد لگتا ہے کہ ایسا افسانہ ایک فن کار ہی لکھ سکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مارچ 2015

اندوختہ

گلبرگہ: افلاک پبلی کیشنز کے زیر اہتمام گلبرگہ میں منعقدہ اکرام باگ کے افسانوی مجموعے اندوختہ کی رسم اجرا معروف صحافی و شاعر حکیم شاکر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس اجلاس کے مہمان خصوصی وہاب عندلیب نے کتاب کی اشاعت پر اکرام باگ کو مبارک باد دی اور کہا کہ اکرام باگ کے اسلوب میں ابتدا سے لے کر آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ دوسرے مہمان خصوصی پروفیسر حمید سہروردی نے کہا کہ اکرام باگ کے افسانوں کا بنیادی تھیم عشق ہے۔ اکرام باگ نے اپنی افسانہ نگاری اور اس کے محرکات پر مفصل روشنی ڈالی۔

جناب منظور احمد دکنی کے شکریے پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ ادبا و شعرا کے علاوہ مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے سامعین کی کثیر تعداد اس اجلاس میں شریک تھے۔

روزنامہ 'سیاست' بنگلور، 5 فروری 2015

کیرم سے رشتہ کا

لکھنؤ: برلن (جرمنی) میں مقیم مشہور افسانہ نگار شاعر، صحافی عارف نقوی کی تازہ ترین تصنیف 'کیرم سے رشتہ' کے رسم اجرا کی تقریب اردو رائٹرس فورم کے زیر اہتمام اردو میڈیا سینٹر میں زیر صدارت جسٹس حیدر عباس رضا اور زیر نظامت ڈاکٹر ہارون رشید عمل میں آئی۔ اس موقعے پر کے وکرم راؤ اور ڈاکٹر انیس انصاری موجود تھے۔ خیالات کا اظہار کرنے والوں میں ڈاکٹر شارب ردولوی اور احمد ابراہیم علوی خاص طور سے شامل تھے۔ عارف نقوی نے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کتاب کے سرورق پر ایک بوڑھا اور بچہ اس لیے ہے کہ کیرم سارے امتیاز کو ختم کر دیتا ہے۔ ذہنی مریضوں کے لیے بھی مفید ہے۔ آخر میں اردو رائٹرس فورم کے سکریٹری سید وقار رضوی نے تمام مقررین معززین شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 فروری 2015

'سالار' کا خاص نمبر

لکھنؤ: اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے کہا کہ ہندی اور اردو ایک ساتھ فروغ پانے والی زبانیں ہیں۔ ان دونوں سے ریاست کی گنگا جمنی تہذیب کو استحکام حاصل ہوا ہے۔ وزیر اعلیٰ اپنی سرکاری قیام گاہ پر ہندی اور اردو روزنامہ اخبار 'عوامی سالار' کے ایک سال مکمل ہونے پر شائع خاص نمبر کا اجرا کرنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 17 فروری 2015

فارسی مخطوطات کے دوسرے کیٹلاگ کا اجرا

رامپور: رضا لائبریری میں موجود فارسی مخطوطات کے دوسرے کیٹلاگ کا اجرا کرتے ہوئے سابق ڈائرکٹر سائنٹفک ببلیوتھک یونیورسٹی پیپرس فرانس پروفیسر ایف جے اے رچرڈ نے کہا کہ ہندوستان مخطوطات کی جنت ہے۔ اس ملک میں جتنے قدیم مخطوطات ہیں اتنے دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہیں۔ ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے بتایا کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے فارسی کے چھ کیٹلاگ تیار کیے لیکن 1981 کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ انھوں نے بتایا کہ رضا لائبریری کے خزانہ میں 17 ہزار مخطوطات ہیں۔ پروگرام کی نظامت سید طارق اظہر نے کی جبکہ شکریہ انعام پروین نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 فروری 2015

گل بداماں

نئی دهلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں معروف صحافی، شاعر اور ادیب آنجہانی دیوان تصور کے شعری مجموعہ 'گل بداماں' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ دیوان تصور کا شمار ان صحافیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے آزادی کے بعد اردو زبان کو زندہ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے ان کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں بلا کی سادگی ہے، وہ لطیف انداز میں مشکل سے مشکل مضمون کو شعر میں پیش کرنے کا فن جانتے تھے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے جوائنٹ ڈائرکٹر جناب شمس تبریزی نے کہا کہ ہریانہ دیوان صاحب کی اردو خدمات پر فخر کرتا ہے۔ 'گل بداماں' کے مرتب اور دیوان تصور کے صاحب زادے پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ میرے والد نے پوری زندگی اردو کی خدمت میں گزار دی، وہ صرف اور صرف اردو ہی کے ادیب اور شاعر تھے۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں اردو اور فارسی کے اساتذہ اور طلبہ موجود تھے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 18 فروری 2015

دروازہ بند کے ہندی اور اردو تراجم کا اجرا

رام پور: رضا لائبریری میں محفوظ فارسی مخطوطہ 'دروازہ

بنڈ کے ہندی اور اردو تراجم کی رسم اجرا پروفیسر چندر شیکھر صدر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ لائبریری کے خیابان رضا میں منعقدہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے ڈائرکٹر پروفیسر سید عزیز الدین حسین نے کہا کہ اس تصنیف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اردو ترجمہ میرے دادا مرحوم حکیم سید ریاض الدین حسین ہمدانی نے کیا، جبکہ ہندی ترجمہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ سنسکرت کے ڈاکٹر بلرام شکلا کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 فروری 2015

کچھ وچار کچھ انوبھاؤ

دیوبند: اترپردیش اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ مصنف سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نواز دیوبندی یہاں محلّہ قلعہ واقع اسلامیہ انٹر کالج میں

مصنف نوشا عرشی (این اے وکٹر) کی کتاب 'کچھ وچار کچھ انوبھو' کی تقریب رسم اجرا کے پروگرام میں خطاب کررہے تھے۔ نظامت کے فرائض کالم نگار کمل دیوبندی نے انجام دیے۔ روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 19 فروری 2015

'جنوبی ہند میں اردو افسانہ نگاری: آزادی کے بعد'

چتور: ڈاکٹر پی داؤد خان سابق صدر شعبہ اردو زنانہ کالج مدن پلی ضلع چتور آندھرا پردیش کی نئی کتاب جنوبی ہند میں اردو افسانہ نگاری۔ آزادی کے بعد کا ٹاؤن ہال میں رسم اجرا عمل میں آیا۔ اس اجلاس کے مہمان خصوصی میونسپل چیرمین جناب سوا پرساد نے کہا کہ اردو نثر نگاروں میں داؤد خان ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔ اعزازی مہمان اور بی ٹی کالج مدن پلی کے کرسپانڈنٹ جناب وویکا نندا نے اظہار خیال کرتے ہوئے اس کتاب کے دیگر زبانوں میں ترجمہ کی خواہش ظاہر کی۔ صدر جلسہ اور اردو افسانہ نگار شاعر ادیب صحافی محمود شاہد نے اپنے خطاب میں کہا کہ مصنف نے ان علاقوں میں اردو افسانہ نگاری پر جو سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اہم نکات کی نشاندہی کی۔ میز بان ڈاکٹر پی داؤد خان کے ہدیۂ تشکر اور سلام پر جلسہ ختم ہوا۔

پریس ریلیز ڈاکٹر عبدالستار ساحر پروفیسر وصدر شعبۂ اردو جامعہ وینکٹیشورا تروپتی، یکم فروری 2015

لمس

بھیونڈی: معصوم ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی بھیونڈی کے زیراہتمام معروف اردو ہندی ادیب ایم مبین کی 43ویں کتاب نئے افسانوی مجموعہ 'لمس' کی رسم اجرا اور مذاکرہ کا اہتمام صنوبر ٹریننگ سینٹر، بھیونڈی میں کیا گیا۔ رسم اجرا اور مذاکرے کی صدارت جناب معروف شاعر گیت کار ابراہیم اشک (ممبئی) نے کی۔ کتاب کا اجرا بدست معروف شاعر، صنعت کار جناب ساگر ترپاٹھی (ممبئی) عمل میں آیا۔ اس موقعے پر جناب نورالحسنین، جناب خورشید حیات، جناب معین لدین عثمانی، ڈاکٹر عظیم راہی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس پروگرام کے بعد معصوم ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی بھیونڈی کی جانب سے سالانہ ماسٹر الٰہی بخش ایوارڈ جناب عبدالاحد ساز، جناب ساگر ترپاٹھی، جناب ابراہیم اشک، جناب قمر صدیقی، جناب اصغر حسین قریشی اور جناب مظہر اعظمی صاحب کی خدمت میں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کی طور پر پیش کیے گئے۔ پروگرام کے صدر عمدۃ الادب مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری، ایڈوکیٹ یاسین مومن، کامریڈ اسرار احمد انصاری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت نوجوان شاعر شکیل احمد شکیل نے کی۔

رپورٹ: ابرار جمیل، نائب سکریٹری، معصوم ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، بھیونڈی، 9 فروری 2015

پنچھی: جہاز کا

آگرہ: مورخہ 24 جنوری 2015 بزم نظیر کے صدر پیر زادہ عمر تیموری صاحب کی جانب سے ہر سال کی مانند نظیر اکبرآبادی کے مزار پر بسنت میلہ منعقد ہوا، جس کی صدارت کرتے ہوئے پولیس کمشنر آگرہ عالی جناب پردیپ بھٹناگر صاحب نے اردو اکادمی لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع حنیف سیّد کے افسانوی مجموعہ 'پنچھی: جہاز کا' کا اجرا کیا، جس میں بزم نظیر کے صدر، 'تاج وز' آگرہ کے ایڈیٹر جناب پیرزادہ عمر تیموری صاحب، جناب سیّد خادم علی ہاشمی صاحب، اور کیریئر ایجوکیشنل پتریکا کے نائب ایڈیٹر جناب سید خاور علی ہاشمی صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔ مہمان خصوصی افسانہ نگار حنیف سیّد رہے اور نظامت بزم نظیر کے صدر پیرزادہ عمر تیموری صاحب نے فرمائی۔ اس موقعے پر شہر کے معزز حضرات حاجی اقبال احمد پدم شری، عارف تیموری، افروز شاہین، فرعین، راکیش دیکھشت، سردار نریندر سنگھ کھنوجہ، سردار امریت سنگھ، جوالا پرشاد اور جواہر لعل وغیرہ خصوصی طور سے موجود رہے۔ آخر میں صدر نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: حنیف سید، آگرہ، 8 فروری 2015

روشن حقیقت

گلبرگہ: حضرت سید چاند پاشاہ مرحوم کی کتاب 'روشن حقیقت' روحانی سطح پر نئی نسل کے لیے رہنمائی کا کام کرتی ہے۔ اس خیال کا اظہار ممتاز صحافی اور شاعر جناب حامد اکمل نے کیا جو بوہے گروپ آف میڈیکل اینڈ ڈسٹری بیوٹرس گلبرگہ کے زیراہتمام نوری پبلک اسکول گلبرگہ میں منعقدہ حضرت سید چاند پاشاہ مرحوم کی کتاب 'روشن حقیقت' کی رسم اجرا کی تقریب میں کیا۔ جناب سید مظہر علی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ روشن حقیقت کو منظر عام پر لانا اُن کی زندگی کا مقصد تھا انھوں نے تقریبِ رسم اجرا میں اظہار کرنے والے حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: سید اشفاق علی، ڈائرکٹر بوہے گروپ آف میڈیکل اینڈ ڈسٹری بیوٹرس گلبرگہ، 18 فروری 2015

قانون تخلیق آدم: اور عیسیٰ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے برج کورس کے ڈائرکٹر پروفیسر راشد شاز نے مولانا کبیرالدین فوزان کی کتاب 'قانون تخلیق: آدم اور عیسیٰ کی پیدائش' کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ فوزان صاحب اہل علم کے مابین محتاج تعارف نہیں۔ ان کی متعدد علمی و تحقیقی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ مصنف کتاب مولانا فوزان نے اظہار تشکر کے بعد طلبا برج کورس نے متعدد سوالات پیش کیے جن کے جوابات مولانا نے دیے۔ اس موقعے سے ڈاکٹر کوثر فاطمہ اور ڈاکٹر سید طہٰر احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، یکم مارچ 2015

'نئی رُت کا سفر'

ریاض: 'ہم ہندوستانی تنظیم' کے زیراہتمام برصغیر کے معروف اور منفرد لب ولہجہ کے شاعر جناب عبدالوہاب سخن کے شعری مجموعہ 'نئی رت کا سفر' کی تقریب رونمائی سعودی عرب ریاض میں عمل میں آئی۔ اس تقریب اجرا میں سفارت خانہ ہند کے سکریٹری ڈاکٹر حفظ الرحمٰن اعظمی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ریاض کے کوکو پام ریسٹورنٹ میں منعقدہ اس تقریب کی صدارت تنظیم کے روحِ رواں جناب محمد قیصر نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب میر لیاقت علی ہاشمی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ مہمان خصوصی نے عبدالوہاب سخن کو 'ردائے اعزاز' اور 'تمغۂ تہنیت' سے سرفراز کیا۔ اس تقریب میں عبدالوہاب سخن کے علاوہ مقامی و بیرونی شعرا نے اپنا کلام سنا کر داد وتحسین حاصل

کی۔ عبدالوہاب سخن کا تعلق ہندوستان میں اتر پردیش کے ضلع رام پور سے ہے۔ موصوف سعودی عرب کی الجوف یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی زبان و ادب میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور ساتھ ہی اردو شاعری میں بھی اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ تنظیم کے صدر محمد قیصر نے اپنے صدارتی خطبہ میں تمام مہمانِ خصوصی اور شعرا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 28 فروری 2015

'جوش بحیثیت رباعی گو'

رامپور: ملک کے معروف انقلابی شاعر جوش ملیح آبادی کی 33 ویں یوم وفات کے موقعے پر ڈاکٹر رباب انجم کی تصنیف کردہ کتاب 'جوش بحیثیت رباعی گو' کا رسم اجرا گلوبل سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام ضلع سہکاری بینک ایڈوٹوریم میں منعقد ہوا۔ اس پروقار تقریب کی صدارت ڈاکٹر حسن احمد نظامی سابق صدر فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر محمد یونس خاں وائس چانسلر محمد علی جوہر یونیورسٹی موجود تھے۔ تقریب میں مہمانِ ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی (نبیرہ جوش ملیح آبادی) و ثروت عثمانی اسٹیشن ڈائریکٹر آکاش وانی رام پور مہمان مکرم اور مہمان ذی وقار کی حیثیت سے ڈاکٹر شمس بدایونی موجود تھے۔ اس موقعے پر صولت پبلک لائبریری کے صدر س ش عالم اور مجلس مشاورت کے ممبران کے ذریعے ڈاکٹر رباب انجم کو سند امتیاز کے ساتھ مومنٹو اور ردا پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 23 فروری 2015

'اور پھر ایک دن'

کراچی: بالی ووڈ کے فلم اداکار نصیر الدین شاہ ان دنوں پاکستان کے دورے پر ہیں۔ ان کی اہلیہ رتنا اور بیٹی حبا بھی ان کے ساتھ ہیں۔ پچھلے سال وہ ایک اسٹیج ڈراما 'عصمت آپا کے نام' پیش کرنے پاکستان پہنچے تھے جبکہ اس بار ان کے دورے کا مقصد اپنی کتاب 'اور پھر ایک دن' کی رونمائی تھا۔ نصیر الدین شاہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی دعوت پر کراچی آئے ہوئے تھے۔ تقریب رونمائی میں شرکا سے بات چیت میں نصیر الدین شاہ نے ہندوستانی فلم انڈسٹری سے متعلق اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا۔ تقریب کے دوران نصیر نے اپنی کتاب کے کچھ اقتباسات بھی پڑھ کر سنائے جن سے سننے والے بہت محظوظ ہوئے۔ انھوں نے اپنی ترجیحات میں فلم کے مقابلے تھیٹر کو ترجیح دیا۔ ان کے نزدیک فلم اور تھیٹر کا کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 فروری 2015

وفیات:

عمران انواروی

لکھنؤ: معروف شاعر اور نفیس انسان جونیئر ہائی اسکول، بہٹہ کے ہیڈ ماسٹر عمران انواروی کا انتقال ہوگیا۔ عمران انواروی بڑی خوبیوں کے حامل انسان تھے۔ عمران انواروی فن شاعری میں استاد شاعر عزیز بارہ بنکوی کے شاگرد تھے۔ وہ غزل کی قدیم روایت کے امین تھے لیکن جدید عصری تقاضوں کو بھی انھوں نے اپنی شاعری میں خوبصورتی سے پیش کیا۔ وہ قطعہ تاریخ کے فن سے بھی واقف تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 مارچ 2015

سینئر صحافی نفیس احمد صدیقی

سہارنپور: گلوکل یونیورسٹی کے چانسلر ایم ایل سی حاجی محمد اقبال کے سدھی اور سینئر صحافی نفیس احمد صدیقی کا طویل علالت کے بعد حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ صدائے سالک میموریل سوسایٹی اردو پریس کلب نے نفیس صدیقی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ نفیس احمد صدیقی ایک ہندی روزنامہ سے منسلک ہوگئے تھے۔ انھوں نے 20 سال تک صحافی خدمات دی۔ نفیس الرحمٰن صدیقی کی عمر 58 برس تھی، ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 4 بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 فروری 2015

خراج عقیدت:

شوکت علی خاں کو منظوم خراجِ عقیدت

بھوپال: شوکت علی خاں نہ صرف ادب نواز اور سخن فہم تھے بلکہ وہ بھوپال کی عوامی تہذیب اور تاریخ کے گواہ بھی تھے۔ شوکت علی خاں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے، خوشبو ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی، ہم سب کلچرل سوسائٹی، سب رنگ کلچرل سوسائٹی، اربابِ ادب مجلس اقبال، انجمن ندائے اردو اور ادبی انجمن تہذیب کے زیر اہتمام محمد یوسف کے دولت کدہ پر ایک تعزیتی جلسہ اور مشاعرہ منعقد کیا گیا، جس میں شوکت علی خاں کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا گیا اور مندرجہ بالا تاثرات کا اظہار کیا گیا۔ جلسہ اور مشاعرہ کی صدارت جناب ظفر نسیمی نے فرمائی، اس موقعے پر بڑی تعداد میں عمائدین ہنر موجود تھے۔ جلسے و مشاعرے کے اختتام پر شایان قریشی نے شرکا سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض بدر واسطی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 10 فروری 2015

امروہہ میں تعزیتی جلسہ کا انعقاد

امروھہ: ممتاز ادبی سماجی و ثقافتی شخصیت ڈاکٹر شمیم امروہی کے گزشتہ روز سانحہ ارتحال پر انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ کا انعقاد شہر کے محلّہ ملانہ میں معروف شاعر اسلم بقائی کی رہائش گاہ پر کیا گیا۔ افتتاحی تقریر میں ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے ڈاکٹر شمیم امروہی کی ادبی زندگی و سماجی و ثقافتی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اتر پردیش اردو ادب سوسائٹی کی جانب سے بانی صدر کوثر علی عباسی نے کہا کہ ہماری تنظیم کی جانب سے پسماندگان کو تعزیت پیش کی جاتی ہے۔ ممتاز شاعر ڈاکٹر جمشید کمال امروہی، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، ڈاکٹر لاڈلے رہبر امروہی، حاجی ناصر فاروقی، ڈاکٹر چندن نقوی، کامریڈ جاوید اقبال، حاجی خورشید انور، حکیم امیر الدین علوی، شکیل جاوید، مراد علی خاں، قدیر احمد صدیقی، لیاقت امروہی، شان حیدر بیباک، مزمل صدیقی، نسیم خاں، اقرار احمد، ریاض عادل، ضیاء البدر وغیرہ نے بھی اظہار خیال پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 13 فروری 2015

ڈاکٹر افغان اللہ کو خراجِ عقیدت

گورکھپور: گورکھپور یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر افغان اللہ خاں کے یوم وفات پر منعقد پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے ساجد علی میموریل کمیٹی کے سرپرست محمد حامد علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر افغان اللہ اردو زبان و ادب کی خدمت میں زندگی کے آخری لمحات تک سرگرم رہے۔ مہمان خصوصی معروف سرجن ڈاکٹر وجاہت کریم نے کہا کہ مرحوم باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ اس موقعے پر ضمیر احمد پیام کا کہنا تھا کہ پروفیسر افغان اللہ نے کبھی اپنے بڑے عہدے کا رعب کسی پر نہیں ڈالا۔ وہ بہت ہی سادہ زندگی گزارنے والے اور ملنسار شخص تھے۔ ساجد علی میموریل کمیٹی کے سکریٹری محبوب سعید حارث نے اس موقعے پر کہا کہ ڈاکٹر افغان اللہ ہمارے استاذ تھے ان سے اتنی قربت تھی کہ استاد و شاگرد کا فاصلہ مٹ گیا تھا۔ ان کی شخصیت ایسی تھی کہ دوسرے شعبہ جات کے اساتذہ شعبہ اردو میں آکر ان سے ملنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ اسلامیہ انٹر کالج کے منیجر راشد کمال سامانی ایڈوکیٹ اور ندیم عباسی نے بھی اس موقعے پر خراجِ عقیدت پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 مارچ 2015

■

عالمی یوم مادری زبان کے موقع پر منعقدہ مختلف تقریبات کے مناظر

URDU DUNIYA Monthly, April-2015, Vol.17, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/03/2015
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

عالمی یوم مادری زبان کے موقع پر منعقدہ مختلف تقریبات کے مناظر

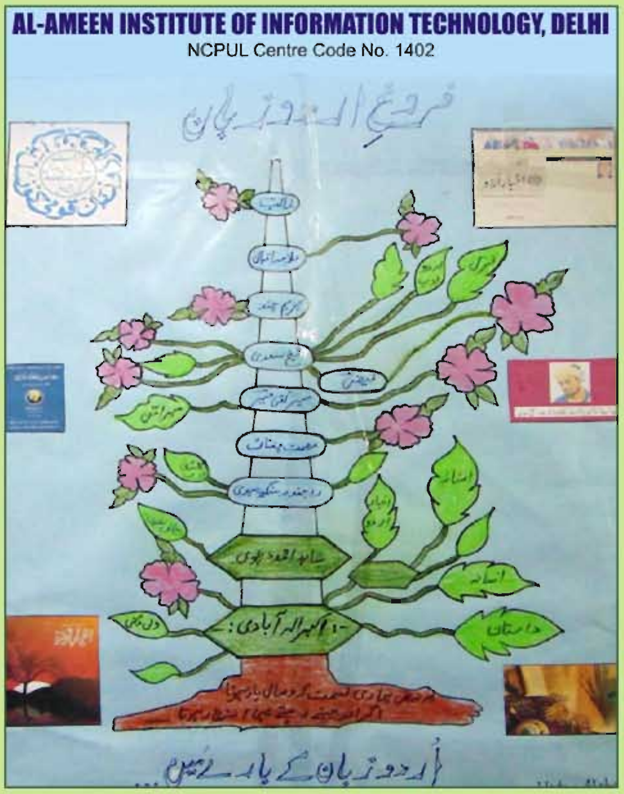

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000